باگھ
عبداللہ حسین

(۴)

(۵)

واقع تھیں، اور گو اُس کا سر بڑا سا تھا مگر گھنے بال، جن میں تقریباً آدھے سفید ہو چکے تھے، ایک سیدھی لائن میں [illegible] کے ماتھے پر پیچھے تک اُگے ہوئے تھے، جس سے اس کا ماتھا ایک تنگ سی چوڑی پٹی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ [illegible] کی عمر کا اندازہ مشکل سے ہوتا تھا۔ گو ظاہر تھا کہ پچیس تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اُس کے جوان چہرے کے اُوپر سفید اور مضبوط بالوں کی فصل نے اُس کی شکل میں ایک ایسی خاصیت پیدا کر دی تھی جو ایک بار دیکھ لینے کے بعد دوبارہ دیکھنے پر مجبور کرتی تھی۔

"آپ پولیس کے آدمی ہیں؟" اسد نے پُوچھا۔

"نہیں۔ مَیں سرکاری ملازم ہوں۔ پولیس سے میرا براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ سب انسپکٹر کلیم اللہ خان میرا دوست ہے۔"

"پیشاب والے برتن کو آپ صاف کروا سکتے ہیں؟" اسد نے اُس کی بات کاٹ کر پُوچھا۔

"کوشش کروں گا۔" اُس نے ایک نظر پیچھے کی طرف ڈال کر منہ پھیر لیا۔ "تم فضل آباد کے ہو؟"

"ہاں۔ آپ چند مہینوں کے لیے ہمارے سکول میں آئے تھے۔ مَیں اُس وقت چھٹی میں تھا۔"

ذوالفقار کے لہجے میں ہلکی سی گرمجوشی پیدا ہوئی۔ "تمہاری یادداشت اچھی ہے۔"

"آپ بھی فضل آباد کے ہیں؟" اسد نے پُوچھا۔

"نہیں، مَیں دراصل پور کا رہنے والا ہوں۔ اگلے روز مَیں نے تمہیں سب انسپکٹر کے دفتر میں دیکھا تھا۔ آج مَیں نے خان صاحب سے چند منٹ کے لیے تم سے ملنے کی اجازت لی ہے۔"

"کیوں؟"

وہ قیدی کے اس سوال پر چونک پڑا۔ "تم میرے علاقے کے آدمی ہو آخر۔ میرا حق بنتا ہے کہ تمہارے بارے میں دریافت کروں۔ اس کے علاوہ تم ایک تعلیم یافتہ آدمی ہو اور یہاں پر اجنبی ہو۔ تم جیسے لوگ عموماً ایسے جرم کے مرتکب نہیں ہوتے۔ تاہم۔"

"مَیں نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

"تاہم سارے حالات تمہارے خلاف جا رہے ہیں۔"

"حالات کی گواہی آدمی کی گواہی سے برتر ہوتی ہے؟" اسد نے پُوچھا۔ "مَیں گواہ ہوں۔"

"جب گواہ ایک ہی ہو، اور وہ مشتبہ یا مجرم کی نشان دہی نہ کر سکے، تو قانون کو واقعاتی شہادت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تم صرف یہ کہہ کر تو نہیں چھوٹ سکتے کہ مَیں گواہ ہوں اور مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"مَیں جُرم کا گواہ نہیں، موقعے کا گواہ ہوں۔"

"تو پھر تمہاری بھی واقعاتی شہادت ہوئی اور اُن کی بھی واقعاتی شہادت۔ سوال یہ ہے کہ کس کی بات مانی جائے۔"

"مَیں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔"

"کیسی حقیقت؟" ذوالفقار نے سوال کیا۔ اُس کے لہجے میں گرمجوشی کے اثرات غائب ہونے لگے تھے اور آنکھوں میں ایک دُوری کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی۔ "حقیقت کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کی حقیقت اس کے اپنے حالات اور واقعات سے بنتی ہے۔ آج یہ لوگ تمہارا جُرم ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو قطع نظر اس کے کہ فی الواقع تم نے جُرم کیا ہے یا نہیں، تم درحقیقت مجرم قرار پاؤ گے اور مجرم ہی تسلیم کیے جاؤ گے۔ تم پولیس کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کرتے؟"

"کیسا تعاون؟"

"مجھے علم ہے کہ اس کیس میں کچھ اور لوگ بھی مشتبہ ہیں۔ تم کسی نہ کسی طرح ان کی نشان دہی کر کے پولیس کی مدد کر سکتے ہو۔"

"مَیں کسی پر جھوٹا الزام نہیں لگا سکتا۔ جس بات کا مجھے علم نہیں میں کیسے اسے بیان کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہوں؟"

"جھوٹے الزام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں پولیس کی مدد کرنے کا سوال ہے۔ سچائی صرف وہی نہیں ہوتی جو تم نے دیکھی اور جس کا علم تمہارے حافظے میں ہے۔ سچائی ہمیشہ کھوج کر نکالنی پڑتی ہے۔ اسی لیے پولیس کے بعض اقدام ہمیں ناانصافی پر مبنی نظر آتے ہیں، مگر ان کے کام کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ کس قدر مشکل سے ان کا سابقہ ہے۔ تمہارے جیسے گواہوں کی مدد کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہارا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ان کی مدد کرو۔ آگے سزا اور جزا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"تو یہ کیا ہے؟" اسد نے ہاتھ کے جھٹکے سے زنجیر کو کھینچا۔ "اگر سزا اور جزا اللہ کے ہاتھ میں ہے تو یہ سزا کس جُرم کی ہے؟"

"بیوقوفی کے جُرم کی۔ خدا نے تمہیں اپنے دماغ پہ اختیار دیا ہے۔ مزاحمت تو سب سے زیادہ پتھر کے بت میں ہوتی ہے مگر ہتھوڑے کی ضربوں سے آخر بت ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ انسان کی برتری یہ ہے کہ اللہ نے اسے دماغ دیا ہے۔ عقل استعمال کرو۔ قانون کے کل پُرزوں کی مدد کرو اور خود بچ کر نکل جاؤ۔ اگر تم اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاؤ تو یہی تمہاری بے گناہی کا ثبوت ہوگا۔"

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔" اسد نے کہا۔ "آپ کے خیال میں جو بچ نکلتا ہے وہ بے گناہ ہوتا ہے اور جو مارا جاتا ہے وہ گناہ گار؟ یہ تو قانون کو اُلٹا لٹکانے والی بات ہے۔"

"او نہوں۔" رومال کو ناک پر رکھے رکھے ذوالفقار نے نفی میں سر ہلایا۔ "اُلٹا لٹکانا تو درکنار، میں قانون کی بات ہی نہیں کر رہا۔ میں تم کو زندگی کا طریقہ بتا رہا ہوں، جو قانون سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ قانون اقتدار کی ایک شاخ ہوتی ہے۔ جب اقتدار کا عہد بدلتا ہے تو قانون بھی بدل جاتا ہے مگر زندگی کا طریقہ ہمیشہ ایک سا رہتا ہے۔ زندگی میں حالات سے حتی الوسع بچ نکلنا ہی اصل حکمت ہے۔"

اس کی باتوں نے اسد کو بھول بھلیوں میں ڈال دیا تھا۔ حقیقت کی ایک انوکھی شکل اس کے سامنے آئی تھی جو اس کے ذہن کو پھسلا رہی تھی گر اپنے دل کی کسی تہہ میں اس کو یہ شک تھا کہ یہ بات سچ نہیں ہو سکتی یا اگر سچ ہے تو درست نہیں ہے۔ مگر اس شخص کی باتوں میں ایک خاص قسم کی کشش تھی جس نے، اس حالت غیر میں بھی، اسد کے ذہن کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔ بے انتہا تھکاوٹ کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ یہ شخص اپنی گفتگو جاری رکھے۔ اس کے ذہن کو یہ باتیں جیسے تھپکیاں دے دے کر آرام پہنچا رہی تھیں۔

"مگر میری حالت سے ان باتوں کا کیا تعلق ہے؟" اس نے کہا۔ "عہد۔ اقتدار۔ قانون۔ میرا ان سے کیا واسطہ ہے؟ میں تو یہاں —— " اس نے ہتھکڑی کی زنجیر کو جھٹکا دیا، " —— قید ہوں اور مجھ پر تشدد ہو رہا ہے۔ مجھے آج تھانیدار نے بتایا ہے کہ سرکاری طور پر میری گرفتاری ہی عمل میں نہیں آئی۔ گویا میں یہاں پہ موجود ہی نہیں ہوں۔ یہاں کوئی سننے والا نہیں ہے؟"

"بالکل"، اجنبی نے صبر سے سر ہلایا، "یہاں کوئی سننے والا نہیں۔ تم نے پھر کنوئیں کے مینڈک کی سی بات کی ہے۔ اپنی ذات کی تکلیف کو تم ہر شے پر فوقیت دے رہے ہو۔ یہ ایک انتہائی خودغرض نقطۂ نظر ہے۔ تمہاری ایک آدمی کی مزاحمت آخر کیا اہمیت رکھتی ہے۔ کیا تمہارا یہ فرض نہیں کہ تم اپنی افتاد کو پرے رکھ کر اجتماعی جدوجہد میں حصہ لو؟"

"کیسی اجتماعی جدوجہد؟" اسد نے کہا۔

"یہاں سے بچ کر نکلنا تمہارا اولین فرض ہے۔ اس کا راستہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ یہاں سے جان چھڑانے کے بعد تمہارے آگے ایک ہی راستہ ہے۔ اجتماعی جنگ تاکہ انصاف کی کوئی شکل پیدا کر سکو۔"

"کیسے؟"

"تم اس خطے کے حالات سے ناواقف نہیں ہو۔ یہاں ایک عظیم جدوجہد جاری ہے، آج سے

نہیں، بیس سال سے —— پچاس سال سے۔ اس جدوجہد کے پیچھے حق اور باطل کی جنگ ہو رہی ہے۔ کسانوں کی، مزدوروں کی، چرواہوں کی، لکڑہاروں اور دستکاروں کی جنگ۔ یہ بدقسمت لوگ جو پیسوں کے عوض ایک ہاتھ سے دوسرے کو بیچے گئے ہیں اور بندوقوں سے ہانکے جا رہے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں۔"

"کیسے؟" اسد نے دہرایا۔

"جیسے بھی کر سکتے ہیں۔ ہر ایک طریقے سے۔ اگر جان بھی دینی پڑے تو کیا، جان کی کیا قیمت ہے؟" ذوالفقار نے ایک لمحے کو رُک کر متلاشی نظروں سے اسد کی آنکھوں میں دیکھا، پھر ذرا سے بدلے ہوئے لہجے میں بات جاری رکھی، "تم اگر یہاں سے کبھی بچ نکلے تو ہماری بہت مدد کر سکتے ہو۔"

"آپ کی؟" اسد نے حیرت سے پوچھا۔ "کس طرح؟"

"سرحد پار بھیجنے کیلئے ہمیں عموماً گنوار کسان ملتے ہیں۔ جو یا تو پکڑے جاتے ہیں یا بیکار وقت گزار کے واپس آ جاتے ہیں۔ تمہارے جیسے پڑھے لکھے لوگ ....."

"آپ فوج میں ہیں؟" اسد نے پوچھا۔

"اس بات کو چھوڑو کہ میں کس محکمے میں ہوں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ ر ہم انہیں ان کے حق خودارادیت کی ذرا سی پہچان بھی کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ م نے بیک جنبش اس چالیس لاکھ آبادی کو زمانۂ جہالت سے نکال کر بیسویں صدی میں پہنچا دیا ہے۔"

اسد ہکا بکا رہ گیا۔ یہ شخص میرے پیچھے گنبد گیا تھا؟ حکیم نے اس سے کیا کہا ہوگا؟ یہ کس کی ملازمت رتا ہے؟ پولیس کی؟ فوج کی؟ یا کسی اور محکمے کی؟ یہ ہے کون؟ اسد کو محسوس ہوا کہ جیسے یہ شخص آسمان کی یں کرتا کر زمین پر اتر آیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی وہ خود جو چند منٹ کے لیے اپنی زنجیریں توڑ کر کھلی فضا میں لانچیں بھرنے لگا تھا، اپنی اصل شکل میں دھڑام سے نیچے آ گرا ہے۔ اب وہ پھر ایک قیدی تھا۔ اس کے دل میں اس اجنبی کے لیے شکایت کا جذبہ پیدا ہوا جو اب ایک عام روزمرہ کے لہجے میں بات کر رہا تھا: "تمہارے جیسے پڑھے لکھے لوگ ....." اور اسد سوچ رہا تھا کہ کیسے ممکن ہے کہ وہ باتیں جن کے اثر سے اس کوٹھڑی کا ناقابل برداشت تعفن بھی کچھ دیر کے لیے اُڑ گیا تھا، اب بے کھنک اور سپاٹ آوازوں میں بدلتی جا رہی تھیں۔ جب اس نے ذوالفقار کو سوالیہ نظروں سے اپنی طرف تکتے ہوئے پایا تو بولا: "میں کسی جھنجھٹ میں نہیں پھنسنا چاہتا۔"

"جھنجھٹ!" ذوالفقار بولا۔ پھر اُس نے نیم اندھیرے میں ہاتھ پھیلائے۔ "اور یہ کیا ہے؟" اُس نے رومال والے ہاتھ سے فضلے کے برتن کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ؟" اُس نے کمبل کا کونا اسد کے کندھے سے اٹھایا، جیسے اُس کو اپنا ہی ننگا بدن دیکھنے کی دعوت دے رہا ہو۔ "اور یہ؟ یہاں کالی کوٹھڑی میں غلاظت میں بیٹھے لایعنی طور پہ کہے جا رہے ہو میں گواہ ہوں، میں گواہ ہوں۔ صرف یہی نہیں کہ تم ایک خطرناک جھنجھٹ" اُس نے لفظ پر زور دے کر کہا "میں پھنسے ہو، بلکہ تم ایک قیدی ہو، ایک گمنام قیدی۔"

"میں علاج کرانے یہاں آیا ہوں۔" اسد نے کہا۔ "میرا اور کوئی کام نہیں۔"

"اور اب کس سے علاج کراؤ گے؟ وہ تو مر گیا جو علاج کرتا تھا۔ یہاں اِس کوٹھڑی میں تمہارا علاج کرنے کون آئے گا؟ اور یاسمین گُل؟ اُس کی شکل تک تم نہیں دیکھ پاؤ گے۔ تمہارا اُس سے تعلق ہے۔ تمہارا دل نہیں کرتا کہ اُس سے جا کر ملو؟"

"یاسمین میری گواہ ہے۔" اسد نے کہا۔ "وہ میری گواہی دے گی۔ اُس کا نام گُل یاسمین ہے۔"

"کیا لایعنی باتیں کر رہے ہو، نام یہ ہے، تم گواہ ہو۔ وہ گواہ ہے۔" ذوالفقار ناگواری سے بولا۔ "تمہارا خیال ہو گا کہ تمہیں یاسمین گُل کی اپیل بائی میسر ہے؟ اُس کی حقیقت بھی میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ تم دونوں نے جھوٹ بولا ہے۔"

"کیا جھوٹ بولا ہے۔"

"یاسمین گُل نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ جب تم نے آدھی رات کے وقت مطب میں روشنی دیکھی تو وہ تمہارے ساتھ تھی، اُس وقت تم دونوں شرقی میدان کی جانب سے واپس آ رہے تھے۔"

"ہاں۔"

"اِس بیان سے تم دونوں نے یہ اثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا تم ایک ساتھ مطب میں داخل ہوئے اور وہاں حکیم کو مُردہ پایا۔ مگر یہ بات غلط ہے۔ غلط ہے یا نہیں؟"

اسد جواب دینے کی بجائے مُنہ اُٹھائے اُسے دیکھتا رہا۔

"حقیقت یہ ہے کہ یاسمین گُل اِس ڈر سے کہ اس کے باپ کو تم دونوں کی خفیہ ملاقاتوں کا علم نہ ہو جائے، اُس جگہ سے سیدھی گھر بھاگ گئی جب کہ تم وہاں سے اکیلے مطب میں گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت مطب میں سوائے تمہارے اور حکیم کے ——— یا حکیم کی لاش کے ——— کوئی تیسرا آدمی نہ تھا۔ بعد میں تم نے جا کر یاسمین گُل کو قتل کی اطلاع دی۔"

اسد حیرت زدہ بیٹھا ذوالفقار کو دیکھ رہا تھا۔ "آپ میرے پیچھے گُلشد جا چکے ہیں؟"

"میرے جانے یا نہ جانے سے کیا ہوتا ہے۔ تفتیش میں سب کچھ نکل آتا ہے۔ تمہاری اپیل بائی ناکارہ ہو چکی ہے۔"

اسد سوچ رہا تھا، یاسمین اتنی احمق نہیں ہو سکتی، وہ پوچھ گچھ کے دوران اپنے بیان کو بدل نہیں سکتی، چہ جائیکہ ایک غلط بیان کو دُوسرے غلط بیان سے بدل دے۔ یہ ناممکن ہے۔ پھر کس نے یہ بات بنائی ہے۔ میر حسن؟ ولی؟ کون ہو سکتا ہے؟ اسد کی دلیل جواب دے گئی تھی، مگر ایک بات اُس کے دل میں اُسی کی اُسی طرح اَٹل کھڑی تھی ——— کہ وہ بے گناہ ہے۔ ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُسے کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ کرنا ہے۔

مگر کس طرح؟ ذوالفقار برابر سوالیہ نظروں سے قیدی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اسد کو اب اِس اجنبی سے، اس کی باتوں کی عام فہم دلیل سے، اُن کی ناقابلِ تردید سچائی سے خوف آنے لگا تھا۔ اس اچانک سے خوف نے اُس کے دل میں مدافعت پیدا کی، وہی پُرانی مدافعت جس کا وہ اب عادی ہو چلا تھا، جیسے کہ یہ مدافعت، یہ دیوانگی اُس کی آخری پناہ گاہ ہو۔

"میں کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل جاؤں گا۔" اُس نے کہا۔

"کیسے نکل جاؤ گے؟"

"کسی نہ کسی طرح میں نکل جاؤں گا۔" اسد نے دہرایا۔ "یہاں شاہ رُخ میرا دوست ہے، چھٹی سے واپس آ کر وہ کچھ نہ کچھ کرے گا۔ کسی وکیل سے اگر رابطہ ہو سکے تو میں یہاں سے نکل سکتا ہوں۔"

"قتل کے ملزم کی کوئی وکیل ضمانت نہیں کروا سکتا۔ اور وکیل آئے گا کہاں سے؟ شاہ رُخ سرکاری ملازم ہے۔ قتل کے ملزم کی طرف داری کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اس کے علاوہ تمہارا صرف ایک طبیل جچا ہے جس سے تمہاری تھوڑی بہت خط و کتابت ہے۔ اُس کو خبر بھی نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ہو بھی جائے تو وہ اِس قابل نہیں کہ یہاں تک تمہارا پیچھا کر سکے۔ اور تمہارا کوئی کنبہ نہیں۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بہن نہ بھائی۔ یہ بھائی بندوں کے کام ہوتے ہیں۔ تمہارا کون ہے؟ تم خود دائم المریض ہو . . . ."

اسد مُنہ اُٹھائے خالی خالی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُسے کچھ نہ آ رہی تھی کہ کیا جواب دے۔ ذوالفقار کا چہرہ کوٹھڑی کی سیاہ دیوار کی مانند بے حِس تھا۔ صرف آنکھوں کے دو سوراخ دکھائی دے رہے تھے، جن میں اب پھر بے نام سی چمک پیدا ہو چلی تھی۔ اسد کو محسوس ہوا کہ یہ دو آنکھیں ہیں جو پردے

کے پیچھے سے اور کبھی پردہ اُٹھا کر، دن رات اُس پہ لگی رہتی ہیں۔ کوٹھڑی میں تعفن پھر عود کر آیا تھا۔ غصے کی ایک لہر اسد کے دماغ کو چڑھنے لگی۔

"آپ میری مدد کرنے آتے ہیں یا سزا دینے؟" اُس نے پوچھا۔

"مدد کرنے۔" ذوالفقار بولا، "حقیقت یہ ہے، اسد کریم، کہ میرے علاوہ تمہارا کوئی پوچھنے والا نہیں، سوائے ایک خدا کے۔" وہ بات کرتے کرتے رُک گیا، جیسے اُس کے ذہن میں کوئی نئی بات آگئی ہو۔ قیدی کے چہرے پر نظریں گاڑ کر وہ بولا، "تم خدا پر یقین رکھتے ہو؟"

اسد اُسے خالی، لاجواب نظروں سے جنبی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے دو بار زنجیر والے ہاتھ کو کھینچا جیسے اندھیرے میں کسی شے کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"خدا سے اس کا کیا تعلق ہے؟" وہ چلا کر بولا۔ "میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں انصاف طلب کرتا ہوں۔"

وہ دونوں زنجیروں کو کھینچتا ہوا دہاڑا۔ "انصاف!"

ذوالفقار اس ناگہانی حملے پر ٹھٹک سا گیا۔ اُس کے چہرے پر مایوسی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اُس نے ایک چھوٹا سا قدم پیچھے کی طرف اُٹھایا، کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، پھر ارادہ تبدیل کر دیا۔ اس کی بجائے اُس نے جھک کر لالٹین اُٹھائی، تیزی سے دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازے پر اُس نے اپنا ہاتھ سلاخوں کے بیچ سے باہر نکال کر تالا کھٹکے پر بجایا۔ پہرے دار سپاہی نے آکر دروازہ کھولا۔ پھر دروازہ کھٹاک سے بند ہوا اور پردہ گر گیا۔

سُن اندھیرا اس طرح کوٹھڑی میں لوٹ آیا جیسے مدت سے ادھر کسی نے قدم بھی نہ دھرا ہو۔ قیدی پتھر پہ بیٹھا کھوئی کھوئی نظروں سے تاریکی میں دیکھتا رہا۔ اس نے تاسف سے سوچا کہ باتیں کرتے ہوئے اُس نے دل میں ارادہ کیا تھا کہ اجنبی کے جانے سے پہلے وہ ایک بار پھر اُس سے پیشاب والے برتن کے بارے میں درخواست کرے گا۔ تعفن اس کے دماغ میں کیل کی طرح گڑا ہوا تھا۔ ذوالفقار کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے—تمہارا کون ہے؟ نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی نہ بہن . . . . اتنے دنوں میں آج پہلی بار اپنی اصل حالت اُس پہ اجاگر ہوئی تھی: اُس کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ پہرے داروں سے، کھانا دینے والوں سے، تلاشی لینے والوں سے، تشدد کرنے والوں سے قیدی نے جو رشتہ جوڑ رکھا تھا اس اجنبی نے اسے منقطع کر دیا تھا۔ اجنبی نے ایک قدم شبیہ اُس کے آگے رکھ کر اسے اپنی شکل دکھائی تھی۔ اُس کا رشتہ کسی ذی روح سے نہیں تھا۔ وہ ایک خلا میں بیٹھا تھا اور اس خلا کے مرکز کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ وہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہا، کوئی اُس کی آواز نہیں

سنتا، کوئی جواب نہیں دیتا، کسی کو اُس کی خبر نہیں۔ وہ وہاں پر موجود ہے مگر نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اب یہاں روشنی کی ایک کرن تک داخل نہ ہو گی۔ وہ اس کوٹھڑی میں یکہ و تنہا ہے، یکہ و تنہا ختم ہو جائے گا۔ یہ اُس کی صورت ہے۔

اسد۔ اسد کریم۔ اُس نے اپنے نام کو زیرِ لب دہرایا۔ وقت۔ وقت ہاتھ سے نکل کر بھاگ گیا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ اسی کوٹھڑی میں پیدا ہوا تھا، اسی کوٹھڑی میں مر جائے گا۔ دُنیا اُس کے حالات سے بے خبر رہے گی۔ وقت ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ اُس کا ہاتھ مستقل اپنی زنجیر کو چھوٹے چھوٹے جھٹکے دیے جا رہا تھا۔ ایک تاریک دیوار سے اُس کا رشتہ ابھی قائم تھا بہرحال —— اس خیال سے اُس کے بدن کو کچھ تقویت پہنچی۔ اُس نے آنکھیں مل مل کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ اُس کے پیٹ میں ایک وسیع خلا پیدا ہو رہا تھا جس کے اندر درد کی ایک رَو چل رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو پکڑ کر آہستہ آہستہ اسے ملنے لگا۔ اُس وقت دروازے کے باہر رات کی پہلی چیخ بلند ہوئی۔

یہ ہیبت ناک آواز اُس کے دماغ میں گڑی ہوئی کیل پر ہتھوڑے کی طرح آکر لگی۔ اُس نے تیزی سے ایک کمبل اپنی ٹانگوں سے اُتارا اور سر پر ڈال کر کانوں کے گرد اُس کے تین چار بل دیے۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھے اور سر گھٹنوں میں دبا لیا۔ انسانی اذیت کی چیخیں اُس کے روئیں روئیں میں داخل ہو کر اُس کے بدن کو تھر تھرانے لگیں۔ اُس کا دماغ درد کے مارے بلبلا اُٹھا۔ اُس نے ایک جھرجھری لی اور زمین پہ آ رہا۔ اُس کے پیٹ میں درد کا ایک طوفان اُٹھا اور خارج ہو گیا۔

دفعتاً اس کی بند آنکھوں کے پیچھے آوازیں اور مناظر آپس میں گڈمڈ ہو کر ٹھہر گئے۔ اُس کے دماغ میں شیشے کا کمپ برف کی سِل میں تبدیل ہونے لگا۔ سرد اور سُن اور پُرسکوت، چکدار۔ وقت کی رفتار بدل گئی۔ ہر چیز غیر قدرتی رفتار سے حرکت کرنے لگی، جیسے خواب میں کرتی ہے —— بہت تیز یا بہت دھیمی —— مگر وہ خواب کی حالت میں نہ تھا، اتنا اُسے علم تھا۔ سرف اپنے اندر سے نکل کر جدا ہو گیا تھا۔ اُس برف کی سل میں سے ایک چوڑا عمودی راستہ نمودار ہوا جس پہ تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ اُس راستے نے باہر نکل کر ایک چوڑی سفید پٹی کی شکل میں اُس کے گرد لپٹنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس پٹی نے مکمل طور پر اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب یہاں مکمل سکوت تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو اس خول کے اندر، اُسی طرح کانوں پہ ہاتھ رکھے، گھٹنے چھاتی سے لگائے پہلو کے بل زمین پر پڑے ہوئے دیکھا۔ اُسے پتا تھا کہ اُس کے پیٹ میں درد کا طوفان ختم ہو چکا ہے اور چیخوں کی آواز بہت دور سے آ رہی ہے، مگر وہ اپنے خول میں محفوظ پڑا ہے۔ اُس کو مزید علم تھا کہ کچھ چیزیں ہاتھ سے چھوٹ

گئی ہیں۔ مثلاً یادداشت۔ اُس کی یاد کی گداز، دانے دار عمیق سطح جس پہ اب تک اُس کی گرفت مضبوط رہی
تھی اب اس برف کی سخت پھسلواں سطح بن گئی تھی جس پہ پاؤں جمتا تھا نہ ہاتھ۔ اُس کی زندگی ٹکڑے ٹکڑے
ہو کر آگے پیچھے، گرتی پڑتی اور اُڑتی ہوئی گزر رہی تھی۔ وہ بے دم پڑا اس کے دھاروں میں نکلتا اور داخل ہوتا رہا۔
اس چوڑے روشن راستے کا سرا نظر نہ آتا تھا۔ کہیں کہیں تاریک سرنگیں پڑتی تھیں جن سے وہ ہوا کی تیزی سے
اُڑتا ہوا گزر جاتا، پھر جب دھوپ میں نکلتا تو بازو کھول کر آرام سے فضا میں تیرنے لگتا۔ کبھی اُس کے ٹکڑوں کا
جلوس چلتا، کبھی وہ خود یکجا ہو کر اُس پرندے کی مانند ٹوٹی پھوٹی مٹی بھری جگہوں کے اوپر پرواز کرنے لگتا، ایک
جگہ سے دوسری، ایک شے سے دوسری تک۔ زمین اور پانی کے بیچ بیچ اُس کی عجیب بے ڈھنگی پرواز تھی جس
کا کب سرا دوسرے سے ملتا تھا۔ کہیں کہیں کوئی بازو پنجہ کھولے سطح آب سے نکلا ہوتا، ڈوبتی ہوئی آوازیں
دھر اُدھر سے آتیں۔ کہیں پانی صاف ہوتا تو دور نیچے تہہ آب میں غرقاب آنکھوں کی زمین بچھی ہوتی۔ یہ کون
لوگ تھے ـــ یہ کون لوگ تھے جن کی آنکھیں ڈوب چکی ہیں؟ چشمہ لگائے ایک ماسٹر جو چوتھی جماعت کو
صبح سویرے گالیاں دیتا ہے، ماں بہن کی، گندی گندی، ہر روز صبح سویرے وہ کام دیکھتا ہے اور اتنے زور سے
کان مروڑتا ہے کہ کان جڑوں سے نکل آتا ہے اور دیر تک کچھ سنائی نہیں دیتا۔ وہ آدمی اپنی میز پر جا کھڑا ہوتا
ہے جب کہ اُس کی عینک کے شیشوں پر سرخ خون والی روشن کھڑکیاں بنی ہوتی ہیں اور آدھی آدھی آنکھیں نفرت
سے چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں، منہ بنا کر شرمگاہوں کے گندے گندے نام لے کر گالیاں دینے لگتا ہے اور ساتھ ساتھ
ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کو ہوا میں اوپر نیچے حرکت دیتا جاتا ہے، کبھی ڈنڈے کو میز پہ رکھ کر ہاتھ کا مکا کس لیتا
ہے اور دوسرا ہاتھ کہنی میں رکھ کر بے شرمی سے ہلاتا ہے۔ بچے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہیں اور ہراس
کا دیو ان کے دل کو جکڑ لیتا ہے۔ اُس کے دانت، سفید دانت۔ پیلے چہرے میں سفید دانت جن سے تڑختی ہوئی
گالیاں نکلتی ہیں۔ اب اُس کے دانت رہ گئے ہیں، اور کچھ نہیں رہا۔ بچے کو ایک عمر کے بعد سمجھ آتی ہے کہ یہ غصہ
کہاں سے آیا مگر کیا فائدہ، جب کہ ہراس نے اُس وقت اُس کے دل کو پکڑ لیا تھا اور وہ دانت وہیں کے وہیں گڑھے
ہیں؟ لحاف میں دبکا ہوا نو سال کا بچہ۔ درد سے اُس کا کان پھٹا جاتا ہے، کان اور سر اور گردن کے پیچھے۔
ڈاکٹر عزری، موٹے ڈاکٹر عزری بابا کے دوست، اُس کا گال تھپتھپاتے ہیں اور کہتے ہیں، واہ جی واہ، کان کے درد
سے روتا ہے میرا بیٹا؟ لو ابھی ٹھیک کر دیتے ہیں، ہش ش ش، ایسا بہادر بیٹا روتا ہے؟ لو یہ ایک چمچ پی لو،
ایسے ـــ، شاباش، اور یہ ایک چمچہ کان میں، ایسے ـــ، بس بس بس، لو اب آرام سے سو جاؤ، ٹھیک
ہوں نا؟ پھُرر سے اُڑ گئی۔ واہ جی واہ۔ ہاتھ سے ہوا میں پھُرر سے اُڑنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ جب وہ جانے کے

لیے مڑتے ہیں تو بچے کا رونا ایک دم تھم جاتا ہے۔ پیٹھ پیچھے اُن کی پتلون خون سے تر ہے۔ ہیں؟ بابا دیکھ کر
چونک پڑتے ہیں، یہ کیا عزری؟ اللہ رحم کرے۔ ڈاکٹر عزری آہستہ سے خون آلود پتلون کو ہاتھ لگاتے ہیں اور ان
کے سرسوں کی طرح زرد گال پہلی بار بچے کی نظر میں آتے ہیں۔ ہاں فضل، وہ اداسی سے بولتے ہیں، بگڑتی جا رہی ہے۔
کیا بگڑتی جا رہی ہے، بچے کی سمجھ میں نہیں آتا مگر اُن کو عجیب طرح سے ٹانگیں پھیلا کر چلتے ہوئے دیکھ کر اُس کے دل
میں خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر عزری اب مر جائیں گے، اور وہ دوبارہ رونا شروع کر دیتا ہے۔ اُسے خیال آتا ہے کہ اُس
کے کان کو کبھی آرام نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر عزری پھر کبھی نظر نہیں آتے۔ اُن کی دکان بند رہتی ہے، جب کھلتی ہے
تو کاپیوں پنسلوں کی دکان ہوتی ہے جہاں ایک ڈاڑھی والا لڑکا کمبل اوڑھ کر بیٹھا رہتا ہے۔ اُس کے کان کو آرام آ
جاتا ہے، مگر اُس کا اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ اب سرسوں کے سے گال اور ہوا میں پھُرر سے اُڑ جانے کا اشارہ رہ
گیا ہے۔ زرد رنگ کی عورت ٹانگیں پھیلا کر آہستہ آہستہ چلتی ہے۔ کیوں؟ کیوں؟ نیم خواب کی حالت میں وہ
لیٹا لیٹا حیران ہوتا ہے۔ میرا ہاتھ سو گیا ہے۔ سر کے نیچے دبا دبا ہاتھ سو گیا ہے۔ اسے میں نکال کیوں نہیں
سکتا؟ مجھے علم ہے کہ میں یہاں پڑا ہوں۔ اس بات کا مجھے علم ہے۔ مگر ہل نہیں سکتا۔ کیوں؟ میں مر گیا ہوں؟
اکڑا ہوا سیدھا بدن، عبادت کی صورت یا بغاوت کی، سب سے پہلے میں نے دیکھی تھی، پھوپھی اسما کی شادی
کے تیسرے دن۔ جان۔ جان محمد۔ اُس کا ہلکے ہلکے بالوں والا بڑا خوبصورت چوڑا سا سر تھا، اور گہرے بادامی رنگ کا
چہرہ کوئی اُس کو نوکر نہ سمجھتا تھا، بابا کے ساتھ کھیلا ہوا تھا۔ مگر وہ بڑا نہ تھا، جب میرے ساتھ باتیں کرتا تو میرے
جتنا ہو جاتا تھا۔ سیڑھیوں کی بغل میں اُس کا کمرہ تھا اور جب اور کوئی نہ ہوتا تو میں اُس کے ساتھ کھیلنے کے لیے چلا جایا
کرتا۔ دوپہر کو شور کرتی ہوئی رنگ برنگی دھوپ میں میں کھیل رہا تھا اور جان مایا لگی پگڑی باندھے، اچکن پہنے
برات کے مہمانوں کو شربت پیش کر رہا تھا۔ یہ میری پہلی شادی تھی۔ تیسرے دن تڑکے میری نیند کھل گئی۔ سب
سوئے پڑے تھے۔ میں اُٹھ کر جان کے کمرے کو چل دیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک دو دھکے دینے کے بعد
میں نے درز سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ اندر کچھ اندھیرا تھا، اور دو سیدھی ٹانگیں اور دو پیر ہوا میں لٹک رہے
تھے۔ ایک دو دھکے اور دیے اور واپس لوٹ آیا اور چارپائی پہ بیٹھ گیا۔ گھر میں صرف چڑیوں کے چہچہانے کی آواز
تھی۔ دن نکل رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے جان کو نہیں دیکھا۔ بابا نے اُدھر جانے کو منع کر دیا۔ شام تک ہجوم چھٹ
گیا۔ شام کو پھوپھی اسما اپنے خاوند کے ساتھ آئیں تو نیلی ساٹن کے لباس میں سرخ ہونٹوں والا اُن کا چہرہ بوڑھا
لگ رہا تھا۔ وہ بھی اُدھر نہیں گئیں۔ کچھ دیر کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جب باہر آئیں تو ہنس رہی تھیں،
مگر آنکھوں سے پتا چلتا تھا کچھ روتی رہی ہیں۔ پھوپھا فواز۔ چھوٹے سے قد کے چھوٹے سے منہ والے فوڈ انسپکٹر۔

پشاور میں نوکر ہیں۔ کون کہتا ہے میرا کوئی پوچھنے والا نہیں؟ ذوالفقار کو شاید پتا نہیں، میرا کنبہ تو ہے۔ مگر اُن کو خبر کیسے ہو؟ میں ہل بھی نہیں سکتا۔ حالانکہ ہوش میں ہوں، دیکھ رہا ہوں۔ کواڑ کی درز میں لٹکتے ہوئے پیراب برف کے نیچے پھنس رہے ہیں۔ کُو چھک چھک۔ گاڑی چل رہی ہے۔ گھر کی بجلی چلی گئی ہے۔ رات کو انہوں نے موم بتی کی روشنی میں کھانا کھایا ہے۔ کھانے کے بعد وہ دُوسری موم بتی جلاتا ہے اور عکسوں کی سیر کو چل پڑتا ہے۔ اس کمرے میں کوئی نہیں آتا۔ بکسوں پیٹیوں اور ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کے انبار لگے ہیں۔ کُو چھک چھک چھک۔ یہ لاہور ہے۔ لاہور میں چوڑی چوڑی سڑکیں اور بجلی کی تیز تیز روشنیاں ہوتی ہیں کھڑکی میں ایک شیشے کا کونا ٹوٹا ہوا ہے، مگر اس قسم کا رنگین پھول دار شیشہ اب نہیں بنتا۔ جاڑوں میں تیز ہوا جب چلتی ہے تو اس موری میں سیٹی بجتی ہے اور دُوسرے کمرے میں بچّے کی نیند کھل جاتی ہے۔ گاڑی چھوٹ رہی ہے۔ کُو دو چھک چھک۔ گرم گرم موم کے کانٹے ہوئے قطرے اُس کے پوروں پر رستے ہیں اور وہ ٹھہر کر ان کا مزا لیتا ہے، ہاتھ اُلٹا کرتے اسے موم کے قطروں سے سجاتا ہے پھر ہاتھ کو ہوا میں لہراتا ہے۔ کوئی موتی نہیں گرتا۔ سب وہیں رہتے ہیں۔ یہ سمرقند ہے۔ سمرقند میں نوکر کی کھال کی ٹوپیاں پہنے لوگ چائے پی رہے ہیں، جیسے تصویروں میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ علین علین۔ یہاں پر نے قالین میں تین بڑے بڑے سوراخ ہیں جہاں سے چوہوں نے کھا لیا ہے۔ چوہے واقعی قالین کو کھا جاتے ہیں؟ اُن کے پیٹ میں درد نہیں ہوتا؟ پیٹ میں ہلکا ہلکا درد پھر اٹھ رہا ہے۔ کیا کروں؟ یہاں پر لیٹا لیٹا محسوس کر رہا ہوں۔ ہوش میں ہوں۔ کوشش کروں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ وقت پر، اُس نے دُور سے سوچا، دسترس کیسے حاصل ہو؟ شیشے والی میز کی سطح پر گرد کی تہہ جمی ہے۔ گرد فریم کی ٹوٹی تصویر پر بھی پڑی ہے جو وہاں رکھی ہے۔ تصویر کے آگے گرد میں وہ موم کے قطروں والی اُنگلی سے لکھتا ہے: اماں۔ بابا۔ سمرقند ۱۹۵۰۔ اُوپر ایک جالے میں ایک مکھی مری ہوئی اٹکی ہے۔ بچّے کو پتا ہے وہ نظر اٹھائے گا اور مکھی وہاں پر ہو گی۔ ہمیشہ ہوتی ہے۔ وہ نظر اٹھا کر دیکھتا ہے۔ مکھی وہاں پر اٹکی ہے۔ اُس سے کچھ فاصلے پر مکڑی بھی چرمر ہوئی لٹک رہی ہے۔ مکھی کو کھانے سے پہلے ہی کیسے مر گئی؟ بچّہ سوچتا ہے۔ شاید بیمار ہو گئی۔ کُو چھک چھک۔ چلو رنگون چلیں۔ کُو دو دو چھک چھک چھک۔ رنگون سے گزرنا آسان کام نہیں۔ یہاں سے گزرنے کا کوئی راستہ نہیں۔ میزوں اور کرسیوں اور چارپائیوں کی چوکھٹوں کے پائے سر کو لگتے ہیں۔ مگر ایک دو جگہیں بیٹھنے کے لیے بنی ہوئی ہیں۔ خاص طور پر ایک، جہاں دو کرسیاں ساتھ ساتھ اس طرح رکھی ہیں کہ چھوٹا سا گھر بن گیا ہے جس کے اُوپر میز کی چھت ہے۔ اِس گھر کو جانے کا راستہ بھی ہے۔ پہلے سٹول کے اُوپر کھڑے ہو جاؤ اور وہاں سے پٹی پر گھٹنا رکھ کر جدھر، پھر پٹی پر چلتے ہوئے آرام کرسی تک جاؤ اور اُس کے اُوپر پاؤں رکھ کر دوسری طرف اُتر جاؤ تو تہہ کی ہوئی دری پڑی

ہے۔ اس پہ پاؤں رکھ کر گزر جاؤ۔ سامنے گھر ہے۔ صرف اس میں جھک کر داخل ہونا پڑتا ہے۔ پھر بیٹھنے کی مصیبت ہے۔ سر میز کو لگتا ہے۔ ایک دفعہ بیٹھ جاؤ تو ٹانگیں سمیٹ کر اور گھٹنے چھاتی سے لگا کر آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ گرمیوں کی دوپہروں کو جب بابا اور پھپھو اور جان سو جاتے ہیں تو اُسے نیند نہیں آتی، پھر وہ یہاں آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس گھر کے عین سامنے دوسری دیوار کے ساتھ ایک اور جگہ ہے جہاں صوفے کے اُوپر میز کھڑی ہے اور میز کے اُوپر ایک کرسی، جہاں ایک دوپہر کو روشن اُس کے ساتھ چلی آتی ہے۔ وہ گھوڑی بن کر روشن کو اُوپر چڑھاتا ہے، پھر جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے۔ شش شش شش۔ باتیں کرنے سے بابا جاگ جائیں گے۔ وہ آمنے سامنے بیٹھے بابا کے بولنے کی خوابیدہ آواز کو سنتے رہتے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد روشن وہاں بیٹھی بیٹھی اُکتا جاتی ہے۔ روشن اس سے تین سال بڑی ہے۔

"چلو چلیں۔" وہ کہتی ہے۔

"نہیں بیٹھیں۔"

"یہ کوئی جگہ ہے؟ پھر باتیں کرو۔"

"اونہوں۔ شور ہو گا۔"

"کیا کریں؟"

"کھگو کی آواز سنیں۔ تم سوچ لیتی ہو؟"

"کیا؟"

"کچھ بھی۔"

"اوہ۔" وہ اچک کر کہتی ہے۔ "یہ کوئی جگہ ہے؟ یہاں چوہے ہوں گے۔"

"اونہوں۔ میں روز یہاں آتا ہوں۔"

"روز؟"

"ہاں۔"

"کیوں؟"

"یہ رنگون ہے۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"ملک ہے۔"

"ملک ہے؟" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی ہے۔

"شور مت کرو۔" وہ ڈر کر کہتا ہے، "اصلی مُلک ہے۔"

"وہاں کیا ہوتا ہے؟"

"اوہ — درخت۔ بڑی دور تک ہے۔"

"بڑی دور ہے تو پھر یہاں کیسے آگیا؟"

"بس یہ رنگون ہے۔"

"مگر یہ تو مُلک نہیں۔"

"تمہیں پتا ہے مُلک کیا ہوتا ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا ہوتا ہے؟"

"مُلک؟ اوہ — مُلک ہوتا ہے۔"

"دیکھا؟ تمہیں پتا ہی نہیں مُلک کیا ہوتا ہے۔"

"مگر یہ تو کمرہ ہے، اسدی۔"

"مُلک بھی ہے۔" وہ کہتا ہے، "وہ لاہور ہے۔ وہ سمرقند ہے۔ یہ رنگون ہے۔"

وہ ایک ہاتھ مُنہ پہ ایک پیٹ پہ رکھے ہنسے جاتی ہے۔ "تم تو بیوقوف ہو، اسدی۔"

پھر وہ کہتی ہے، "میں تو چلی —" وہ وہیں سے نیچے چھلانگ لگا دیتی ہے۔ کُرسی میز پر اوندھی ہو جاتی ہے مگر گرتی نہیں، پھر ایک سیکنڈ کے بعد لُڑھک کر گر جاتی ہے۔ شور سارے مکان میں گونج اُٹھتا ہے۔ روشن اُڑتی ہوئی کمرے سے نکل کر غائب ہو جاتی ہے۔ وہ میز سے اُتر رہا ہے کہ بابا سُرخ آنکھیں ملتے ہوئے دروازے پہ دکھائی دیتے ہیں۔ بچے، تم سوتے کیوں نہیں؟ تمہیں نیند کیوں نہیں آتی؟ کو دو چھک چھک چھک ———

روشن کی کالی آنکھیں ہیں جنہیں وہ ہر وقت جھپکایا کرتی ہے۔ پھر ایک روز روشن کہیں چلی جاتی ہے۔ بابا، روشن کہاں چلی گئی ہے؟ وہ پوچھتا ہے۔ روشن اپنے رشتہ داروں کے ہاں گئی ہے، دوسرے شہر میں۔ کون سے شہر میں؟ تمہارا کوئی مطلب نہیں، بابا سختی سے منع کر دیتے ہیں۔ روشن اب چلی گئی ہے۔ روشن پھر نظر نہیں آتی۔ سردیوں کی شام ہے اور روشن کے چوبارے پر کھیلتے کھیلتے چاند نکل آیا ہے۔ سب بچے آوازیں پڑنے پر اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔ وہ دونوں وہاں کھڑے رہ جاتے ہیں۔ وہ اُسے گلے سے لگا لیتی ہے، اچانک مُنہ چوم کر گرم گرم آنکھوں سے ہنستی ہے، پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیتی ہے۔ اُسے کچھ نہیں آتی۔ دکھاؤں؟ وہ پوچھتی ہے

وہ ہاں میں سر ہلاتا ہے۔ روشن اپنے آگے سے قمیض کھینچ کر اوپر اُٹھا دیتی ہے۔ دیکھا؟ وہ نہیں، وہ نفی میں سر ہلاتا ہے۔ وہ قمیض کو اور اوپر کھینچتی ہے اور چاند کی طرف مُنہ کر کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ روشن کی دونوں کُہنیاں پنجرے کے کٹے ہوئے پروں کی مانند ہوا میں اُٹھی ہیں۔ اس کے سینے پر ساتھ ساتھ دو نتھی ہوئی ذرا ذرا اُبھری ہوئی جگہیں ہیں جن کے اوپر گلابی رنگ کے چانٹے ہیں۔ روشن اُس کا ہاتھ پکڑ کر ایک کے اوپر رکھ دیتی ہے۔ وہ اُنگلیوں کے پوروں کو آہستہ سے چانٹے پہ دباتا ہے، تنے ہوئے گوشت میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ وہ ہاتھ اُٹھاتا ہے تو جلد پھر تن جاتی ہے۔ روشن آنکھیں جھپک جھپک کر خاموشی سے ہنستی ہے۔ ابھی پہلے تو نہیں تھے، وہ دل میں حیران ہوتا ہے۔ کہاں سے آگئے؟ اُس کا ہاتھ بے اختیار اپنی چھاتی پہ جاتا ہے۔ سیدھی اور سپاٹ! دونوں خوشی سے ہنستے ہیں۔ پھر کیسے وہ ایک روز کوئی بات کیے بغیر کسی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور کبھی واپس نہیں آتی؟ ایک عمر گزر جاتا ہے تو اُسے پتا چلتا ہے کہ کیسے، مگر کیا فائدہ؟ چاند کی روشنی میں روشن کی کالی کالی جھپکتی ہوئی آنکھیں وہیں ہیں اور دل میں اُس کے جانے کا احساس رہ گیا ہے ———

——— وہ بوڑھا خاکسار ہمارے سکول کے ساتھ رہتا تھا ایک کمرے میں اور خاکی شلوار قمیض پہنے دن بھر اپنی سائیکل لیے بازاروں میں پھرتا رہتا تھا اور اُس کی سائیکل کے آگے ہینڈل پہ ایک شیشے کے ڈھکنے والا لکڑی کا کیس لٹکا رہتا تھا جس کے اندر چند پُرانی عینکیں کیلوں پر ٹنگی ہوتی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی چشمہ ساز فرم کا ایجنٹ ہے۔ مگر وہ کبھی عینکیں بیچنے کی آواز نہ لگاتا تھا اور نہ کبھی رُک کر کسی سے عینکوں کی بات کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں ایجنٹ ہو مگر بعد میں انہوں نے نکال دیا ہو اور وہ عینکوں کا کیس اپنی سائیکل سے اُتارنا بھول گیا ہو۔ اس کیس کی لکڑی پُرانی ہو کر بدرنگ ہو چکی تھی اور شیشے کا ڈھکنا مکھیوں کی بیٹوں سے گدلا ہو گیا تھا اور ایک کونے سے ذرا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ دن بھر وہ خاکسار جو اب ٹھیک طرح کا خاکسار بھی نہ تھا بلکہ پہلے کبھی خاکسار رہا تھا خاکساروں کی وردی پہنے سائیکل لیے بازاروں میں گھومتا رہتا تھا اور ہر دس پندرہ بیس منٹ کے بعد رُک کر اونچی آواز میں ایک نعرہ لگاتا تھا: "چور اُچکے چودھری تے لنڈی رن پردھان" اور پھر چل دیتا تھا اور شہر کے سب لوگ اُسے جانتے تھے اور کوئی اُس کے نعرے کی طرف توجہ نہ دیتا تھا مگر کئی لوگ اُس کے دوست تھے اور خوش دلی سے اُس کا حال احوال پوچھا کرتے تھے، صرف کبھی کبھار کوئی دیہاتی بازار سے گزرتا ہوا اُس کا نعرہ سُن کر رُک جاتا تھا اور تعجب سے اُسے دیکھنے لگتا تھا۔ پھر ایک روز اُس کو پولیس پکڑ کر لے گئی اور ہمارے سکول کے ساتھ اُس کے کمرے پر تالا پڑ گیا ...

رات کو ایک دھماکا ہوتا ہے اور وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ بستر گیلا پانی ہے، وہ سہم جاتا ہے، ابھی آواز آئے گی، پھر اوپر کر دیا، اسدی؟ تین سال کے ہو گئے ہو تمہیں پتا نہیں چلتا، اسدی؟ ہیں؟ آواز نہیں آتی۔ وہ ہاتھ پھیلاتا ہے۔ بستر خالی ہے۔ وہ رونے لگتا ہے۔ کوئی نہیں آتا۔ وہ چارپائی سے اُتر کر ٹھنڈے فرش پہ چلنے

لگتا ہے، پاؤں کو سردی کاٹتی ہے۔ دُوسرے کمرے سے آوازیں آ رہی ہیں۔ وہ جا کر دروازہ کھولتا ہے تو تیز روشنی اُس کی آنکھوں پر پڑتی ہے۔ وہ آنکھیں بھینچ لیتا ہے اور بند آنکھوں میں کھنچے ہوئے منظر کو دیکھتا ہے۔ فرش پر کوئی ننگے بدن لیٹا ہے۔ مُنہ دکھائی نہیں دیتا۔ کسی کی کالے بالوں والی ٹانگیں بھینچ میں آ گئی ہیں، جیسے چچا کی ٹانگیں ہوں، صرف ایک چھاتی ہے جو ڈھلک کر خون میں ڈوب گئی ہے۔ بابا کے ہاتھ میں بندوق ہے۔ بان کو سردی نہیں لگتی؟ پھوپھو ایک چیخ مار کر اُسے زمین سے اُچک لیتی ہے اور اُٹھا کر اپنے کمرے کو بھاگ جاتی ہے۔ اب وہ پھوپھو کے ساتھ سوتا ہے مگر نیند نہیں آتی۔ آنکھیں بند کرتا ہے تو بندوق دروازے میں کھڑی ہوتی ہے اور بستر گیلا پانی —— میرے چاروں طرف پانی ہے۔ اب چیخوں کی آواز رُک گئی ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہاں پڑا ہوں۔ فرش پر پڑا ہوں اور میری کمر اور ایک ٹانگ گیلی ہو گئی ہے۔ مَیں خواب میں نہیں ہوں، سوچ سکتا ہوں، سونگھ سکتا ہوں۔ یہ کیسی بُو ہے؟ فضلے کے تعفن کی بُو تو نہیں۔ عجیب سی بُو ہے، پہلے کبھی نہیں سونگھی، سردی بُو ہے، سرد اور مکروہ۔ میرے حواس قائم ہیں۔ اُٹھنے کی کوشش کروں؟ کوشش کروں تو اُٹھ سکتا ہوں۔ اُس نے لیٹے لیٹے سر ذرا سا اُٹھایا، پھر فرش پر رکھ دیا۔ میں ہوش میں ہوں۔ ان میں سے کچھ تو خواب ہیں، کچھ حقیقت۔ کچھ خواب جو اتنی بار آئے کہ حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ واقعات جو پرانے ہو کر خواب بن گئے ہیں۔ اب ان میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ مگر مَیں زندہ ہوں، اُس نے بے انتہا طمانیت سے سوچا۔ اب وہ پورے ہوش میں تھا۔ وقت کے کندھے پر، اُس نے سوچا، میرا ہاتھ تھا۔ پھسل گیا ہے۔

پھر وہ خواب میں چلا گیا۔ خواب میں جگہ بجگہ یاسمین کے چہرے گردش کر رہے تھے، اور عقب میں دُور دُور تک، وسیع سرزمین پر ایک شیر کا ننھا سا سایہ لمبی زقندیں بھرتا تھا۔

★ ★ ★ ★ ★

دن چڑھے جب تھانیدار کوٹھڑی میں داخل ہوا تو تعفن کانٹے دار جھاڑی کی طرح اُڑتا ہوا آ کر اُس کے مُنہ پر لگا۔ اُس نے ہاتھ سے اپنی ناک ڈھانپ لی۔ لالٹین کی روشنی میں انہوں نے قیدی کو اِس حالت میں پایا کہ وہ دیوار کے ساتھ نیم دراز، ڈھیر ہوا پڑا ہے۔ اُس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا اور کندھے دیوار کے ساتھ لگے تھے، اور اُس کا فضلہ اُس کے چاروں طرف زمین پر بہہ رہا تھا۔ رات کو کسی وقت اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ متعدد بار کی ہے۔ اُس کی ٹانگیں اور پیٹ فضلے میں لتھڑے ہوئے تھے۔ تھانیدار کے چہرے پر سخت ناگواری کے آثار پیدا ہوئے۔ اُس نے قیدی کو ٹھوکر مار کر اُٹھانے کے واسطے پاؤں اُٹھایا، مگر کراہت کے مارے کھینچ لیا۔ معاً تھانیدار کا ہاتھ ناک سے ڈھلک گیا اور وہ جھک کر بغور اُس بے جان شبیہ کو دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک انجانے سے خوف کے آثار نمودار ہوئے۔ قیدی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا اور اُس کے چہرے پر زندگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ اُس کے ہونٹوں کے کونوں سے رال کے قطرے بہہ کر داڑھی کے بالوں پہ رُکے ہوئے تھے۔ اُس کے سینے میں سانس کی جنبش تک نہ تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جان سارے بدن سے آہستہ آہستہ کھنچتی ہوئی آخر اب ایک ہاتھ تک آ پہنچی تھی۔ کئی منٹ تک تھانیدار متحیر کھڑا قیدی کے دہنے ہاتھ پہ نظریں گاڑے رہا جو اپنے بدن سے الگ تھلگ ہل رہا تھا۔ اُس ہاتھ میں ایک کمزور سی، لرزتی ہوئی ہیجانی حرکت تھی جس سے وہ اپنی زنجیر کو ہلکے ہلکے جھٹکے دے رہا تھا، جیسے کہہ رہا ہو، مَیں ابھی زندہ ہوں، مجھے چھوڑ دو۔ اس عجیب الخلقت عمل کو دیکھتے دیکھتے دفعتاً تھانیدار کے چہرے پر ناگواری کے ساتھ ساتھ، بوکھلاہٹ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اُس نے ناک پر ہاتھ رکھا اور کچھ کہے بغیر، تیزی سے پلٹ کر باہر نکل گیا۔ لالٹین والا سپاہی کچھ دیر تک رُک کر قیدی کو اور اُس کے آس پاس کی زمین کو دیکھتا رہا۔ جب وہ باہر نکلا تو تھانیدار اسی طرح ناک پہ ہاتھ رکھے کھڑا تھا، اور دو سپاہی لحاف کا پردہ دیوار سے اُتارنے میں مصروف تھے۔

(٦)

جب اسد نے آنکھیں کھولیں تو وہ ایک روشن اور ہوادار کمرے میں چارپائی پہ لیٹا تھا۔ اُس نے گردن موڑ کر دیکھا تو اُسے بستر کی صاف ستھری چادر دکھائی دی۔ وہ چھاتی تک ایک شوخ سرخ رنگ کے کمبل سے ڈھکا ہُوا تھا۔ اُس آرام دہ اور گرم بستر میں وہ کئی منٹ تک ساکت پڑا رہا۔

اپنے وجود کی خبر اُسے تہہ آب پہ ہوئی تھی۔ کانوں میں گہرے پانی کی سُن کی سی کیفیت والی جھپک اور سرسراہٹ کی آواز تھی، جیسے آہستہ آہستہ ——— بہت آہستہ آہستہ ——— دُنیا کے محور سے نکل کر میدان میں آ رہے ہوں۔ ہوش میں آ کر وہ کتنی ہی دیر تک آنکھیں بند کیے دبکا رہا۔ میدان میں پہنچ کر آنکھیں کھولنے کی اُسے ہمت نہ ہوئی۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو پہلا شخص جس پہ اُس کی نظر پڑی، ذوالفقار تھا۔ ذوالفقار کمرے میں داخل ہوا اور چارپائی کے پاس پڑی ہوئی کرسی پہ آ کر بیٹھ گیا۔ اسد نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر ذوالفقار نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے لٹا دیا۔

لیٹے لیٹے اسد نے اپنی ٹانگیں اور بازو ہلائے۔

"میں آزاد ہوں؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"بالکل،" ذوالفقار نے کہا، "آزاد ہو۔"

"کیسے؟"

ذوالفقار نے ہاتھ ہوا میں اُٹھایا اور مسکرا کر چٹکی بجائی: "ایسے۔"

اسد نے کمبل ہٹا کر اپنے ہاتھ اور پاؤں کو دیکھا۔ اُس کی کلائی اور ٹخنے پر سیاہ رنگ کے متورم حلقے موجود تھے، مگر اُن میں زنجیریں نہ تھیں۔ وہ آزاد تھے۔ اُس وقت پہلی بار اسد کو حقیقتاً آزادی کا احساس اُس ورم شدہ بدرنگ جلد کو دیکھ کر ہوا۔ اُس کا دل یکبارگی حلق کی جانب لپکا۔ اُس کی نظریں دروازے پر گئیں۔ وہ وا تھے اور نیلے آسمان کی چمک اُن پہ پڑ رہی تھی۔ اسد ہاتھ سے آہستہ آہستہ دل کے اوپر سینے کو ملنے لگا۔

ذوالفقار آگے جھک کر بولا: "اب تم بالکل آزاد ہو۔"

"میں کہاں پر ہوں؟" اسد نے پوچھا، "یہ کس کا گھر ہے؟"

"اپنا ہی ہے۔"

"آپ کا گھر ہے؟"

"میرے ایک جاننے والے کا ہے۔" ذوالفقار نے کہا، "جب تمہیں رہا کیا گیا تو تم بیہوشی کی حالت میں تھے۔"

"کتنی دیر ہو گئی ہے؟"

"دو روز۔"

"مجھے پرسوں رہا کیا گیا تھا؟"

"ہاں۔ پہلے روز تمہیں کافی تیز بخار تھا۔ ڈاکٹر کی دوائی سے اگلے روز بخار تو اُتر گیا مگر بیہوشی قائم رہی۔ ڈاکٹر اس کی وجہ صرف صدمہ اور کمزوری بتاتا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ چند روز آرام کرنے سے تندرست ہو جاؤ گے۔"

اسد نے تپائی پہ نگاہ دوڑائی جس پہ سبزی مائل شیشے کی دو بوتلیں پڑی تھیں جن پر کاغذ کی تراشیدہ خوراکوں کے نشان چپکے تھے۔ بوتلوں کے پاس دودھ کے گلاس پڑے تھے۔ اُس نے چھاتی سے کمبل اُٹھا کر ایک لمبا سانس لیا۔ اُس کا جسم بے بُو تھا۔

"مجھے صاف کس نے کیا؟" اسد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"تھانے میں۔" ذوالفقار نے بتایا، "گیلے کپڑے سے بدن کو اچھی طرح صاف کر دیا گیا ہے۔ تمہارے

کپڑے بھی وہیں پر دھو دیے گئے ہیں۔ پٹی بھی بدل گئی۔ زخم اب تقریباً بھر چکا ہے۔"

اسد نے ہاتھ اُٹھا کر ماتھے کے زخم کو چھوا۔ "میں رہا کیسے ہوا؟" اُس نے پوچھا۔

"ابھی آرام کرو۔ پھر بات کریں گے۔"

"مگر میں چھوٹا کیسے؟"

"مزید تفتیش کے نتیجے کے طور پر ایک اور گرفتاری عمل میں آئی ہے۔"

"کون گرفتار ہوا ہے؟"

"ایک شخص ہے۔ گنبد سے تعلق نہیں رکھتا۔ جنگلات میں کٹر تھا۔"

"کیا نام ہے؟"

"نام مجھے معلوم نہیں۔"

"کس کی گواہی پر گرفتار ہوا ہے؟" اسد نے پوچھا۔ "کوئی ثبوت ملا ہے؟"

"تفصیلات مجھے معلوم نہیں۔ سنا ہے اُس نے اقبالِ جرم کر لیا ہے۔"

"ثبوت کیا ملا ہے؟"

"دیکھو،" ذوالفقار اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔ "ڈاکٹر نے کہا ہے تمہیں ابھی مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ ان باتوں سے دماغ کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہت وقت پڑا ہے۔"

"آلۂ قتل برآمد ہو گیا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"غالباً ہو گیا ہے۔"

"کیا ہے؟ چاقو ہے؟"

ذوالفقار اُٹھ کھڑا ہوا۔ "تمہاری باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے اُس کی وکالت کرنا چاہتے ہو۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔" وہ بولا۔

اُس کے جانے کے بعد اسد نے محسوس کیا کہ اُس کی سانس پھول گئی ہے۔ چند منٹ کی گفتگو سے ہی اُس کے سینے میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بستر پر پڑا رہا۔ جب ذوالفقار یخنی کا پیالہ اور ساتھ روٹی لے کر آیا تو پیالے میں اُس پتلے سے شوربے کو دیکھ کر ایک بار اسد نے کراہت سے منہ پھیر لیا۔ مگر یخنی کی خوشبو نے اُس کی زبان کے نیچے سے اشتہا کا لعاب کھینچ نکالا۔ رس بھگو بھگو کر کھاتے اور گھونٹ گھونٹ یخنی پیتے ہوئے اسد نے اپنے سوکھے ہوئے بدن کے گوشے تک پھیلی ہوئی لاکھوں ننھی ننھی شریانوں میں قوت اور حرارت کو سرایت کرتے

ہوئے محسوس کیا۔ یخنی ختم کرتے ہی اُس پر نقاہت کی نیند طاری ہو گئی۔ گہری نیند میں جانے سے پہلے اُس نے ذوالفقار کی آواز سنی، "دو روز تک تمہیں سے بمشکل کچھ خوراک اندر جا سکی ہے۔ اب ٹھیک طرح کھاؤ گے تو طاقت آ جائے گی۔"

خواب میں اُس نے دیکھا کہ اُس کے دونوں ہاتھوں میں ناسور کی قسم کے زخم پیدا ہو گئے ہیں جو رس رہے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے ہاتھ جھڑ کر نیچے گر پڑتے ہیں۔ اُسے درد کا احساس قطعاً نہیں ہوتا، مگر اُس کے دل میں ایک ناقابلِ تلافی نقصان کا ہَول پیدا ہوتا ہے —— اس ہَول سے چونک کر وہ جاگ پڑا۔ مگر چند ہی لمحے بعد نیند نے دوبارہ اُس پہ غلبہ پا لیا۔ اُس مختصر سے عرصے میں، جب وہ جاگا تھا، اُس نے محسوس کیا کہ اُس نے وہ بو سونگھی ہے جو ایک بار پہلے نیم خواب کی حالت میں سونگھی تھی اور پریشان ہو گیا تھا، کیونکہ ایسی بو اُس نے پہلے کبھی نہ سونگھی تھی، سرد سی بو، جو شاید موت کی بو تھی۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو دن ڈھل چکا تھا۔ اُس گرم بستر میں اپنے آپ کو آسودگی سے لیٹے ہوئے پا کر اسد کو اچانک بے انتہا طمانیت کا احساس ہوا، جیسے ایک بار پتھر کے فرش پہ لیٹے لیٹے اُس کو منظر دکھائی دینے لگے تھے اور اُسے خیال ہوا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد منظر دکھائی دینے بند ہو گئے تھے اور اُس کو پتا چلا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اب خواب اُس کا دل دہلاتے تھے۔ ذوالفقار اُس کے لیے یخنی کا بھرا ہوا پیالہ اور موٹی سی نرم خمیری روٹی لے کر آیا۔ اب ایک مستقل بھوک اُس کے پیٹ میں پیدا ہو چلی تھی۔ یخنی کے ساتھ روٹی کھاتے ہوئے اُس نے شاہ رُخ کے بارے میں پوچھا۔

"چھٹی سے واپس آ گیا ہے؟" ذوالفقار نے کہا، "کل اور پرسوں دونوں دن آتا رہا ہے۔ ابھی شاید آئے گا۔"

ذوالفقار کرسی پر بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا کہ شاہ رُخ آ پہنچا۔ اسد کو بستر پر اُٹھ کر بیٹھے ہوئے دیکھ کر اُس کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ اُس نے گرمجوشی سے اسد کے ساتھ ہاتھ ملایا اور دیر تک دونوں ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ پکڑے زور زور سے ہلاتا اور اُس کے چہرے پر نظریں جمائے خاموشی سے ہنستا رہا۔ پھر وہ اُس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"تم کس مصیبت میں پھنس گئے تھے؟" وہ ہنس کر بولا۔ "میرے واپس آنے تک تو رُک گئے ہوتے۔" پھر وہ خود ہی اپنی بات پر پریشان سا ہو کر خاموشی سے اسد کو دیکھنے لگا۔ "تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

اسد دروازے سے باہر شام کے اندھیرے کو دیکھ رہا تھا۔ "ہاں۔" اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔

شاہ رُخ نے ذوالفقار کی خیریت دریافت کی۔

"شاہ رُخ،" کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اسد نے کہا، "وہ کٹر جو پکڑا گیا ہے۔"

"ہاں۔"

"کون ہے؟"

"تھا۔" شاہ رُخ نے کہا۔ "پچھلے سال نکال دیا گیا تھا چوری میں۔"

"کون ہے؟"

"خوشی محمد۔" شاہ رُخ نے کہا۔ "باغ کا ہے۔"

"خوشی محمد!" اسد حیرت سے تقریباً چلا اٹھا۔ "میں اُسے جانتا ہوں۔"

"ہاں۔ یہ شخص عادی چور ہے۔"

ذوالفقار نے یخنی کا خالی پیالہ اور تھوڑی سی بچی ہوئی روٹی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

"مگر حکیم کے ساتھ اُس کے پرانے تعلقات تھے۔" اسد نے کہا۔ "زیادہ تر جڑی بوٹیاں تو وہی سرحد پار سے لا کر حکیم کو سپلائی کیا کرتا تھا۔"

"ہاں۔ حکیم کے ذمے اُس کے کچھ پیسے بھی بقایا تھے۔ مگر چور کے لیے کوئی وجہ ہوتی ہے؟ اس علاقے میں زیادہ تر چوریاں اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں ہوتی ہیں، اور عموماً پرانے تعلقات رکھنے والے کرتے ہیں۔"

"مگر خوشی محمد کے لیے تو چوری کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر اُس کے پیسے حکیم کی طرف نکلتے تھے تو چوری کرنے کا کیا مطلب؟ کرنی ہی تھی تو اپنے پیسے وصول کرنے کے بعد کرتا۔ اور فرض کیا کہ وہ چوری کرنے ہی آیا ہے تو حکیم کو قتل کر دینے سے تو اُسے کچھ بھی نہیں ملتا۔" اسد نے آہستہ سے سر کو نفی میں ہلایا۔ "میں نہیں مانتا۔"

شاہ رُخ ٹکٹکی باندھے اسد کو دیکھتا رہا۔ اُس وقت پہلی بار شاہ رُخ کو احساس ہوا کہ یہ شخص، اسد، جس کے ساتھ اُس کی گہری واقفیت رہی تھی، وہ شخص نہیں تھا جسے وہ چند روز پہلے گنبد میں چھوڑ کر چھٹی پر گیا تھا۔ گو اُس کی دوستانہ مسکراہٹ اسی طرح بے ساختہ تھی، اُس کی باتوں کا رُخ، اُس کی آنکھوں کی عجیب سی جلدی زخم خوردہ شکل مختلف تھی۔ اِس چند روز کے عرصے میں وہ بدل گیا تھا۔

"قتل کی واردات،" شاہ رُخ نے کہا، "ٹیڑھی سی چیز ہے۔ بہت کم قتل ایسے ہوتے ہیں جو سیدھے سادے واقعات پر بنیاد رکھتے ہیں۔ خوشی محمد کے بارے میں دو باتیں اس وقت کم و بیش یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چوری کی نیت سے آیا تھا۔ دوسری کہ اُس کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ چوری کی نیت سے

لے کر قتل کی واردات تک کا درمیانی علاقہ نامعلوم ہے۔ کس نے پہلے حملہ کیا، کیوں کیا، کیونکر کیا؟ ان باتوں کا تعین تفتیش سے ہوگا۔"

"قتل کی شہادت کیا ہے؟"

"آلۂ قتل۔"

"برآمد ہو گیا ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا ہے؟" اسد نے بے صبری سے پوچھا۔ "چاقو ہے؟"

"ہاں۔"

"مچھلی کی شکل کے دستے والا؟ پیتل کے دستے والا جس میں رنگ برنگے پتھر جڑے ہوئے ہیں؟"

"مجھے خبر نہیں۔" شاہ رُخ حیرت سے بولا۔ "تمہیں کیسے خبر ہے؟"

"اِس شکل کا ایک چاقو آلۂ قتل کے نام سے میرے سر منڈھا جا رہا ہے۔"

"جو ہتھیار برآمد ہوا ہے بہرحال اصلی ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"کیسے؟ تمہیں کیسے یقین ہے؟"

شاہ رُخ نے اُن تھکی ہوئی، لیفنہ آنکھوں میں پھر اُس اتھاہ اجنبیت کی جھلک دیکھی۔

"اول اُس کے گھر سے برآمد ہوا ہے۔ دوم اُس پہ انسانی خون موجود تھا۔ سوم زخم کی شکل و صورت اور نوعیت اس سے میل کھاتی ہے۔ کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی۔"

ابھی ابھی، اسد نے سوچا، اس نے کہا تھا قتل ایک ٹیڑھی سی چیز ہے۔ وہ چپ ہو گیا، خالی خالی آنکھوں سے شاہ رُخ کو دیکھتا رہا۔ پہلے اِتنا اسرار، پھر اتنی سادگی! یہ لوگ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ مجھے ان کی سمجھ کیوں نہیں آتی۔ میں ان لوگوں کی باتوں سے کیسے ایک دم اتنا دُور ہو گیا ہوں؟ اسد نے محسوس کیا کہ اب وہ پہلے کی طرح واقعات کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر کسی سیدھے سادے تسلی بخش نتیجے پر پہنچنے سے قاصر ہو چکا تھا۔ یہ نہیں کہ گتھی کو سلجھانے کی اُس کے اندر خواہش نہ رہی تھی۔ مگر حالات پہ اور واقعات کی ظاہری شکل پہ اُس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔

"خوشی محمد کو تم نے پکڑوایا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"اونہوں۔" شاہ رُخ نے نفی میں سر ہلایا۔ "اُس کے بھائی بندوں نے ہی مخبری کی تھی۔ مخبری میرے

تک پہنچی۔ میں نے آگے بڑھا دی۔ میرا اس میں اتنا ہی حصہ ہے۔"

ذوالفقار نے دروازے سے اندر جھانکا، جیسے کسی چیز کی تلاش میں ہو۔ میز پر اپنی سگریٹ کی ڈبیا دیکھ کر اندر چلا آیا۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے ایک سگریٹ سلگایا اور ڈبیا جیب میں ڈال لی۔ اس کے سر پر بالوں کی فصل اس شکل میں اگی تھی جیسے اس نے مٹیالے رنگ کی ٹوپی پہن رکھی ہو۔

"میرا خیال ہے۔" وہ کش لے کر بولا، "تم اب آرام کرو۔"

"میں اب ٹھیک ہوں۔" اسد نے کہا۔

"واہ۔" وہ ہنس کر بولا، "بستر پر اٹھ کر بیٹھنے سے ٹھیک ہو گئے ہو؟ تمہیں کم از کم دو چار دن اور خوراک کی اور آرام کی ضرورت ہے۔" ذوالفقار اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔" اس نے شاہ رخ سے کہا اور باہر نکل گیا۔

باہر نکلتے نکلتے ذوالفقار نے دروازہ بھیڑ دیا۔ رات کی روشنی اسد کی نظر سے اوجھل ہو گئی۔ دروازہ بند ہوتے دیکھ کر اس کا دل دفعتہً سکڑنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ شاہ رخ سے کہے، دروازہ کھول دو۔ مگر باہر پہاڑوں کی رات یک دم سرد ہو گئی تھی۔ اسد بستر پر اکڑوں بیٹھا دروازے کو گھورتا رہا۔

"شاہ رخ۔" اس نے پوچھا، "ذوالفقار کو تم کتنی دیر سے جانتے ہو؟"

"چند مہینے سے۔ تم تو اس کے پرانے واقف ہو۔"

"میرے ساتھ والے گاؤں کا رہنے والا ہے۔" اسد نے کہا، "یہ اس کا سرکاری مکان ہے؟"

"نہیں۔ ایک کشمیری کا ہے۔"

"یہ کیا کام کرتا ہے؟"

"سرکاری ملازم ہے۔"

"سرکاری ملازم تو تم بھی ہو۔" اسد نے کہا۔ "یہ کس قسم کا سرکاری ملازم ہے؟"

"تمہیں نہیں پتا؟" شاہ رخ مسکرا کر بولا۔

"نہیں۔"

"تمہارے ساتھ اس کی ملاقات تو ہو چکی ہے۔"

"ایک بار حوالات میں ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا پولیس میں ہو، کہنے لگا نہیں، سرکاری ملازم ہوں۔"

کچھ دیر کے بعد شاہ رخ نے جواب دیا۔ "غالباً فوج کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ ٹھیک سے مجھے بھی علم نہیں۔"

"پولیس کے ساتھ اس کا اثر رسوخ کیسے ہے؟"

"تھانیدار کلیم اللہ خاں کے ساتھ اس کا اچھا میل جول ہے۔ ویسے اس علاقے میں فوج اور پولیس کا آپس میں کچھ نہ کچھ تعلق رہتا ہی ہے۔ یہاں کا بہت سارا کاروبار فوج کے دم پر چلتا ہے۔ دراصل فوج کی آمد سے اس علاقے کے لوگوں کی مالی حالت کافی بہتر ہو گئی ہے۔ چنانچہ انتظامیہ کے کاموں میں فوج کا تھوڑا بہت دخل قدرتی امر ہے۔"

"ہوں—" اسد ٹھوڑی گھٹنوں پہ رکھے دروازے کو گھورتا رہا۔ "مجھے یہاں کیوں لے آیا ہے؟" پھر اس نے کہا۔

"جب میں چھٹی سے واپس آیا تو اس نے تمہارے بارے میں میرے ساتھ بات کی تھی۔ میرے خیال میں تمہارے ساتھ اسے ویسے ہی ہمدردی ہو گئی ہے۔ آدمی دل کا اچھا ہے۔ فوج میں ہونے کے باوجود بہت جذباتی اور مخلص شخص ہے۔ پڑھا لکھا آدمی ہے۔"

"ہاں۔" اسد نے کہا، "یہاں کیوں لے آیا ہے؟"

شاہ رخ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ "سب سے مناسب جگہ غالباً یہی تھی۔" وہ بولا۔

"مناسب جگہ سے کیا مطلب؟"

شاہ رخ نے جواب دینے سے احتراز کیا۔ جب اسد نے اپنا سوال دہرایا، تو بولا: "میں نے پوری کوشش کی تھی کہ تمہیں بنگلے لے جاؤں۔ مگر پولیس نے اعتراض لگا دیا۔"

"کیسا اعتراض؟"

"ان کے خیال میں گشت کے علاقے میں تمہارا جانا مناسب نہیں۔"

"کس کے خیال میں؟ تھانیدار کے؟"

"پولیس کے خیال میں۔" شاہ رخ نے کہا۔

"کیوں؟"

"نقضِ امن—"

"نقضِ امن؟" اسد بولا۔ "میں جرائم پیشہ آدمی ہوں؟" غصہ اس کے دماغ کو آندھی کی طرح چڑھا۔ "جرائم پیشہ میں ہوں یا وہ ہیں جو بے گناہوں کو پکڑ کر ان پر تشدد کرتے ہیں؟"

وہ کئی لمحوں تک اُبلتی ہوئی آنکھوں سے جواب طلب کرتا رہا۔ شاہ رخ نے خاموشی سے جھنجھوڑیں اور کندھے

اُچکا کر بے بسی کا اظہار کیا۔ شاہ رُخ کی اس حرکت کا اثر تھا یا کہ اپنی آواز کی بے جوابی کا احساس، اسد کا غصہ جس سُرعت سے چڑھا تھا، اسی تیزی سے ٹھنڈا پڑ گیا۔

"یا شاید اُسے یہ خدشہ ہے،" اسد متوازن آواز میں بولا "کہ میں اس کی کارگزاری لوگوں میں بیان کر دوں گا؟"

"نقصِ امن کا حیلہ کسی بھی مقصد کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔" شاہ رُخ نے کہا، "قانون نے اس سلسلے میں انہیں وسیع اختیارات دیے ہیں۔"

"مگر میں وہاں ....."

شاہ رُخ گویا اس کے دل کی بات جان گیا۔ "یاسمین اب بالکل ٹھیک ہے۔" وہ اسد کی بات کاٹ کر بولا، "اس پر صدمے کے اثرات کافی حد تک زائل ہو گئے ہیں۔ کچھ ان کے مزارعوں نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کیے تھے۔ میں نے انہیں دبا دیا ہے۔"

غصہ ایک بار پھر اسد کے دل میں اُچھال مارنے لگا۔ مگر اب کے یہ غصہ ایک بندھی بندھائی، بامعلوم صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ شاہ رُخ اس کے پاس گیا ہے؟ جاتا رہتا ہے؟ کتنی بار ملا ہے؟ وہ سوچنے لگا۔ یاسمین نے شاہ رُخ سے میرے بارے میں پوچھا ہے؟ وہ اب مجھ سے ملنے تو آ سکتی ہے۔ آتی کیوں نہیں؟ شاہ رُخ نے اُسے بتایا ہے؟ —— جب اسد کا دل اس اُچھال کی کوہان پر اٹھتا تو ایک ایک کر کے یہ سوال اُبھرتے، پھر ڈوب جاتے۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُسے گُم شدہ جانے سے روکا جا سکتا ہے۔

"مگر میں وہاں رہتا ہوں۔" وہ بے سمجھے آواز میں بولا، "علاج کروا رہا ہوں۔"

"علاج کرنے والا تو چل بسا۔" شاہ رُخ نے کہا، "پولیس کو خواہ مخواہ چیلنج کرنا مناسب نہیں۔ اس قصے کو بس ـــ ـــ ـــ"

"مناسب نہیں!" اسد بولا، "یہاں پر کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں۔ بے گناہوں کو پکڑنا مناسب ہے؟ میری بے گناہی ثابت ہو چکی ہے۔"

"یہ بات نہیں۔" شاہ رُخ نے صبر سے کہا، "تمہارے ذاتی تحفظ کے لیے بھی نقصِ امن لاگو ہو سکتا ہے۔"

"ذاتی تحفظ تو مجھے اسی روز حاصل ہو گیا تھا جب میں ان کی قید سے چھوٹا تھا۔" اسد طنز سے بولا۔ "گُم شدہ میں مجھے کیا خطرہ ہے؟"

"میں اُن کا نقطۂ نظر بیان کر رہا ہوں۔"

"تمہارا نقطۂ نظر کیا ہے؟" اسد تیزی سے بولا، "یا تمہارا کوئی نقطۂ نظر نہیں؟"

جواب میں اسد کو شاہ رُخ کے فراخ چہرے پر کھُلی ہوئی بے صوت آنکھیں ملیں، جن میں نسل در نسل اطاعت کی خاموشی اور اطمینان تھا۔

اس نے چیں بجبیں ہو کر کمرے میں ایک نظر دوڑائی۔ کوئی حیلہ۔ کوئی بہانہ۔ جب اُسے اور کچھ کہنے کو نہ ملا تو بولا، "میرا سامان وہاں پہ ہے۔"

شاہ رُخ کی آنکھوں کا رُخ بدلا۔ اسد کی نظروں نے ان کا پیچھا کیا، پھر اس نے جلدی سے جھک کر چارپائی کے نیچے نظر ڈالی تو اس کا سامان پڑا تھا۔ کالا ٹرنک، مقفل، اُوپر کمبل کا چھوٹا سا بقچہ، سب سے اُوپر بوٹوں کا ایک جوڑا۔ سب چیزیں اودوائن کی رسّی سے کس کر ایک گٹھڑی کی صورت میں باندھ دی گئی تھیں۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے، شاہ رُخ کو دیکھتے ہوئے، ہاتھ چارپائی کے نیچے لے جا کر اپنے سامان کو ٹٹولتا رہا۔ بہت آہستہ آہستہ، اُس کا دل بیٹھ گیا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اسد نے کہا: "تم کچھ نہیں کر سکتے؟"

"میں نے پوری کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔" شاہ رُخ نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چارپائی کے پاس کھڑا بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ "ذوالفقار نہیں آیا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"بنگلہ یہاں سے کتنی دور ہے؟" اسد نے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

"پانچ میل۔" شاہ رُخ نے جواب دیا۔ "کل آؤں گا۔" وہ ہاتھ ہوا میں لہرا کر دروازے سے نکل گیا۔ باہر جا کر اس نے آہستہ سے دروازہ بھیڑ دیا۔

اُس وقت ایک بار پھر اسد پر وہ دہلا دینے والا، بے بسی اور تنہائی کا احساس طاری ہونے لگا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کے وجود کی جڑیں ہلنے لگی ہیں، ان میں خلا پیدا ہو گئے ہیں اور ہوا بیچ سے نکل جا رہی ہے اور دُور دُور تک کوئی ان پہ ہاتھ رکھنے والا نہیں۔ وہ بستر پہ ڈھلک گیا۔ اس نے کمبل سے اپنے آپ کو ڈھانپ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذوالفقار دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، اسد کو سویا ہوا پا کر آہستہ آہستہ قدم رکھتا کمرے کے وسط تک گیا اور چند منٹ تک رُکا رہا۔ اسد نے سر اُٹھایا نہ آنکھیں کھولیں۔ اس میں اتنی ہمت نہ رہی تھی کہ ذوالفقار کا سامنا کرتا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے پھونک سے لیمپ بجھانے کی آواز سنی۔ پھر قدموں کی چاپ باہر نکل گئی اور

دروازہ بند ہو گیا۔

خواب میں اُس نے بند دروازے اور یاسمین کے کھُلی کھُلی آنکھوں والے لمبے تکونی چہرے دیکھے۔ پہاڑ کی ڈھلان پہ وہ لڑھک رہا تھا۔ کوئی شے دل سے نکل گئی تھی، مگر پتا نہیں چلتا تھا۔ دل ایک شکنجے میں تھا۔

★ ★ ★ ★ ★

"مَیں آج باہر جا رہا ہوں۔" صبح سویرے ذوالفقار نے اسد سے کہا، "رات کو دیر سے واپس آؤں گا۔ کریم کو کہہ دیا ہے۔ تمہارا کھانا تیار کر دے گا۔ آرام کرنا۔"

اسد چارپائی پہ بیٹھا، دودھ والی اُبلتی ہُوئی کشمیری چائے کا بڑا سا پیالہ پکڑے پیلی سی ڈبل روٹی بھگو بھگو کر کھا رہا تھا۔

"کل رات کو شاہ رُخ ــــ ـــ" اسد نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں۔" ذوالفقار نے اُس کی بات کاٹ کر کہا، "مَیں واپس آ رہا تھا تو ملاقات ہُوئی تھی۔ شام کو آئے گا۔"

ذوالفقار کرسی پہ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس کا ڈھلا ڈھلا، داڑھی منڈا صحت مند چہرہ ایک متعصد اور فرض شناس شخص کا چہرہ تھا۔ صرف اُس کی گول گول تیز آنکھوں میں کسی ایسے جذبے کی چمک تھی جو اُسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔ اُسے دیکھتے ہوئے اسد کو بلاوجہ شاہ رُخ کا چہرہ یاد آیا۔ شاہ رُخ کا چہرہ نسبتاً خوبصورت اور فراخ تھا، مگر اُس میں کوئی خاص بات نہ تھی، جیسے کہ اُس کے پیچھے کی زمین سپاٹ ہو۔ اُس کا چہرہ ایک عام سرکاری ملازم کا چہرہ تھا، ذہین، خدا خوف، کسی حد تک با اصول۔ اُس پہ نظر ڈال کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ سپاٹ زمین غیر آباد اور زرخیز ہے، اسے قبضے میں لے کر کچھ بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ایسے آدمی کا چہرہ تھا جسے اصُول کے نام پہ حکم دے کر بے مثال سفاکی کا اہل بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے برعکس ذوالفقار کا چہرہ سنگلاخ زمین پر قائم تھا۔ اُس زمین پہ بے شمار زیروبم، دھوپ سائے، خاردار جھاڑیوں کے نشان ملتے

تھے۔ یہ احساس ہوتا تھا کہ متعصدی اور فرض شناسی کے علاوہ کوئی اور قوت بھی ہے جو اس شخص کی جڑوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے۔ یہ کون سی شے تھی؟ علم؟ جنون؟ جبر؟ ـ ـ ـ ـ اس چہرے کا ایک ذہن تھا۔ یہ شخص ان لوگوں میں سے تھا جن کے اُوپر پُرشکوہ حکومتوں کے عہد چلتے ہیں۔ اِس چہرے پہ بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ اسد کے دل میں اچانک، پہلی بار، ذوالفقار کے اُوپر اعتماد کا جذبہ پیدا ہُوا۔

"مَیں گُنشد کیوں نہیں جا سکتا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"جنبہ؟"

"گُنشد میں میرا داخلہ کیوں بند ہے؟"

"تمہاری حفاظت کا معاملہ پولیس کے پیشِ نظر ہے۔"

"مجھے کس سے خطرہ ہو سکتا ہے؟"

"حکیم کے کچھ مزارعے پہلے ہی سر اُٹھا چکے ہیں۔ شاہ رُخ کی مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے۔ یاسمین گُل پھر بھی گاؤں کی اپنی لڑکی ہے۔ جیسے تیسے حالات کے مطابق رہنا سیکھ لے گی۔ تمہارا معاملہ مختلف ہے۔"

"کیسے؟"

"تم اجنبی ہو۔ جرم اور سزا کا معاملہ ایک عجیب معاملہ ہے۔ ایک طرف یہ سراسر قانونی معاملہ ہے، دُوسری طرف پر ذاتی معاملہ بن جاتا ہے۔ آج اگر خوشی محمد کا جُرم ثابت ہو جاتا ہے اور اُسے سزا ہو جاتی ہے، تو بھی تمہارے خلاف ان دیہاتیوں کا بُغض قائم رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کئی ایسے ہوں گے جو آخری دم تک خوشی محمد کو بے گناہ ہی سمجھیں گے۔"

میری بے گناہی ثابت ہو چکی ہے، اسد نے کہنا چاہا۔ مگر زبان روک کے ذوالفقار کو دیکھتا رہا۔

"پھر اگر تم انہی لوگوں کے درمیان جا کر، اُسی گھر میں رہنا شروع کر دو تو معاملہ ذرا ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ بےشک اس کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ پولیس نہیں چاہتی کہ اُن کے اُوپر بھی کسی قسم کا کوئی حرف آئے۔"

"مَیں پولیس کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔" اسد نے کہا۔

"تمہیں علم ہے یہ علاقہ اپنی تاریخ کے نازک ترین دَور سے گزر رہا ہے۔ ان حالات میں کسی چھوٹی سے چھوٹی بدامنی کا رسک بھی نہیں لیا جا سکتا۔ یہ قوم اِس وقت جس مرحلے پہ ہے اُس کو اگر ہم نے کامیابی سے سر کرنا ہے تو اتحادِ نیز کا مکمل کنٹرول اس کے لیے پہلی شرط ہے۔"

"اتحادِ نیز!" اسد نے اچنبھے سے دہرایا۔ "اتحادِ نیز تو نظم و نسق چلانے کے لیے ہوتی ہیں۔ قوموں

کے مرحلے کیسے سر کر سکتی ہیں؟"

ذوالفقار کے چہرے پر ہلکی سی پُر اعتماد مسکراہٹ ظاہر ہوئی۔ "پراپیگنڈا، میرے دوست، جو تمہیں اخبار اور کتابوں میں ملتا ہے۔ سیاست کے مرحلے طے کرتا ہے، جنگ کے۔ قوم۔ جمہوریت۔ انقلاب۔ یہ سب کیا ہے؟" اُس کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے ہوا میں اُٹھا اور ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ میز پر آ رہا۔ "ایکشن۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔ "ایک ہزار کتابیں لکھی جاتی ہیں تو ایک دورِ عمل آتا ہے۔ دُنیا کے بڑے بڑے انقلابوں میں لاکھوں آدمیوں کو، انقلاب کے سپاہیوں کو مروا دینا ضروری سمجھا گیا۔ کیوں؟ ڈسپلن۔ تمہیں علم ہے اس وقت بڑی بڑی نامور انقلابی حکومتوں کو کون چلا رہا ہے؟" اُس نے اعلانیہ انداز میں انگلی ہوا میں اُٹھائی۔ "ملٹری۔"

ذوالفقار کی آنکھوں کی پوشیدہ آگ چمک اُٹھی تھی۔ اسد اُس کے جذبے کے چنگل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

"اس قوم کو اب قیادت اور کنٹرول کی ضرورت ہے ———" ذوالفقار کہہ رہا تھا۔

"مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔" اسد نے کہا۔

ذوالفقار نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔ "ٹھیک ہے۔ تمہیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہے تو بہت کچھ کر سکتے ہو۔ مگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو بہتر یہی ہے کہ واپس اپنے گاؤں چلے جاؤ اور یاسمین کو خط لکھ کر بلوا لو۔ وہ اپنی جائداد وغیرہ بیچنے کا بندوبست کر سکتی ہے ——— بشرطیکہ وہ جانا چاہے۔"

"وہ جانا چاہتی ہے۔" اسد نے جلدی سے کہا۔

"تمہیں یقین ہے وہ جانا چاہتی ہے؟" ذوالفقار نے مُسکرا کر پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے یقین ہے۔ جائداد کا بندوبست کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔" اسد نے بات بنائی، "مگر سب سے پہلے مجھے اپنی دوا حاصل کرنی ہے۔ اس کے بغیر میرا زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔ یاسمین کو ———"

ذوالفقار کی ہنستی ہوئی، ٹھٹھا کرتی ہوئی آنکھوں کے سامنے اُس کا عزم ٹوٹنے لگا۔ اُس نے بمشکل جملہ پورا کیا، "اس دوا کا علم ہے۔"

کھلے دروازے سے صبح کی دھوپ میں ملبوس پہاڑ کی چوڑی پُشت نظر آ رہی تھی۔ جگہ جگہ پہ گھنے بلند درختوں کے جھُنڈ تھے جو دُور سے جھگنی سیاہ جھاڑیوں کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ اسد کی طویل، ٹھہری ہوئی نظر ان پہ اٹکی رہی۔ کوئی حیلہ، کوئی بہانہ! آسمان کا رنگ کس قدر صاف ہے، اس نے حیرت سے سوچا۔ صاف اور نیلا۔ اِتنا خالص اور شوخ رنگ آسمان کا مَیں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اسد کو پہلی بار احساس ہُوا کہ وہ

بے گھر ہو گیا ہے۔ گشید کا نقشہ اس کی آنکھوں کے آگے آ کر ٹھہر گیا۔ سنسان دیواروں سے لپٹی ہوئی دھوپ سناٹے کے عالم میں تھی، اور ہر دیوار کے ساتھ ایک ہی صُورت کھڑی تھی۔ اسد کا دل حلق کی جانب لپکا۔ یاسمین! اس نے آنکھیں اُٹھا کر ایک پیلی سی نظر آسمان پر ڈالی۔ آسمان کے بیچوں بیچ دھوپ میں ہیرے کی مانند چمکتا ہُوا ایک پرندہ اُڑ رہا تھا۔ اسد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ سے پیالے کی تہہ میں بچی ہوئی چائے کے گول دائرے میں لرزش پیدا ہُوئی۔ اُس نے پیالہ اپنے آگے بستر پر رکھ دیا۔ دفعتہً، اُس کا ضبط ٹوٹ گیا۔

"اگر آپ ———" اُس نے دروازے سے باہر دیکھتے ہُوئے بمشکل کہا، "کچھ مدد کریں، تو چند روز میں یہ کام ہو سکتے ہیں۔"

انصاف کی طلب سے، اُس نے سوچا، مدد کی طلب تک، آنکھ جھپکنے کا وقفہ ہے۔

ذوالفقار کے چہرے سے مُسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ گہرے تفکّر کی نظر سے اسد کو دیکھنے لگا۔ اُس نے سگریٹ کا ایک آخری کش لگایا، سگریٹ کو زمین پر پھینک کر اُسے چمکتے ہُوئے سیاہ بُوٹ کی ایڑی سے مسلا، اور لمبے سانس کے ساتھ دھوُاں چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

اُس نے دوبارہ آہستہ آہستہ سر کو اثبات میں ہلایا۔ "ہوں۔" اُس نے حلق سے موافق آواز نکالی، اور پیالہ اُٹھا کر باہر نکل گیا۔

★ ★ ★ ★ ★

رات کے گھُپ اندھیرے میں درختوں کی حد پر پہنچ کر دونوں آدمی رُک گئے۔ کچھ دیر تک وہاں کھڑے وہ تاریکی میں ڈوبے ہُوئے گاؤں پر نظر دوڑاتے رہے۔ گشید میں کوئی حرکت نہ تھی۔

پھر شاہ رُخ نے اپنی رائفل دہنے ہاتھ سے بائیں میں منتقل کر کے خالی ہاتھ آگے بڑھایا۔ "اُمید نہیں کہ کوئی گڑبڑ ہو۔" اُس نے کہا۔ "ہوئی تو فکر مت کرنا۔ مجھے خبر ہو جائے گی۔ خدا حافظ۔"

اسد نے خاموشی سے ہاتھ ملایا اور کوئی بات کیے بغیر کھُلی زمین پر نکل آیا۔ ہوا میں خُنکی آ چلی تھی۔ آہستہ آہستہ

چلتا ہوا وہ اس مختصر سے سفید میدان کو پار کرنے لگا۔ ایک بار اس نے مڑ کر دیکھا۔ شاہ رخ درختوں میں غائب ہو چکا تھا۔ چار پانچ میل کے پیدل سفر کے بعد اس کی ٹانگیں کمزوری سے لرز رہی تھیں۔ کپڑوں کا چھوٹا سا بقچہ بغل میں دبائے وہ گشتہ کی دیواروں تک پہنچا۔ اچانک ایک طرف سے کتے نے بھونکنا شروع کر دیا۔

اس نے رک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ کتا رات کے اندھیرے میں عادتاً بھونک رہا تھا۔ اس کی آواز پہ گاؤں کی تین چار مختلف سمتوں سے کتے جواباً بھونکنے لگے۔ چند منٹ تک یہ شور جاری رہا۔ کدھر سے جاؤں؟ اسد نے دیوار کے پاس کھڑے کھڑے سوچا۔ اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟ بستر پہ لیٹی ہوگی؟ سو رہی ہوگی؟ سونے کی کوشش کر رہی ہوگی؟ شاید حسین بی بی سے باتیں کر رہی ہو؟ بڑھیا ابھی وہیں رہتی ہوگی؟ بڑھیا کہاں جائے گی؟ وہ تو اس کی ماں کی جگہ پر ہے۔ کھڑکی کی طرف سے جانا ٹھیک نہیں۔ یاسمین کو خیال بھی نہیں ہوگا میں اس وقت آ سکتا ہوں۔ رات کافی پڑ گئی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ کیا کرے گی؟ دھڑک۔ دھڑک۔ دھڑک۔ اسد کا دل اچھل اچھل کر پسلیوں کی دیواروں پر سر ٹپک رہا تھا۔

جب تک وہ فی الواقع گشتہ کی گلیوں میں آ گھڑا نہ ہوا تھا اسے اس بات کا خیال بھی نہیں آیا تھا کہ گاؤں کے لوگوں کا رویہ اس کے ساتھ کیسا ہوگا۔ اب سنسان دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے ان لوگوں کی خاموش سلگتی ہوئی مخالفت کو، ان کی پوشیدہ جارحیت اور ان کے تنگ و تاریک دیہاتی شبہے کو اپنی ہڈیوں میں محسوس کیا۔ تھکاوٹ سے اس کی پنڈلیوں میں درد ہونے لگا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی چھاتی اور حلق کو سہلایا۔ دل کو ٹھہرانے کی کوشش کی۔ لمبے لمبے سانس لیے، مگر دل زخمی پرندے کی مانند پھڑکتا رہا۔ مطلب تاریک پڑا تھا۔ اسد نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ دروازے کی طرف سے جائے گا، مگر دروازے پر پہنچ کر اس نے رخ بدلا اور دیوار کے ساتھ دبے پاؤں چلتا ہوا کھڑکی کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ اس نے کھڑکی کی درزوں سے آنکھیں لگا کر دیکھا۔ اندر تاریکی تھی۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ دھڑک۔ دھڑک۔ دھڑک۔ اس کے دل کے دھڑکنے کی آواز تھی۔ آ۔ اونچی کہ اسے خدشہ ہونے لگا کہیں اندر یاسمین تک نہ پہنچ جائے۔ وہ واپس دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ اس کے پیٹ کے اندر سردی کا تشنج پیدا ہو رہا تھا اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ اٹھانا چاہا مگر اسے محسوس ہوا کہ کہنی میں طاقت نہیں رہی۔ اس نے ایک لمبا سانس کھینچ کر ادھر اُدھر دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر دروازے پر رکھ دیا۔ (دروازے کی سرد اور کھردری لکڑی کا وہ لمس اسے عمر بھر یاد رہا) دروازے کی درزوں میں روشنی ابھری اور آواز آئی: "کون ہے؟" آواز حسین بی بی کی تھی۔

"میں ہوں۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

بڑھیا نے کنڈی اتار کر دروازہ ذرا سا کھولا اور لالٹین اٹھا کر روشنی اسد کے چہرے پر ڈالی، پھر کواڑ کھول کر ایک طرف کو ہٹ گئی۔ اونچے نیچے ٹوٹے ہوئے فرش والی ڈیوڑھی میں کھڑی وہ اسد کو خالی خالی، بوڑھی بے پہچان نظروں سے دیکھتی رہی۔

"یاسمین کہاں ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"سو رہی ہے۔" حسین بی بی نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

اسد نے اس کے ہاتھ سے لالٹین پکڑ لی اور یاسمین کے کمرے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

"اپنے ابا کے کمرے میں سوتی ہے۔" حسین بی بی نے کہا۔

اسد نے حیرت سے اسے دیکھا اور حکیم کے کمرے کی طرف لوٹ آیا۔ دروازے پر ہاتھ رکھ کر اس نے آہستہ سے دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔ لالٹین اٹھائے وہ کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں خواب آلود سانس کی ہلکی ہلکی حرارت اور خوشبو تھی: تازہ خمیری روٹی کی سی نیم گرم آسودہ خوشبو۔ لالٹین کی روشنی میں کمرے کا نقشہ ایک دم ابھر آیا۔ ہر ایک چیز اسی جگہ پر تھی جہاں ہمیشہ سے رکھی تھی، صرف بستر کے آگے چپل کا جوڑا یاسمین کا تھا۔ بستر پہ یاسمین موٹی سندور رنگ چادر سے ادھ ڈھکی ابتدائی شب کی گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ سیدھی پشت پر پڑی تھی اور اس کا سر تکیے پر ایک طرف کو مڑا ہوا تھا۔ ایک ٹانگ ٹیڑھے زاویے پر چارپائی کے کنارے تک چلی گئی تھی اور پیر چادر سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے کھلے ہوئے، تازہ تازہ تیل لگے بال ماتھے اور کانوں کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ نیند میں وہ بے معلوم سی سست رفتار آسودہ سانس لے رہی تھی۔ اسد دیر تک چارپائی کے پاس کھڑا لالٹین ہلا ہلا کر، مختلف جگہوں سے روشنی ڈال کر اس کے چہرے کے سایوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے کبھی یاسمین کو آرام دہ خواب کی حالت میں نہ دیکھا تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔

اسد نے محسوس کیا کہ اس کی پشت پر کوئی کھڑا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا، مگر دروازے میں سے حسین بی بی کا چہرہ نظر آیا جو اس کے مڑنے پر غائب ہو گیا۔ اسد نے لالٹین زمین پر رکھی اور دروازے کے پاس جا کر کواڑ بند کر دیے۔ کمرے کے فرش پر دبے پاؤں چلتا ہوا وہ واپس آ رہا تھا کہ یاسمین نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے تک وہ بے نظری سے چھت کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اسد کو دیکھا اور جھٹکے سے سانس کھینچ کر اٹھ بیٹھی۔ خوف کے مارے اس کے منہ سے ایک چیخ نما آواز نکلی جسے اس نے فوراً منہ پر ہاتھ رکھ کر دبا لیا۔ اس نے مڑی ہوئی ٹانگ کو کھینچ کر دوسری ٹانگ کے برابر رکھا اور گھٹنے چھاتی سے لگا کر، ایک ہاتھ منہ

پہ اور دوسرا گلے پہ رکھے، پھٹی پھٹی وحشی نظروں سے اسد کو دیکھتی رہی۔ اسد کی ٹانگوں کی تھکاوٹ اور بدن کی لرزش غائب ہو چکی تھی۔ اس کا دل ٹھہر گیا تھا اور وہ چارپائی سے ایک گز کے فاصلے پر آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے کھڑا ہلکے ہلکے سانس لے رہا تھا۔ اس کے پیٹ کا تشنج حرارت کی لہر نے پگھلا دیا تھا۔

"اسد۔" یاسمین نے سرگوشی کی، جیسے اپنے آپ کو بتا رہی ہو۔ پھر وہ تڑپ کر بستر سے اٹھی اور ایک گہری آواز نکال کر اسد کے بہت قریب آ کھڑی ہوئی۔ اندھوں کی طرح منہ اٹھا کر اس نے ہاتھوں سے اسد کے چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ ناک، منہ، آنکھیں، بال، پھر کندھے، بازو، سینہ، پھر کمر۔ کمر کے گرد بازو۔

"اسدی۔" وہ بولی۔ اس کی آواز حیرت ناک طور پہ پرسکون تھی۔ "تم آ گئے ہو۔" مگر اس کے ہاتھ، اس کے سب اسی طرح مضطرب، بے اعتماد، بے قرار رہے۔ اس کا ایک پیر لالٹین کے تپے ہوئے شیشے سے لگا اور وہ "سی" کر کے یک طرف کو اچھل گئی، مگر اس نے مڑ کر نہ دیکھا۔ اس کے ہاتھ تھے، نظریں سامنے مرکوز رہیں، جیسے عبادت کی حالت میں۔ اس کی ٹھوکر سے لالٹین اوندھی ہو گئی تھی اور چمنی سے شیشے کا ایک گول ٹکڑا تڑخ کر علیحدہ ہو گیا تھا جس میں سے بتی سیاہ دھواں اگل رہی تھی۔ کچا تیل جلنے کی بو اسد کی ناک میں پہنچی تو وہ چونکا۔ لالٹین کی کپی کا ڈھکنا ڈھیلا تھا اور اس میں سے تیل رس رس کر زمین پر بہہ رہا تھا۔ اسد نے جھک کر لالٹین سیدھی کی اور سوراخ میں پھونک مار کر بتی بجھا دی۔ کچے دھوئیں کی بو آہستہ آہستہ اندھیرے میں تحلیل ہونے لگی۔ یاسمین کے ہاتھوں کو روشنیاں لگی تھیں، جن میں دیکھ بھال کر وہ اسد کی پہچان کر رہی تھی۔ "اسدی۔" وہ اسد کے ساتھ جٹ کر دھیمی، متوازن آواز میں رونے لگی، جیسے عام لہجے میں کوئی بات کر رہی ہو۔

★ ★ ★ ★ ★

"اسدی۔" یاسمین نے کہا۔ "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اسد نے ہنس کر جواب دیا۔ "میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

اسد اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا اور اس کے پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ مشرقی آسمان پر اجالا

تھی، اور آسمان کے اندر پہاڑ کی چوٹیوں کی کٹی پھٹی، اونچی نیچی لکیر بڑی شوخ اور واضح ابھرتی چلی آ رہی تھی۔ دائیں طرف کو ایک چوٹی تھی جس کے قریب ایک گاؤں واقع تھا، اور کبھی کبھی چوٹی کی لکیر کے اوپر کوئی بکری یا کوئی بھیڑ اجلے آسمان کے مقابل نیچے سے سیاہ پتھر کے بت کی مانند کھڑی نظر آ جاتی تھی۔ پہاڑ کی چوٹی کے پاس بود و باش رکھنے والے یہ لوگ اسد کو بے حد اجنبی لگتے تھے، جیسے کوئی غیر ملک ہو۔ اتنی اونچائی پہ، الگ تھلگ۔ برف اور برفانی ہوائیں اور دشوار گزار راستے، اس نے کھڑکی میں کھڑے کھڑے سوچا، گرم ٹوپیاں، موٹی موٹی گالوں والے بچے۔ راہب گاؤں ....

مغرب کی جانب آسمان ابھی سیاہ تھا۔ پہاڑ کا مہیب، تاریک جثہ آسمان کے اندر سے بہت مدھم مدھم ابھر رہا تھا۔ اسد نے دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور صبح کی ہوا کو اپنے چہرے پر چلتے ہوئے محسوس کیا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگوں کو سردی لگنے لگی تھی۔ وہ کھڑکی سے لوٹ آیا۔

یاسمین پہلو کے بل لیٹی، سر ہاتھ پہ اٹھائے اسے بستر کی طرف آتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"تمہارے گھٹنے بجتے ہیں۔" وہ شرارت سے ہنسی۔

"ہنہہ؟"

"چلتے ہوئے تمہارے گھٹنے ایک دوسرے سے بجتے ہیں۔"

"کہاں بجتے ہیں!" وہ جھینپ کر بولا۔

"دیکھ لو۔" وہ ہنسی۔ "میں نے آج دیکھے ہیں۔"

اسد آ کر اس کے برابر لیٹ گیا۔

"اسدی۔" یاسمین نے اس کی ٹانگوں کو چادر سے ڈھک کر کہا۔

"ہوں۔"

کھڑکی کے راستے آسمان کی ہلکی ہلکی روشنی اسد کے سر پر پڑ رہی تھی۔

"سوروں نے،" وہ روتی ہوئی غضبناک آواز میں بولی، "تمہارے ساتھ کیا کیا ہے!"

اسد اس کے اٹھے ہوئے کندھے پہ ہاتھ رکھے اسے دیکھتا رہا۔

"سولہ دن میں تمہاری ہڈیاں نکل آئی ہیں۔"

"سولہ دن ہوئے ہیں؟"

"ہاں۔" یاسمین کا ہاتھ اس کی پسلیوں پہ رکھا رکھا کپکپا رہا تھا۔ "پچھلے سے پچھلے منگل کو تم گئے تھے۔

آج بدھ ہے۔"

ایک، دو، تین، چار، پانچ ...... اسد دنوں کا حساب کرنے لگا۔

"کیا گن رہے ہو؟"

"دن۔" اسد نے کہا۔ "ساتویں دن تک مجھے یاد ہے۔ میں نے دنوں کا حساب رکھنے کی کوشش کی تھی۔

پہلے دن کیا ہوا تھا۔

"پوچھ گچھ۔" وہ بولا۔

"کیسی پوچھ گچھ؟" یاسمین کے لہجے میں تجسس تھا۔ "تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں۔"

کچھ دیر وہ اسد کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ "کیسی پوچھ گچھ؟" اس نے دہرا کر پوچھا۔

اسد خاموش رہا۔

"بتاؤ۔" وہ بولی۔ پھر اچانک وہ اپنے سوال پر پشیمان ہو گئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنا بازو اسد کے سینے پہ ڈال دیا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"میں ہر وقت سوچا کرتی تھی تم اب کیا کر رہے ہو گے، کیا سوچ رہے ہو گے۔ بس اس لیے پوچھتی ہوں۔ اور کوئی بات نہیں۔"

اسد لیٹا لیٹا مسکرایا۔ "پھر بتاؤں گا۔" اس نے کہا۔ "مجھے یاد ہے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میرا پوچھنے کا مطلب نہیں۔ میں نے تو صرف پوچھا ہی ہے۔ پوچھنے میں کیا حرج ہے۔"

"کوئی حرج نہیں۔" وہ آہستہ سے ہنسا۔ "تم کیا سوچا کرتی تھیں؟"

"میں سوچ سوچ کر پاگل ہو گئی تھی، اسد، یہ سچ ہے۔ کبھی ایک بات سوچتی کبھی دوسری۔ آخر میرے دماغ میں کچھ بھی نہ رہتا۔ ایسے لگتا جیسے خالی ہو گیا ہے۔ تمہارا دماغ کبھی خالی ہوا ہے؟"

"ہاں۔"

"جب دل سے کوئی بات بھی نہیں نکلتی؟ ہر وقت دماغ میں ہوا کا گرد بکھرا رہتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" اسد نے کہا۔

"ایسے لگتا تھا جیسے ہر چیز ملتوی ہو گئی ہے۔ یا پیچھے رہ گئی ہے۔ وقت تھم گیا ہے۔"

اسد اس کی بات پہچان کر چونکا۔ اس کی آنکھیں نیم تاریکی میں چمکیں۔

"اچھا؟" اس نے خوشی سے پوچھا، مگر دھیمے سپاٹ لہجے میں، گرم جوشی کے بغیر۔ "تمہارے لیے بھی؟"

"میرے لیے بھی؟" یاسمین نے بے خیالی سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولا۔ "وقت۔"

"وقت کیا؟"

"تھم گیا تھا؟"

"ہاں۔" یاسمین نے کہا۔ "جیسے وقت رک جاتا ہے۔ نہ آگے چلتا ہے نہ پیچھے۔ نہ کچھ آتا ہے نہ جاتا ہے۔ جیسے سوچ کا تار ٹوٹ جائے۔"

"ہاں۔" اسد نے کہا۔

"میرا دل کرتا تھا دیوار سے ٹکر مار کر اس ہوا کے گولے کو پاش پاش کر دوں۔ تاکہ کچھ یاد آئے۔ کوئی خبر ملے نہ ملے، کوئی خیال تو آئے۔"

"ہوں۔" اسد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اسی لیے پوچھتی ہوں۔" یاسمین نے کہا۔

"پھر بتاؤں گا۔" اسد نے کہا۔ یاسمین نے ہاتھ رکھ کر اس کا منہ بند کر دیا۔ اسد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ اسد آرام سے لیٹا چھت کو، اور یاسمین اسد کو دیکھتی رہی۔ دن کی روشنی دیکھتے دیکھتے بڑھ رہی تھی اور چھت کی سایہ دار جگہیں ایک ایک کر کے اجالے میں آتی جا رہی تھیں۔ چند گھنٹے کی گہری نیند نے اس کے اعضا کو آسودہ کر دیا تھا۔ اس کے بدن میں اس وقت مکمل ضبط کا احساس تھا۔

"دوسرے دن۔" اسد نے اسی دھیمے سپاٹ لہجے میں بات کی۔ "میں نے تمہارا بیان دیکھا۔"

"میرا بیان؟"

"جو تم نے دیا تھا۔"

"کیا تھا؟" وہ بولی۔

"تم بتاؤ۔" اسد نے کہا۔ "تم نے کیا بیان دیا تھا؟"

یاسمین چند لمحوں تک غور سے اسد کو دیکھتی رہی۔ پھر جلد جلد بولنے لگی۔ "تمہارے جانے کے اگلے دن

تھانیدار اور ایک سپاہی آئے صبح سویرے۔ کہنے لگے کچھ پوچھ گچھ کرنی ہے۔ مَیں نے اُن کو بٹھایا۔ تمہارا مَیں نے پوچھا۔ کہنے لگے تم وہاں بڑے آرام سے ہو، ابھی بیان مکمل نہیں ہُوا، کچھ ڈاکٹری رپورٹوں کا انتظار ہے، ایک آدھ روز میں فارغ ہو جاؤ گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ جب کئی روز تک تم نہ آئے تو پھر اُس وقت میرے دل میں خیال آنے بند ہو گئے ......"

"تمہارا بیان؟" اسد نے بے صبری سے پوچھا۔

"جب مَیں تمہارے متعلق پوچھ چکی تو انہوں نے اپنے سوال شروع کیے۔ ابا کے بارے میں باتیں کہاں سے آئے، کہاں رہتے تھے، کیسے کام کرتے تھے، کس کس سے میل جول تھا، لین دین وغیرہ وغیرہ۔ بہت سی باتوں کا مجھے پتا ہی نہ تھا، کوئی زیادہ جرح وسح نہیں کی، جو مَیں بتاتی گئی لکھتے گئے۔ قتل کی رات کے،" وہ رُکی، "واقعات تمہارے بارے میں بڑی تفصیل سے دریافت کیا۔ تمہارا عارضہ، دوا وغیرہ۔ پہلی بار کتنا عرصہ ہے، کب گئے، کیوں گئے، کب واپس آئے۔ میرے اور تمہارے بارے میں ...." وہ رُک کر خاموشی سے اسد کو دیکھنے لگی۔

"تم نے کیا کہا؟"

"جو بات تھی مَیں نے بتا دی۔ جو بات انہوں نے پوچھی مَیں نے اُس کا جواب دے دیا۔"

"تم نے اپنا بیان پڑھا تھا؟"

"نہیں۔ تھانیدار نے میرے آگے کیا تھا، مگر مَیں نے نہیں پڑھا۔"

"کیوں نہیں پڑھا؟" وہ غصہ دبا کر بولا۔ "تمہارا فرض تھا اپنا بیان لے کر پڑھتیں۔"

"میرے سامنے تو وہ لکھ رہا تھا۔" یاسمین ٹھٹک کر بولی۔ "جیسے جیسے مَیں بولتی جاتی تھی وہ لکھتا جاتا تھا۔ میرے خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس میں کوئی رد و بدل کرے گا۔ اُن کا مقصد مجرم پکڑنا تھا۔ مَیں اور تم دونوں گواہ ہیں۔"

"تم نے انہیں بتایا تھا کہ جب مَیں اُس رات کو مطب میں گیا تو تم میرے ساتھ نہیں تھیں بلکہ مَیں اکیلا تھا؟"

"نہیں۔ مَیں نے اپنے بیان میں وُہی لکھوایا جو پہلے دن کہا تھا، کہ جب تم نے مطب میں روشنی دیکھی تو مَیں تمہارے ساتھ تھی۔ انہوں نے اس بات کو کھینچا نہیں، مَیں نے اور کچھ کہا نہیں۔"

"پھر کس نے انہیں اس بات کی خبر دی ہے؟"

"پتا نہیں۔ مگر سارے گاؤں میں تفتیش کرتے پھرے ہیں۔"

"میر حسن گاؤں میں ہے؟"

"نہیں۔ بھاگا ہوا ہے۔ سُنا ہے اُس کے باپ نے اس ڈر سے کہ اُس پر شبہ ہوگا اپنے بھائی کے پاس بھیج دیا ہے۔ یہ بھی افواہ ہے کہ سرحد پار کر کے نکل گیا ہے۔"

"پولیس والوں کو علم ہے؟"

"ضرور ہوگا۔ سارے گاؤں کو علم ہے۔ تھانیدار مجھے بار بار مجبور کرتا تھا کہ مَیں اپنے ذہن پر زور دے کر سوچوں اور جہاں تک ممکن ہو کسی پر شبہ ظاہر کروں۔ میرے آگے اُس نے کتنے ہی نام رکھے۔ ولی، بغیاث۔ میر حسن۔ خوشی محمد۔ مگر مَیں نے کسی کو ......"

"خوشی محمد؟" اسد چونکا۔

"وہی کتا تھا۔" وہ جوش سے بولی۔ "مگر اُس وقت مَیں نے ...."

"خوشی محمد کا نام تم نے تجویز کیا تھا؟"

"نہیں۔ خوشی محمد پہ اُس وقت بھی اُن کا شُبہ تھا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ میں کسی نہ کسی طرح اُس پہ اُنگلی رکھوں۔ ہائے اسد، مَیں نے کتنی بیوقوفی کی جو اُس وقت اگر میں ......" وہ باتیں کرتے کرتے رونے لگی۔

اسد کے ذہن کی فضا صاف اور پرسکوت تھی۔ اُس کے تجسس کی شدت اس ڈھب کی تھی جیسے اُس کے نہیں کسی اور کے بارے میں بات ہو رہی ہو۔ اُس نے اپنا ہاتھ یاسمین کے کندھے سے اُٹھا کر اُس کی پُشت پر رکھ دیا۔

"چپ کرو۔ رو ؤ نہیں۔" اُس نے نرمی سے کہا۔ "سوچ کر بتاؤ۔ خوشی محمد کے اوپر اُن کا شُبہ کس بنا پر تھا؟"

"یہی کہ وہ عادی چور تھا۔" یاسمین نے چادر سے آنکھیں خشک کیں۔ "پہلے بھی سزا یافتہ ہے۔"

"تمہیں پتا ہے کہ اُس کے کچھ پیسے تمہارے ابا کی طرف نکلتے تھے؟"

"نہیں۔" یاسمین نے کہا۔ "نکلتے تھے؟"

"سُنا یہی ہے۔"

"کس سے؟"

"شاہ رُخ سے۔"

"بنگلے ہوں گے۔" یاسمین نے کہا، "اِس سے کیا ہوتا ہے۔ ابّا سے اُس کا لین دین رہتا ہی تھا۔ کبھی اُس کے پیسے رہ جاتے تھے، کبھی وہ چنگل بھی لے جاتا تھا۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اسد نے کہا، "یہ بتاؤ، تمہیں اچھی طرح سے یاد ہے کہ خوشی محمد پر پولیس نے اپنا شبہ ظاہر کیا تھا؟ یعنی اُس وقت؟ تمہارا بیان لینے کے وقت؟"

"ہاں۔ اُس کے بعد وہ آئے ہی نہیں۔ گاؤں میں آتے رہے ہیں، مگر میرا اُن سے سامنا اُس کے بعد نہیں ہوا۔"

"میرے جانے سے اگلے روز؟"

"ہاں۔ تمہارے جانے سے اگلے روز۔" اُس نے پہلی بار حیرت سے اسد کو دیکھا، "کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اسد نے سکون سے کہا، "آگے بتاؤ۔"

"پھر ——" یاسمین اپنی یاد کو سمیٹتے ہوئے ایک لمحے کو رُکی، "بس پھر میرا بیان ختم کرنے کے بعد اُس نے پوچھا کہ کوئی اور بات رہ گئی ہے جو میں کہنا چاہتی ہوں۔ میں نے کہا نہیں۔ پھر میں نے دوبارہ اُن سے تمہارا پوچھا۔ تھانیدار نے مجھے تسلی دی۔ حرامزادہ۔ کتّا۔" وہ بلک پڑی۔ اسد نے اُس کی پشت پر اپنا ہاتھ دبا کر اُس کی آواز کو سہارا دیا۔ "کہنے لگا تفتیش مکمل کرنے میں تمہاری مدد کی اُن کو اشد ضرورت ہے، ایک دو روز میں تم واپس آ جاؤ گے۔ ہاں۔ بیان ختم کرنے کے بعد اُس نے کہا کہ ممکن ہے عدالت میں میری گواہی کی ضرورت پڑے۔ میں گواہی دینے کے لیے تیار ہوں؟ میں نے کہا تیار ہوں۔ بس پھر وہ چلے گئے۔"

"ززاخ۔" اسد کے دماغ میں بلاوجہ ایک پٹاخے دار آواز ابھری۔ اُس کے دل میں غصّہ ایک بار پھر سر اُٹھا رہا تھا۔

"بس؟" اُس نے پوچھا۔

"بس۔ اس کے بعد وہ نہیں آئے۔ میں کئی روز تک تمہارا انتظار کرتی رہی۔ ہر روز میں سوچتی ——"

"بندوق اُن کے ہاتھ کیسے لگی؟"

یاسمین کا ہاتھ تیزی سے اپنے لبوں تک گیا۔ اُس نے ایک ہلکا سا سانس کھینچا۔ چھوٹی سی "ہائے" کی آواز اُس کے مُنہ سے نکلی۔ "وہ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ سب سے پہلے اندر آتے ہی تھانیدار نے کہا وہ کمروں

میں گھوم پھر کر جائے رہائش کا ملاحظہ کرنا چاہتا ہے۔ جائے رہائش، یہی اس کے لفظ تھے، مجھے یاد ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ میں نے سمجھا سرسری نظر ڈالے گا۔ مگر انہوں نے ایک ایک چیز کو اُلٹ پلٹ کرنا شروع کر دیا۔ تینوں کمروں میں، باورچی خانے میں، غسل خانے میں، صحن میں، ہر جگہ پر پہنچ کر ایک ایک چیز کو اتھل پتھل کیا۔ بندوق تک پہنچے تو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کھول کر اسے جوڑا، کندھے سے لگا کر سیدھی کی، باری باری دونوں نے اسے ہاتھ میں اُٹھا کر نالی کے اندر نظر ڈال کر دیکھا۔ پھر کھول کر ڈبّے میں بند کر دیا۔ پوچھنے لگا کب سے یہاں پڑی ہے، میں نے کہا مجھے علم نہیں، شاید شروع سے یہیں رکھی ہے۔ اسدی، میں نے اُن کے ساتھ ایک ہی جھوٹ بولا ہے، مگر مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ لائسنس کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے کہا مجھے کچھ خبر نہیں۔ ابّا کے بکس میں ڈھونڈا، صندوقچی میں دیکھا پھر باہر جا کر مطب کی الماری میں تلاش کرنے لگے تو ایک مرتبان کے اندر سے ملا۔ کہنے لگا اس کی میعاد مدت ہوئی پوری ہو چکی ہے۔ بندوق بہرحال واپس مال خانے میں جائے گی۔"

"کہیں چھپائی نہیں جا سکتی تھی؟" اسد نے پوچھا۔

"ایک ایک چیز گھر کی تو انہوں نے کھنگال دی تھی۔ اتنی بڑی چیز کو کہاں چھپاتی؟"

"اناج کی بوریاں تو اُٹھا کر نہیں دیکھی ہوں گی۔"

"اُٹھا کے نہیں دیکھیں، مگر آگے پیچھے سب جگہ نظر ڈالی۔ پھر مجھ کو کیا خبر تھی کہ وہ گھر کی تلاشی لیں گے۔" پھر وہ بولی، "اچھا ہوا جو لے گئے۔ مجھے کسی سے کیا خطرہ ہے؟"

"مزارعوں سے کیا جھگڑا ہوا تھا؟"

"کوئی جھگڑا وگڑا نہیں تھا۔ گائے کا دُودھ دو دن میں سات سیر سے چار سیر رہ گیا تھا۔ میں نے جمیلہ سے کہا کہ وہ دُودھ رکھ رہے ہیں، اگر بے ایمانی کریں گے تو میں گائے کسی اور کے حوالے کر دوں گی۔ تھوڑی دیر کے بعد رحیم آیا۔ کہنے لگا: میں نے اُن پر بے ایمانی کا الزام لگایا ہے۔ میں نے کہا اگر تم حرام کا دُودھ پیتے ہو تو بے ایمان ہو۔ الزام کی کیا بات ہے۔ میں نے ڈانٹ کر واپس بھیج دیا۔ اگلے روز شاہ رُخ آیا تو کہنے لگا اُس نے رحیم کو بُلا کر دھمکایا ہے۔ میں نے تو اس سے بھی کہا کہ بیچ میں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں ان لوگوں سے ڈرتی نہیں۔ میرے کوئی ناواقف لوگ تو نہیں۔ ساری عمر سے ان کو جانتی ہوں۔"

"پھر بھی۔" کچھ دیر بعد اسد نے دھندلائی ہوئی آواز میں کہا، "ہتھیار گھر میں رہتا تو اچھا تھا۔"

یاسمین اُس کے کندھے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ "اسدی۔" وہ رُو کر بولی، "چھوڑو اس بات کو۔"

★ ★ ★ ★ ★

"یہ کیا ہے؟" یاسمین چونک کر بولی۔ "ہائے اسدی! یہ دیکھو۔" اُس نے اسد کا سر کھینچ کر روشنی کی جانب موڑا۔

"کیا ہے؟"

"سفید بال۔ یہ دیکھو۔" وہ اُس کا سر پکڑ کر اُسے دکھانے کی کوشش کر رہی تھی، یوں جیسے اس کا سر نہ ہو بلکہ گھٹنا ہو۔ "تمہارے سر میں سفید بال۔" وہ چلائی۔ "ایک، دو۔ تمہارے سر میں کتنے ہی سفید بال ہیں۔ یہ کہاں سے آئے ہیں؟"

"کوئی نہیں ہیں۔" وہ کسمسایا۔

"ہیں۔ ہیں۔ یہ دیکھو۔"

"میں کیسے دیکھ سکتا ہوں؟"

یاسمین اُس کے بالوں کو انگلیوں سے تیز تیز اُلٹتی پلٹتی رہی۔ پھر اُس نے چادر کے نیچے ہاتھ لے جا کر لباس درست کیا اور کود کر بستر سے اُٹھی۔

"دیکھو۔" وہ ہاتھ والا شیشہ لیے اسد کے اوپر جھکی تھی۔ "ہائے اسدی!"

اسد ماتھے پر تیوری ڈالے، ایک ہاتھ میں شیشہ پکڑے، دوسرے کی انگلیاں بالوں میں پھیر پھیر کر اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ اُس کے سر میں جگہ جگہ پر سفید بال نکل آئے تھے۔ تکیے کے اوپر رکھا ہوا اُس کا چہرہ اُسے عجیب سا دکھائی دے رہا تھا۔ تین روز پہلے اُس نے ذوالفقار کے گھر پہ داڑھی مونڈی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے کنارے ذرا ذرا سوجے ہوئے تھے۔ چند منٹ پہلے وہ دونوں اُس رات میں دوسری بار سو کر جاگے تھے۔ اب سورج نکل آیا تھا۔

"شاید پہلے سے ہوں۔" اسد نے کہا۔

"میں نے کبھی نہیں دیکھے۔"

"تم میرے ساتھ کبھی سوئیں بھی تو نہیں۔"

یاسمین کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ "میں نے کبھی نہیں دیکھے۔" وہ بولی۔ "میں تمہارے بال بال کو جانتی ہوں۔"

"شاید ابھی نکلے ہیں۔" وہ ہنسا۔ "کل رات کو ایک بھی نہ تھا۔"

یاسمین فیصلہ نہ کر پائی کہ وہ ہنسے یا روئے۔ اُس نے اسد کے ماتھے پر زخم کے نشان کو چھُوا۔ اسد اُس کا ہاتھ پکڑ کر انگلیوں سے کھیلنے لگا۔ وہ اُس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"میرے بس میں ہو تو اُن کی جان مار دوں۔ بے انصاف۔ ظالم۔" یاسمین نے کہنیوں کے بل جھک کر اپنی آنکھیں اُس کے بالوں میں چھپا دیں۔

بند کمرے کے باہر حسین بی بی کے چلنے پھرنے، کواڑوں کے بجنے اور برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کھڑکی میں، آسمان پر دھوپ کی چمک تھی۔ اسد نے اُس کے بالوں کو گدگدایا۔

"اب باہر کیسے جاؤ گی؟"

"کیوں؟" وہ سر اُٹھا کر بولی۔ "کیوں کیسے جاؤں گی؟"

"حسین بی بی کیا کہے گی؟"

"کیا کہے گی؟" وہ سر جھٹک کر بولی۔

"جاؤ۔ پھر جا کر دکھاؤ۔"

"لو ابھی جاتی ہوں۔" وہ ہلی، جیسے اُٹھ کر جا رہی ہو، مگر اُسی طرح کہنیاں اسد کے بازو پر رکھے جھکی رہی۔ اُس کی آنکھوں کے گرد آنسوؤں کی نمی تھی، مگر ہونٹ متبسم تھے۔

"ابھی جا کر دکھاتی ہوں۔"

"جاؤ۔"

وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی دروازے پر جا کر رُک گئی۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر کُنڈی پہ رکھا اور کان لگا کر باہر کی آواز سننے لگی۔ پھر اُس نے سر کے ایک جھٹکے سے ایک شوخ، متبسم نظر اسد پہ ڈالی اور بھاگتی ہوئی آ کر بستر پہ گر پڑی۔ اُس نے چادر اُٹھا کر اوپر اوڑھ لی اور اُس کے اندر گیند سی بن کر ساکت ہو گئی۔ اسد نے اُسے گدگدانا شروع کر دیا۔ چادر میں لپٹی ہوئی وہ گیند سی چارپائی پر لوٹنے لگی۔

"نہ۔ نہ۔ نہ کرو، اسد۔"

" جاؤ۔ اب جاتی کیوں نہیں۔ جاؤ۔"

" ابھی میرا دل نہیں کر رہا۔ اسد، خدا کے لیے نہ کرو۔"

" ہاں۔ خدا کے واسطے ٹھیک ہے۔ اب نہیں کرتا۔"

کچھ دیر تک وہ بے دم ہو نے ساتھ ساتھ لیٹے رہے۔ دھوپ کی رنگت نیلی ہو گئی ہے، اسد نے سوچا۔ چیڑ کے جنگلوں کی زمین پر دھوپ کی دھاریاں پڑی ہوتی ہیں۔

یاسمین نے سر اس کی طرف موڑا۔

" اسدی، کیا سوچ رہے ہو؟"

" کچھ نہیں۔" اسد نے کہا۔

" کچھ تو سوچ رہے ہو۔"

" میں نے ذوالفقار سے وعدہ کیا ہے کہ دو دن سے زیادہ یہاں نہیں رہوں گا۔"

" اوہ ——" یاسمین اس طرح اچھلی جیسے کسی نے اس کے خنجر گھونپ دیا ہو۔ " وعدہ! تم نے کیوں ایسا وعدہ کیا ہے اس کے ساتھ۔ تمہیں کوئی وعدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم نے کیوں وعدہ کیا ہے؟ اسے کیا حق ہے تمہیں یہاں آنے سے روکے؟"

" اس نے کہاں روکا ہے۔ اس نے تو بلکہ یہاں آنے کی اجازت لے کر دی ہے۔"

" اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ تم سیدھے یہاں آ جاتے۔ دیکھا جاتا پولیس کیا کرتی ہے۔"

" پولیس کے ساتھ جھگڑنے میں کوئی فائدہ نہیں۔" اسد نے کہا۔

" فائدہ! فائدہ کس بات میں ہوتا ہے؟ ایک بار انہوں نے زیادتی کر لی ہے تو یہ مطلب نہیں کہ اب انہیں کھلی چھٹی ہے۔ تمہیں یہاں آنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ کسی قانون سے تمہارے اوپر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ قاتل پکڑا جا چکا ہے۔ تم بے گناہ ہو۔ تمہاری موجودگی یہاں پر ضروری ہے۔ پہلی بار تو مجھے کچھ خبر نہیں ہوئی، گھبراہٹ میں میرا دل بند ہو گیا تھا۔ اب کچھ کر کے دیکھیں۔ مظفر آباد کے سب سے بڑے وکیل کی بیٹی میرے ساتھ سکول میں پڑھتی رہی ہے۔ اس کو یہاں نہ لے کر آؤں تو میرا نام نہیں۔ ایک گھنٹہ بھی تو تمہیں رکھ کر دیکھیں۔"

اسد کی متوازن نظریں اس کے چہرے پر ٹھہری تھیں۔ تمہارا یہی روپ، اسد نے دل میں کہا، سرکشی کا روپ میرے دل کی حرارت کا ضامن ہے۔

" ہم یہاں سے جا بھی تو سکتے ہیں۔" اسد نے کہا۔

جواب میں یاسمین کی نظریں دھندلا سی گئیں۔ " ہاں۔ مگر بھاگ کر نہیں۔ یہ ہمارا گھر ہے۔"

" تمہارا گھر ہے۔"

" تمہارا بھی ہے۔" وہ بولی۔ " اسدی؟"

" ہاں۔"

" تمہارا بھی ہے۔"

" میں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتا۔ کبھی نہ کبھی مجھے یہاں سے جانا ہی ہو گا۔ جتنی جلدی چلا جاؤں اچھا ہے۔ تم میرے ساتھ کیوں نہیں جا سکتیں؟"

" جا سکتی ہوں۔" یاسمین نے ہولے سے کہا۔ " مگر یہ میرا گھر ہے۔"

" گھر کیا ہوتا ہے۔ جہاں پر تم خوش رہو وہی تمہارا گھر ہوتا ہے۔ یہاں پر کیا تم خوش رہو گی؟" یاسمین دیر تک نظریں جمائے چھت کو دیکھتی رہی۔

" پتا نہیں۔" پھر وہ بولی۔ " مگر یہ کیسے علم ہے کہ میں یہاں ناخوش رہوں گی؟"

" نہیں۔"

" اوں ہوں۔" اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔ " مجھے یہ علم ہے کہ تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہوں گی۔"

" پھر۔"

" مگر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ میں خوش رہوں گی؟"

" عجیب منطق ہے۔ اگر میرے بغیر تم ناخوش رہو گی تو میرے ساتھ خوش رہو گی۔ سیدھی بات ہے۔"

" یہ سیدھی بات ہے؟"

" ہاں۔" اسد نے بے یقینی سے کہا۔

" اسدی، یہ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے بغیر میں مر جاؤں گی۔ یہ سیدھی سی بات ہے۔ مگر تمہارے ساتھ میں کس طرح رہوں گی، اس کی مجھے خبر نہیں۔"

" کیوں؟"

یاسمین کھڑکی کے باہر آسمان پہ نظر ڈال کر بولی: " گھنشہ چھوڑ کر تمہارے ساتھ کہیں چلی جاؤں تو خوشی کی

تلاش میں پھرتی رہوں گی، تمہارے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہوں گی۔ تم ہر وقت میرے پاس تو نہیں بیٹھے رہو گے۔ مجھے خوف آتا ہے۔"

"کس سے؟"

"قسمت سے۔ بے گھری سے۔" اس نے کھلی کھلی بے راز آنکھوں سے اسد کی آنکھوں میں دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو، خوشی کی تلاش سے۔ تم سے۔

"ان سولہ دنوں میں تم بھی بدل گئی ہو۔" اسد نے کہا۔

اپنی زمین پہ کھڑی کھڑی کچھ اکھڑ گئی ہو، اس نے سوچا۔ اب تم کیا چاہتی ہو؟ کیا کرو گی؟ اس کے دل میں کسی چیز کے منصف ہو جانے کا درد پیدا ہوا۔ اس کو پہلی بار ——— عجیب طور پہ ——— اس بات کا احساس ہوا کہ یاسمین عمر میں اس سے چند سال بڑی ہے کہ اس کو شاید کچھ ایسی باتوں کا علم بھی ہے جن سے وہ خود ابھی نابلد ہے۔ اس کا جذبہ، اس کی حاجت، جتنی شدید ہے اتنی خود کفیل بھی ہو سکتی ہے۔ اس وقت انجانے طور پر اسد کو حکیم کا خیال آیا۔

اسد کو کھانسی کا ہلکا سا دورہ اٹھا۔ یاسمین اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کر سہلانے لگی۔ اس کی آنکھوں میں رات کے ہلکے ہلکے سایے سرائت کر رہے تھے اور لب متبسم تھے۔ اس کی ٹھوڑی کی پرانی، مانوس اٹھان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی سوچ سے نکل آئی ہے اور اب بے اندازہ سرکشی، معصومیت اور شرارت کی اہل ہے۔ اس کا چہرہ یکسر بدل چکا تھا۔

"تم مجھے کہاں لے کر جاؤ گے؟" اس نے پوچھا۔

"جہاں تم چاہو۔ گاؤں میں چچا کا گھر ہے۔ شہر میں میرا اپنا گھر بھی ہے جو بند پڑا ہے۔ اس میں رہ سکتے ہیں۔ یا اسے بیچ کر کہیں اور جا سکتے ہیں۔"

"تم بیچ دو گے؟"

"ہاں۔ میں اس کا مالک ہوں۔"

"نہیں۔ میرا مطلب ہے تمہارا دل چاہتا ہے اسے بیچنے کو؟"

"کیوں نہیں۔ بیچا جا سکتا ہے۔"

یاسمین حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ "تمہارا دل نہیں کرتا وہاں جا کر رہنے کو؟"

"کوئی خاص نہیں کرتا۔" اسد نے کہا۔ "اگر تم چاہو تو اسے بیچ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔ کسی بڑے

شہر میں۔ مجھے ملازمت مل سکتی ہے۔"

"کہاں پر؟"

"کہیں پر بھی۔"

"تم ملازمت کرنا چاہتے ہو؟"

اسد نے کندھے اچکائے۔

"اسد۔" یاسمین نے پوچھا۔ "تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"کیا مطلب کیا کرنا چاہتا ہوں؟"

"کوئی ایسا کام جو تمہارا جی چاہتا ہے کرنے کو۔"

"ہاں۔" اسد نے سوچ کر جواب دیا۔ "اخبار میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ یا کسی رسالے میں۔ کسی رسالے کے دفتر میں۔"

"تمہیں ایسا کام مل جائے گا؟"

"کوشش کروں تو مل سکتا ہے۔"

اسد کو پھر کھانسی کا دورہ اٹھا۔ وہ کھانستے کھانستے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یاسمین اس کی پشت پہ ہتھیلی مارتے ہوئے کان لگا کر اس کی چھاتی کی آواز سننے لگی۔ کھانسی کے اندر جاری پھنسے ہوئے سانس کی آواز تھی۔ سانس برابر کر کے اسد پھر پشت پر لیٹ گیا۔

"قمیض پہن لو۔" یاسمین نے کہا۔ "سردی لگ جائے گی۔"

اسد نے کندھوں کو ایک اڑیل سی جنبش دی۔

"پہن لو، اسدی۔ ہر بات پہ ضد کرتے ہو۔"

اس نے قمیض یاسمین سے لے کر پہن لی۔

"سانس کیسا رہا تھا؟" یاسمین نے پوچھا۔

"ٹھیک ہی رہا۔ صرف ایک بار دورہ ہوا۔" اسد نے کہا۔ "حالانکہ دوا کی ایک خوراک بھی نہیں کھائی۔"

"اچھا؟" یاسمین مسرت سے بولی۔

"آگے کیا ہوگا، اس کا کچھ پتا نہیں۔"

"آگے بھی ٹھیک رہے گا۔"

"کیسے ؟"

یاسمین ٹھٹھک کر اُسے دیکھنے لگی۔ بات اُس نے خیال کیے بغیر، اپنی مسرت کے ریلے میں کر دی تھی۔

"کیسے ٹھیک رہے گا ؟" اسد نے پوچھا، "دوا ہے ؟"

یاسمین کئی لمحے تک اُسے کھُلی کھُلی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی، "بس پڑیاں نکلی ہیں۔"

"مطلب ہے ؟"

"ہاں۔ مَیں نے ساری الماری چھان ماری ہے۔ گھر میں تلاش کیا ہے۔ صرف بیس ملی ہیں۔"

"تین ہفتے کی خوراک، اسد نے سوچا۔ "تمہیں کچھ پتا ہے اس کے بارے میں ؟" اُس نے پوچھا۔

"بوٹی کا پتہ ہے۔"

"کیا نام ہے ؟"

"نام کا مجھے علم نہیں۔ مگر پہچان ہے۔"

"پہچان !" وہ بولا، "پہچان سے کیا ہوتا ہے۔"

"کاغذ پہ بنا سکتی ہوں، صاف۔" یاسمین نے کہا۔

"اور بھی کچھ پڑتا ہے ؟"

"ایک دو چیزیں اور پڑتی ہیں۔ مگر جہاں تک میرا خیال ہے ویسے ہی ڈال دی جاتی ہیں۔"

"ویسے ہی کیسے ڈال دی جاتی ہیں ؟"

"کچھ بے ضرر سی چیزیں یعنی نمک، سوڈا، مصری، نوشادر وغیرہ ہر ایک دوا میں تھوڑی بہت ملائی جاتی ہیں۔ مگر ابا کی دواؤں میں صرف ایک ہی جُز ہوتا ہے جو اصل چیز ہوتی ہے۔"

"دُوسری چیزیں کیوں ملائی جاتی ہیں ؟"

یاسمین ایک لمحے تک سوچتی رہی۔ "پتا نہیں، اسد۔ مجھے ان باتوں کا پُورا علم نہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ دواؤں پہ پسائی کا اثر پڑتا ہو، کچھ میں نہ پڑتا ہو۔ مگر ایک بُوٹی کا مجھے علم ہے جو اس کا شفائی جُز ہے۔"

"بُوٹی ہے ؟"

یاسمین نے خاموشی سے نفی میں سر ہلایا۔

"نئی کب آئے گی ؟"

یاسمین پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ "خوشی محمد لاتا تھا۔" وہ بولی۔

"کہاں سے ؟"

"سرحد پار سے ؟"

"اِدھر نہیں ہوتی ؟"

"نہیں۔"

"کہاں پہ ہوتی ہے ؟" اُس نے پوچھا، "کیسے منگواتا تھا ؟"

"پتا نہیں۔ شاید خود جایا کرتا تھا۔ اُدھر اُس کا تعلق تھا۔"

"کس سے پتا چلے گا ؟ کوئی اور بھی لا کر دیا کرتا تھا ؟"

"پہلے ایک دو اور لوگ تھے ابا کے جاننے والے وہ بھی لایا کرتے تھے۔ اب ایک عرصے سے یہی تھا۔ اُسے دردکا اچھوتا لگا ؟ جس سے ابا کا کام چلتا تھا۔"

"اب کیا ہو ؟" اسد نے پوچھا۔

یاسمین پھٹی پھٹی نظروں سے اسد کو دیکھ رہی تھی۔ یکلخت اُس نے آنکھوں کو ہاتھ سے ڈھانپ لیا اور اسد کے سینے پر ماتھا رکھ کر رونے لگی۔

★ ★ ★ ★ ★

جب شاہ رُخ آیا تو خوشی محمد کی گرفتاری کا معمہ اسد کے دِل سے اُتر چکا تھا۔ اب مسئلہ دوا کا تھا۔

"خوشی محمد سے تمہاری واقفیت تھی ؟" اُس نے پوچھا۔

"اسی حد تک کہ کچھ دیر اُس نے میرے پاس کام کیا تھا۔"

"سرحد پار سے اُس کا تعلق کس سے تھا ؟"

"سُنا تھا اُس کی رشتہ داری ہے۔ اُس وقت بھی جب میرے پاس کام کرتا تھا جاتا آتا رہتا تھا۔ کیوں ؟"

"میری دوا کی بوٹی اُدھر سے آتی تھی" اسد نے کہا۔

"خوشی محمد لایا کرتا تھا؟"

"ہاں۔ حکیم کی ساری بوٹیاں وغیرہ اب وُہی سپلائی کرتا تھا"

دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔

"اُس سے بات کرنے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟"

شاہ رُخ اُوپر کا ہونٹ دانتوں پر کھینچ کر اپنی چھوٹی چھوٹی سنہری مونچھیں چبانے لگا۔

"مشکل ہے" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"کوئی صورت تو نکالنی پڑے گی" کچھ دیر بعد اسد نے کہا، "اِن دِنوں تو میری قسمت کام کر رہی ہے۔ مگر کب تک"

"یاسمین کو کچھ علم ہے؟"

"صرف پہچان ہے۔ نام سے واقفیت نہیں"

جب یاسمین قہوے کے پیالے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی تو شاہ رُخ نے اُس سے مخاطب ہو کر پُوچھا "کچھ خبر ہے یہ بوٹی کس علاقے سے آتی ہے؟"

"خاص علاقے کا مجھے علم نہیں۔ مگر کہیں قریب ہی اُگتی ہے"

"کیسے؟"

"جب یہاں پہنچتی ہے تو ادھ گیلی سی ہوتی ہے۔ دو چار روز پھیلا کر سکھانی پڑتی ہے"

"وہ تو تین روز بھی سے کر چلتے رہو تو گیلی ہی رہے گی" شاہ رُخ نے کہا۔

"مگر لینے والے بوٹی ہی لینے تو نہیں جاتے" یاسمین بولی "آرام سے آتے جاتے ہیں۔ تمہیں پتا ہی ہے"

شاہ رُخ سوچ میں پڑ گیا۔ یاسمین نے اسد کو دیکھا۔ اسد قہوہ پیتے ہوئے ہلکی ہلکی آواز پیدا کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بے معلوم سا ارتعاش تھا جسے صرف یاسمین نے محسوس کیا۔ تینوں خاموش بیٹھے الائچی دار گرم قہوہ پیتے رہے۔ خوشی محمد، اسد نے سوچا۔ خوشی محمد تک رسائی کیسے ہو؟ یہ بوٹی کہاں اُگتی ہے — — — — — — وہ جگہیں جو آنکھوں نے نہیں دیکھیں!

"اچھا" شاہ رُخ کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کھانا کھا کر جانا" یاسمین نے کہا۔

"نہیں، اب میں چلتا ہوں" شاہ رُخ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا، "کوشش کرتا ہوں، دیکھو شاید کچھ کام بن جائے"

اُس نے اسد سے ہاتھ ملا کر چارپائی کی پائنتی سے اپنی رائفل اُٹھائی اور باہر نکل گیا۔ چھوٹی سی نیچی تپائی پر قہوے کے تین خالی پیالے پڑے تھے۔ سفید چینی کے پیالوں میں لیمپ کی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ باہر اندھیری رات میں۔۔۔ اسد نے سر کو ہلکے ہلکے جھٹکے دیے، جیسے اُس کی آنکھوں کے آگے کوئی جالا آ گیا ہو۔ جب سے وہ واپس آیا تھا اُس کا دماغ رُکے نہیں رُکتا تھا۔ تڑاخ تڑاخ کرتی ہوئی آوازیں، کوئی نہ کوئی بات، آدھے پونے جملے، گڈمڈ مناظر، اُوپر نیچے اپنی بول چال میں مصروف، رواں دواں رہتے تھے۔ جب سے اُسے وقت کے گرفت سے نکل جانے کا احساس ہوا تھا، اُس کا دماغ اپنے کناروں سے باہر آ کر بہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی دُور سے جب پیٹ میں گہرے بھنور ڈالنے لگتے تو وہ ذہن کی اِس مُنہ زوری پر جھنجھلا اُٹھتا۔ مگر اسے روکنا اُس کے بس کا کام نہ تھا۔

"شاہ رُخ کے کئی آدمی اُدھر جاتے ہوں گے۔ کسی نہ کسی سے کام نکل آئے گا" یاسمین نے کہا۔

وقت کا مسئلہ ہے، اُس نے کہنا چاہا، اتنا وقت کہاں سے آئے؟ مگر کہتے کہتے رُک گیا۔ یاسمین کی خودسری ایک بات تھی، گمشدہ میں رُکنا ایک دُوسرا معاملہ تھا۔ معاملہ کیا تھا؟ خود اپنے سوال کے اوپر اُس نے ذہن کو مرکوز کرنا چاہا؟ مگر اس کی سوچ کا تار ٹوٹ رہا تھا۔ پولیس کا خوف؟ اگر صرف اپنی حد تک اسے پولیس کی دست اندازی کا خدشہ ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ پولیس کا وجود اگر ایک مبہم سے بے شکل ہیولے کی مانند اس کے دماغ پہ قائم تھا مگر اس کا ڈر اس کے دل سے اتر چکا تھا۔ مگر یاسمین؟ یاسمین کو وہ اس دہشت کی شکل کیسے دکھائے؟

وقت کی تنگی کا دباؤ ہر جانب سے بڑھتا آ رہا تھا۔ جیسے کوئی چیز چھٹتی جا رہی ہو۔ کوئی کنارا، کوئی حدِ فاصل۔ ذوالفقار نے کہا تھا: "زیادہ سے زیادہ دن بھر کے پھیرے کی اجازت مل رہی تھی۔ میں نے اپنی ذاتی ضمانت پہ تین روز کی مہلت حاصل کی ہے۔ گاؤں میں یا اِدھر اُدھر مطب وغیرہ میں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔ گھر پہ آرام کرنا۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ مجھے لیٹ ڈاؤن مت کرنا" اس کے آخری الفاظ گو درخواست کی صورت تھے مگر لہجہ مختلف تھا۔ ان کا مطلب اسد پہ واضح ہو گیا تھا۔ ذوالفقار کی طاقت سے وہ ناواقف تھا مگر اسے ایک احساس تھا کہ ذوالفقار کا اختیار سمندر میں تیرتے ہوئے برفانی تودے کی مانند ہے جس کا ایک حصہ دکھائی دیتا ہے اور بڑے حصے نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔ یاسمین کو کیسے بتاؤں؟ اس نے سوچا۔

یاسمین خالی پیالے اُٹھاتے اُٹھاتے رُک گئی۔ اس نے پیالے جلدی سے رکھ دیے اور لالٹین اُٹھا کر

کمرے کے اس کونے کی جانب بڑھی جہاں پہ فرش شیشے کی طرح صاف رہتا تھا اور موٹی ململ بچھا کر اوپر مختلف قسم کی بوٹیاں سوکھنے کے واسطے پھیلا دی جاتی تھیں۔ ململ کا ٹکڑا اب وہاں سے اُٹھ چکا تھا مگر فرش اسی طرح بے گرد تھا اور چند ایک ننھے ننھے خشک پتے ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ یاسمین نے پاؤں کے بل بیٹھ کر احتیاط سے سارے پتوں کو ایک ہاتھ سے سمیٹ کر اُٹھا لیا، پھر دیواروں کے ساتھ ساتھ اور کونے میں لالٹین گھما کر فرش پر دو ایک مزید پتے چنے اور ہتھیلی پھیلا کر لالٹین کی روشنی میں ان کا معائنہ کرنے لگی۔

اسد اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ "کچھ ملا؟" اس نے پوچھا۔

یاسمین چہرہ ہاتھ کے قریب لے جا کر، پتوں کو کرید کرید کر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے منہ اوپر اٹھایا اور کچھ بولے بغیر نفی میں سر ہلا کر، اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسد آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے اس کی شکل یاد ہے۔" یاسمین اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولی۔ "اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے۔ آنکھیں بند کر کے اسے ٹریس کر سکتی ہوں۔ اسے حاصل کرنے میں کوئی وقت نہیں ہوگی۔ کئی لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ شاہ رُخ ——"

یہ بات بھی نہیں، اسد نے سوچا۔ بوٹی مل گئی تو پھر؟ پھر کیا ہوگا؟ فقط افاقے کی ایک صورت —— ایک مہلت کچھ طویل ہو جائے گی۔ پھر؟

جس چیز کو وہ عام فہم زندگی سمجھ کر دن گزارنے کا عادی ہو چلا تھا، ان سولہ دنوں نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس نے زندگی کی ایک ایسی شکل دیکھ لی تھی کہ اب اس کی اوپری اوپری صورتیں قابلِ قبول نہیں رہی تھیں۔ ہاں، اس نے دوبارہ سوچا، افاقے کی ایک صورت —— مگر اس کے پیچھے، اس کے عقب میں، اس کا پھیلاؤ ہے، اس کی جڑیں ہیں، جہاں سے وقت کی تنگی پھوٹتی ہے۔ اس روزمرہ کی تنگی کو میں نے اتنی عمر تک سہارا دیے رکھا ہے، اس لیے کہ اس کے پیچھے جو نامعلوم حقیقت تھی اس کی دہشت مجھ پہ سوار رہی ہے۔ اب دہشت کی شکل میں نے دیکھ لی ہے۔

"ہفتے دس دن کی بات ہے۔" یاسمین اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے کہے جا رہی تھی۔ "کوئی نہ کوئی لے آئے گا۔ دیکھیں شاہ رُخ کل کیا خبر لاتا ہے۔ تم کہیں مت جانا، اسد۔ کسی سے پوچھنے پاچھنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں یہاں رہنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ میں اس گاؤں کی اولاد ہوں ——"

"مگر میں کیا ہوں؟" اسد نے اچانک پوچھا۔ "میری یہاں پر کیا حیثیت ہے؟"

یاسمین اس کا منہ تکنے لگی۔ "تم ——" وہ کچھ کہنے لگی، پھر چپ ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ

سُرخ ہو گیا۔

"ایسے کام نہیں بنے گا۔" اسد نے آہستہ سے کہا۔ "کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔"

مگر سوچ کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا۔ وہ رات بھر وقفے وقفے سے جاگتا رہا۔ جب اس کی نیند کھلتی تو بیداری کے ساتھ ہی اسے یہ بات یاد آ جاتی، جیسے اس کے پہرے پر کھڑی ہوئی ہو اور دھک سے اس کا دل خالی ہو جاتا، جیسے کوئی نقصان یاد آ جائے۔ جب اسد کو تین دن کی اجازت ملی تھی تو اسے محسوس ہوا تھا جیسے دُنیا بھر کی آزادی مل گئی ہو۔ اس وقت اپنے دل میں صرف ایک ہی راستہ اسے دکھائی دیتا تھا: گشتہ؛ اس سے آگے گویا سوچ کا وجود ہی نہ تھا، کہ جیسے وہاں پہنچ کر زندگی ختم ہو جائے گی یا پھر شروع ہی سے رواں ہو گی۔ گشتہ آ کر زندگی نہ تو ختم ہوئی نہ شروع مگر اس کی شکل کچھ ایسی بدل گئی کہ پہلی شکل یاد میں بھی نہ آنے لگی، جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ یاسمین کی ہلکی پھلکی تصویر جو اتنے عرصے تک اس کے اندر ایک ایک نقطے کو چھوتی ہوئی پرواز کرتی رہی تھی، جس نے ایک بے نام سے نیم روشن جذبے کی صورت اس کی جان کو مشکل ترین وقت میں سنبھالے رکھا تھا، وہ تصویر اب زندہ ہو گئی تھی۔ اس تصویر نے ایک جسم، ایک جثہ اور ایک جنبش اختیار کر لی تھی۔ اب وہ ایک ہاتھ میں نہ آنے والی شبیہہ نہ رہی تھی بلکہ ایک بدن تھا، اور وہ بدن اس کے بدن میں شامل تھا۔ اب جب کہ دو روز گزر چکے تھے اور وہ یاسمین کے ساتھ لیٹا اس رات کے ایک ایک لمحے پر ہاتھ رکھ رہا تھا تو اس پہ اس آزادی کی حقیقت کھل چکی تھی —— کہ یہ آزادی محض ایک اور مہلت تھی۔ وقت روکے نہیں رُکتا تھا اور اس کا جسم بوٹی بوٹی کر کے سرد ہوتا جا رہا تھا، جیسے جان نکل رہی ہو۔ اسد پہ اب پہلی بار بدن کی حیثیت کا انکشاف ہو رہا تھا۔

صبح سویرے جب وہ اُٹھا تو اس کا دل اسی طرح بے چین تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا اور اب تک اس کے سامنے کوئی راستہ نہ آیا تھا۔ جُوں جُوں دن ڈھلتا جا رہا تھا گشتہ میں رہنے کا خیال اس کے دل کے قریب اور دماغ سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ دوپہر ڈھلتے ڈھلتے گشتہ سے چلے جانے کا امکان اس کے خیال میں جنم لینے لگا۔ یاسمین اُٹھتی بیٹھتی بے صبری سے، بے خیالی سے اور بے جگری سے اس کے وہیں بیٹھے رہنے پر اصرار کرتی رہی۔ مگر بہت آہستہ آہستہ، جیسے جیسے دھوپ سرکتی گئی، اسد کے دل میں یہ احساس پکا ہوتا گیا کہ جلد یا بدیر بالآخر اسے گشتہ کو چھوڑنا پڑے گا۔ شام سے ذرا پہلے شاہ رُخ آ پہنچا۔ اس نے اطلاع دی کہ خوشی محمد کے سرحد پار کے تعلق کا پتا نہیں چل سکا۔ "اس کے بھائی برادری کے لوگ میرے پاس کام کرتے ہیں۔ اس کا چچا زاد میرا گارڈ ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ آج کل ہی خوشی کے گھر جا کر پتا کرے۔ پہلے میرا خیال تھا میں خود جاؤں۔ پھر

سوچا کہ میرا جانا ٹھیک نہیں۔ خاص طور پہ آج کل ——"

"اس کے بیوی بچے ہیں؟" اسد نے پوچھا۔

"ہاں۔ سُنا ہے سو برس سے اوپر اس کے باپ کی عمر ہے۔"

"یہ اس کے بھائی بند وہی ہیں جنہوں نے اس کی مخبری کی تھی؟" اسد نے پوچھا۔

شاہ رُخ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے اس وقت اسد سے اس سوال کی توقع نہ تھی۔ "ہاں۔" اس نے کہا۔

کچھ دیر تک وہ بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب شاہ رُخ رخصت ہونے لگا تو اسد اس کے ساتھ چل پڑا۔ "شاہ رُخ کو چھوڑ کے ابھی آتا ہوں۔" وہ بولا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" یاسمین نے دہل کر پوچھا۔

"یہیں تک۔" اسد نے ہاتھ سے باہر کی جانب اشارہ کیا اور شاہ رُخ کے ہمراہ دروازے سے نکل گیا۔

وہ پہلی بار گھر سے نکلا تھا۔ اس نے ایک سرسری نظر مطلب پہ ڈالی۔ مطلب سنسان پڑا تھا۔ راستے میں انہیں گھر لوٹتے ہوئے چند کسان ملے جنہوں نے شاہ رُخ سے سلام دعا کی۔ ان میں سے صرف ایک نے نظر بھر کر اسد کو دیکھا، باقیوں نے آنکھ بھی نہ ملائی۔ انہیں اسد کے گاؤں میں وارد ہونے کا علم ہو چکا تھا۔ اسد نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلّی دی کہ اس کی ان چاروں سے کوئی خاص واقفیت نہیں تھی، گو وہ جانتا تھا کہ گاؤں میں ہر کسی سے مخاطب ہو کر حال احوال پوچھنا معمول کی بات ہے۔ اسے خیال آیا کہ اس کا کوئی خاص جاننے والا، احمد یا ولی، مطلب کا کوئی پرانا ساتھی (میر حسن؟) سامنے سے آتا ہوا مل گیا تو اس کا ردِّعمل کیا ہوگا؟ دیوار کے ساتھ خاموشی سے کھیلتے ہوئے چند بچے اپنا کھیل روک کر بغور اسے دیکھنے لگے، جیسے وہ کوئی عجوبہ شے ہو، اور اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک کہ وہ ان کے پاس سے گزر نہ گیا۔

"ایک لڑکا ہمارے ساتھ مطلب میں ہوا کرتا تھا،" اسد نے بات کی۔ "میر حسن۔"

"ہاں، تپِ دق کا مریض۔" شاہ رُخ نے کہا۔ "میں جانتا ہوں اسے۔"

"آج کل اِدھر ہی ہے؟" اسد نے سرسری آواز میں پوچھا۔

"خبر نہیں۔ اس کا چچا میرے پاس کام کرتا ہے۔ کیوں، کوئی کام ہے؟"

"نہیں۔ ویسے ہی پوچھا ہے۔"

درختوں کے ذخیرے کے کنارے پہ اسد نے شاہ رُخ کو الوداع کہا۔ جب شاہ رُخ راستے کی ڈھلان

پہ اُتر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اسد نے مڑ کر گاؤں پہ ایک نظر ڈالی۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان سے رات کا سایہ گاؤں کی دیواروں پہ اُترنے لگا تھا۔ گاؤں بھر میں روشنی کی رمق دکھائی نہ دیتی تھی۔ نہ کوئی آواز تھی نہ حرکت۔ ستارے نہایت خاموشی سے ایک ایک کر کے نکلتے آ رہے تھے۔ یہ شام کا وہ یکساں وقت تھا جب فضا کا وجود ایک لمحے کو ٹھہر جاتا ہے اور اس کے عنصر بے عمل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہاں کھڑے، اس سنسان اور ساکت منظر کو دیکھتے ہوئے دفعتہً اسد کے ذہن کا نقشہ بدلنے لگا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ اب اس گاؤں سے چل دیا ہے، جیسے اب واپس جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اپنے دل میں کہیں اسے یہ شک تھا کہ یہ احساس صحیح نہیں ہے، مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے مقابل وہ لامدد ہے۔ یہ احساس ایک ایسی خبر کے مانند تھا جس کی آمد کا وہ ایک عرصے سے متوقع رہا ہو۔ جھٹپٹے کے اس بے عنصر وقت نے یہ خبر جادو کی طرح اس کے وجود میں پھیلا دی۔ اسد کے قدم لوٹ کر جانے کے بجائے وہیں کے وہیں جمے رہے۔ کچھ دیر تک وہ اپنے جسم کے خلا میں لپٹا لپٹایا وہاں پہ کھڑا اس تاریک گاؤں کو دیکھتا رہا۔ اس کا دل مرجھا گیا۔ اس نے ہاتھ اپنی بھاری سویٹر کی جیبوں میں ڈالے اور سر جھکا کر ایک طرف کو چل پڑا۔

وہ اس راستے پہ چل رہا تھا جو گاؤں کی حد کے ساتھ ساتھ اوپر کو جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں باہر باہر چلتا ہوا، وہ گاؤں سے دور نکل گیا۔ یہ راستہ ایک ڈیڑھ کوس تک چڑھائی کا تھا، پھر ڈھلوان پہ جاتا تھا۔ اب اندھیرا ہو چکا تھا اور اس کی سانس پھول گئی تھی۔ پہاڑ کی سرد ہوا اس کے بالوں میں سے گزر رہی تھی۔ وہ ایک موٹی سی کوٹ نما سویٹر پہنے ہوئے تھا جس کے بٹن کھلے تھے۔ اس کا بدن چڑھائی پہ چلنے کی وجہ سے گرم ہو گیا تھا مگر پچھلے چند منٹ سے اس کو سینے میں گرانی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ انگلیوں سے سینے کے بائیں حصّے کو آہستہ آہستہ مَلنے لگا۔ گرانی کم نہ ہوئی۔ ایک جگہ پہ رک کر اس نے اپنے آگے نظر دوڑائی۔ اب وہ اس راستے پہ نکلا تھا جو گاؤں کی عقبی پہاڑی کو کاٹتا ہوا چڑھتا تھا۔ وہ جا کر راستے کے کنارے پڑے ہوئے ایک پتھر پہ بیٹھ گیا۔

وقت اب اس کے حلق میں تھا اور تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر چھوٹی بڑی چیزوں کی جگہ رُکی تھی۔ اندھوں کی طرح دل پہ عود کر آنے والی دہشت، جیسے کوئی پیچھے لگا ہے، کوئی ہاتھ میں اُٹھائے بلند کیے آتا ہے۔ زُخ زُخ۔ جیسے پیٹھ کے پیچھے اور نظر کے باہر وحشت کا پڑاؤ ہے۔ وہ انگلیوں کے پوروں سے ہولے ہولے اپنے حلق کے درمیان کو کھودتا رہا، جیسے سانس کی جڑوں تک پہنچنا چاہتا ہو۔ ستارے اب پوری چمک سے نکل آئے تھے۔ ایک لڑکا گدھے پہ لکڑیاں اور پانی کا ایک مٹکا لادے سائے کی مانند راستے سے گزر گیا۔ یہ لڑکا کہاں جا رہا ہے؟ اسد نے حیرت سے سوچا۔ رات کے اندھیرے میں راستہ چلتے ہوئے لوگ بے گھر سے کیوں لگتے ہیں؟ رات سرد ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان پر اب بادلوں کے

اِکّا دُکّا ٹکڑے نمودار ہو کر ستاروں کو ڈھکنے لگے تھے۔ دیر تک وہ وہاں بیٹھا چاروں طرف سے اندھیرے کی یلغار کو دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ، اس کے اندر کی آگ دھیمی پڑنے لگی۔

آخر اس تاریک چٹان پر، سڑک کے کنارے بیٹھے بیٹھے، دفعتاً اسد پر اپنی صورتِ حال کی حقیقت کھلی۔ اس وقت گویا رات کا ایک لمحہ ہیرے کی مانند منجمد ہو کر چمک اٹھا، اور اس لمحے کی چکا چوند میں اسد نے دیکھا کہ یاسمین اس کے ساتھ لگ کر کھڑی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کہہ رہی ہے: "تم کہیں مت جانا، اسد! کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" یاسمین کی آنکھوں میں سرکشی اور معصومیت تھی۔ یہ ایسی آنکھیں تھیں جنہوں نے وحشت کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت اسد کو علم ہوا کہ اور کہیں کچھ بھی نہیں ہے، نہ وقت ہے، نہ وقت کی یلغار، نہ ہی بیماری ہے اور نہ کوئی دوا۔ دُنیا میں بس یاسمین کا چہرہ ہے، اور کسی شے کی حقیقت نہیں۔ سب چھوٹی بڑی باتوں کے لشکر اس ایک بات سے پھوٹتے ہیں۔ وہ لشکر اب غائب ہو چکے تھے۔ اب اس کے دل پر صرف ایک خوف کا سایہ تھا، کہ ایک بار، اگر وہ یہاں سے اس طرح بے نام چلا گیا تو پھر کبھی یاسمین کو نہ دیکھ پائے گا —— اس خیال سے کہ وہ یاسمین سے جدا کر دیا جائے گا اس کے بدن کی طاقت زائل ہونے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی ہڈیاں پانی ہو رہی ہیں۔ سردی اس کے پاؤں کو چڑھنے لگی۔ ہمت کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سویٹر کے گول گول سیاہ بٹن بند کیے اور ہاتھ بغلوں میں دے کر پلٹا۔ اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا —— ذوالفقار کا گھر۔

واپسی پر اسے گنبد سے ہو کر گزرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ راستہ گاؤں سے چار سو گز کے فاصلے پر گزرتا ہوا سیدھا نیچے کو جاتا تھا۔ اسد کے سر میں اڑان تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زمین اس کے قدموں کے استقبال کے واسطے اٹھ اٹھ کر آ رہی ہے۔ اسد کو وقت کا احساس نہ ہوا، گو اسے چلتے چلتے گھنٹہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ ذوالفقار رات کے اس وقت اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

کچھ دیر بعد اسد اسی بستر پر، جہاں اس نے استراحت کے چند روز گزارے تھے، بیٹھا تھا۔ ذوالفقار نے اس کی آمد سے ذرا ہی پہلے کھانا کھایا تھا۔ اس نے اسد سے کھانے کو پوچھا۔ اسد کو بھوک لگ رہی تھی۔ چند منٹ میں ذوالفقار کا ملازم اس کے لیے روٹی اور شوربہ لے آیا۔ جب اسد نے کھانا شروع کیا تو ذوالفقار نے سگریٹ سلگائی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گو اسد وعدے کے مطابق گنبد سے پلٹ آیا تھا مگر ذوالفقار کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسد کو دیکھ کر اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی، جیسے کہ وہ اسد کو اب اپنے ہاں دیکھنا نہ چاہتا ہو۔ وہ کرسی پہ بیٹھا مسلسل اسد کو کھانا کھاتے، نوالہ چباتے، نگلتے اور دوسرا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں عدمِ اعتماد کا تاثر تھا۔

"واپس جا رہے ہو؟" کچھ دیر بعد ذوالفقار نے پوچھا۔

اسد نے احتیاط سے اپنے منہ کا نوالہ چبا چبا کر نگلا۔ پھر اس نے پانی کے ایک گھونٹ سے حلق صاف کیا اور بولا: "ایک بات کرنے آیا ہوں۔" ذوالفقار نے مختصراً "ہوں" کی آواز نکالی جیسے کہہ رہا ہو: "کہو۔ میں سُن رہا ہوں۔"

اسد آہستہ آہستہ اگلا نوالہ چبانے لگا، جیسے بات کو تلاش کر رہا ہو۔ آخر نوالہ ختم کر کے وہ بولا: "آپ نے مجھ سے ایک بات کی تھی۔" ذوالفقار خاموشی سے اس کی طرف متوجہ رہا۔

"اگر میں،" اسد نے جھجکتے ہوئے بات شروع کی، "آپ کی پیش کش قبول کر لوں —— تو گنبد میں رہ سکتا ہوں؟"

"وہاں کیا کرو گے؟"

"یاسین کے کام،" اسد نے جواب دیا۔ "ختم ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔"

ذوالفقار نے اس طرح اسد کو دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو: "کون سے کام؟" اسد خاموش رہا۔

"میری پیش کش قبول کر کے تم گنبد میں کیسے رہ سکتے ہو؟" ذوالفقار نے پوچھا۔

اسد نے نوالہ چباتے چباتے نفی میں سر ہلایا: "ابھی نہیں،" وہ بولا، "واپس آ کر۔"

ذوالفقار چند لمحوں تک سوچ بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا، جیسے اسد کی بات کو ذہن نشین کر رہا ہو۔ "میں کسی قسم کا وعدہ نہیں کر سکتا۔" پھر وہ بولا، "پولیس کی کارروائی میں براہِ راست مداخلت کرنا ہماری پالیسی نہیں۔ میں نے تم سے بات خلوصِ نیت سے کی تھی۔ اتنا بتا سکتا ہوں کہ اگر تم رضا مند ہو جاؤ تو اس میں تمہارا فائدہ ہی ہوگا۔ میں صرف یہی وعدہ کر سکتا ہوں کہ حتی المقدور تمہاری مدد کروں گا۔"

اسد آہستہ آہستہ روٹی کے نوالے شوربے میں ڈبو ڈبو کر کھاتا رہا۔ "واپسی کب تک ہوگی؟" اس نے پوچھا۔

"چار چھ ہفتے تو ٹریننگ میں لگیں گے۔ پھر سیدھے اس طرف! آگے تمہارے کام پر منحصر ہے۔"

"ایک دو مہینے میں واپس آ سکتا ہوں؟"

ذوالفقار جیسے اس کی سادگی پر ہنس رہا ہو۔ "اس کام کا کوئی شیڈول نہیں۔ ٹریننگ کے دوران تمہیں پتا چل جائے گا۔ بہت ساری چیزوں کا انحصار حالات کے اوپر ہے۔ ہو سکتا ہے حالات ایسا رُخ اختیار کریں کہ چند دن کے اندر تمہیں بلا لیا جائے۔ ہو سکتا ہے دو تین چار مہینے لگ جائیں۔ مگر ایک بات میں تمہیں کھول کر بتا دینا چاہتا ہوں۔ یہ کام گنبد کے پردے کے طور پر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر میرا ارادہ تمہیں گردن سے پکڑ کر

ان لیسٹ کرنے کا ہوتا تو اتنی لمبی چوڑی بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ پہلے ہی ہمارے پاس ڈبل ایجنٹ کیا کم ہیں؟ یہ سب ٹوکل جرم زادے دونوں طرف سے کھاتے ہیں۔ ان کی کسی بات کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اصل انفارمیشن ڈھونڈتے ڈھونڈتے اتنا وقت لگ جاتا ہے کہ وہ انفارمیشن ہی بیکار ہو چکی ہوتی ہے۔ کراس چیک کرنے کے ذرائع بہت کم ہیں۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان کو بس اپنے مال سے غرض ہے۔ ان حالات میں ایمان اور یقین سے کام کرنے والا ایک آدمی بھی ہمارے لیے نعمت سے کم نہیں۔" وہ رُکا۔ "مگر ان سب باتوں کے باوجود اس کام کا ایک مقصد ہے۔ جب تک وہ مقصد حاصل نہیں ہو جاتا ہمارا کام جاری رہے گا۔ تم جب آنا چاہو، پیغام بھیج دو۔ تمہاری واپسی کا بندوبست ہو جائے گا۔ پھر موقع پڑے، پھر چلے جاؤ۔ پنجاب کا چکر لگانا چاہو تو جا کر لگا آؤ۔ کسی پوائنٹ پر پہنچ کر فرض کیا کہ فارغ ہونا چاہتے ہو تو اس کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی اس کام میں ہر آدمی کا ایکسم پوڈ ریٹائرمنٹ پوائنٹ ہوتا ہے۔ ایسی کوئی پرابلم نہیں۔ مگر ایک بات میں تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں، کہ یہ بیک ڈسٹ ہے، کوئی سروس وغیرہ نہیں۔ اس میں رضامندی اور کومٹ منٹ اشد ضروری ہے۔ تم جو کوئی قدم اٹھاؤ سوچ سمجھ کر اٹھاؤ، کسی دباؤ یا لالچ میں آ کر مت اٹھاؤ۔"

ذوالفقار کی بات سنتے سنتے اچانک اسد کے دل کے گرد دبی پڑا، ماؤس حلقہ تنگ ہونے لگا۔ قدم یہ لفظ اس کے دماغ میں گونج رہا تھا۔ قدم، جیسے ذوالفقار کی اور سب باتیں بیکار ہوں، صرف یہ ایک بات اس کے منہ سے حکماً خارج ہوئی ہو: "قدم اٹھاؤ۔"

پہلی بار اسد کو اس بات کا احساس ہوا کہ ہمیشہ ہمیشہ سے وہ حالات کی یلغار کے آگے ادھر سے اُدھر لُڑھکتا بھاگتا رہا ہے، کہ اپنے ارادے سے، اپنے عہد سے اس نے آج تک کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا، حالات کے اس دھارے کو روکنے کی، اس کا رُخ موڑنے کی سعی نہیں کی، کہ جس وقت، جس طور اور جس طرف بھی اس کی زندگی کے حالات نے رُخ کیا ہے، اس نے اسی رُخ پہ اپنا منہ موڑ لیا ہے اور بے اختیار و جنبش اس طرف کو چل دیا ہے۔ اس نے زندگی سے، اسد نے سوچا، کبھی مہلت حاصل نہیں کی، ہمیشہ وصول کی ہے۔ ایک سے دوسری، دوسری سے تیسری۔ مہلت، مہلت، مہلت۔ اس نے محسوس کیا کہ عمر بھر سے اس کے دل کے اوپر بے عملی کے اس بار کا پھندا چھپتا جا رہا ہے۔ اس کے سینے کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ اب یہ خیال اس کے اندر جنم لے رہا تھا کہ وہ جب چاہے اس حلقے کو توڑ سکتا ہے ——— ہاتھ کی ایک جھٹک سے اس دھارے کی روک کر سکتا ہے۔ کہ یہ اب اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا دل ہلکا ہونے لگا۔

اسد نے دستر خوان سے انگلیاں پونچھیں اور خاموشی سے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔ گلاس خالی

کر کے اس نے دستر خوان سے ہونٹ خشک کیے۔ پھر اس نے سر اٹھا کر ذوالفقار کی طرف دیکھا۔ ذوالفقار نے ایک تازہ سگریٹ نکال کر پہلے سگریٹ کے ٹکڑے سے سلگایا اور ٹکڑے کو ٹین کی ایش ٹرے میں مسل کر بجھا دیا۔ پھر وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور اندر سگریٹ کا دھواں پھیل رہا تھا۔ اس وقت ذوالفقار کو اپنے سامنے کرسی پہ بیٹھے، اطمینان سے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے دیکھ کر اسد کے دل میں شکر اور خلوص کے جذبات امڈ آئے۔ اسے یقین تھا کہ اس کی رہائی ذوالفقار کی کوششوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ کیوں، مگر اس کو پورا اعتماد تھا کہ ذوالفقار اس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ آخر اسد نے سیدھی نظروں سے ذوالفقار کی آنکھوں میں دیکھ کر، منہ سے کچھ کہے بغیر، گرگہرے عزم کے ساتھ، دوبارہ آہستہ آہستہ اثبات میں سر کو ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔

کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ذوالفقار کی آنکھوں میں ابھی تک ہلکی سی بے یقینی کا عنصر تھا۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر وہ آگے جھکا اور میز پر کہنیاں رکھ کر بولا:

"ایک بات بتاؤ۔ تم صرف حکیم کی لڑکی کے پاس رہنے کی خاطر کام کرنے پر رضامند ہوئے ہو؟"

ایک لمحے کو اسد کے خیال میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ پھر اس نے اپنے کندھوں کو خفیف سی حرکت دی۔ "میری دوا کی بوٹی اُدھر سے آتی ہے۔" وہ بولا۔

"صرف دوا کی خاطر ادھر جا رہے ہو؟"

اسد نے دوبارہ لاعلمی کے انداز میں کندھے اچکائے۔ ذوالفقار چند لمحوں تک گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر بولا: "تم خدا اور رسولؐ پر یقین رکھتے ہو؟"

اسد نے "ہاں" کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بند کر لیا۔ وہ ان سوالوں کو ایسی سہل پسندی سے حل کرنے کا خواہاں نہ تھا۔

"ایک بار پہلے بھی آپ نے پوچھا تھا۔" اس نے کہا۔

"ہاں دوبارہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ خدا اور اس کا رسولؐ انسانوں کو انصاف اور آزادی کا حق عطا کرتے ہیں۔"

"خدا اور رسولؐ پر تو وہ لوگ بھی یقین رکھتے ہیں جن کا ذکر ابھی آپ نے کیا ہے۔"

"ہاں۔ مگر ان کی اور تمہاری سطح میں بہت فرق ہے۔ تمہارے دل میں انصاف اور آزادی کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ ایک فطری عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ صرف یہ جذبہ رکھنے والے لوگ ہی نوعِ انسانی کی صحیح معنوں میں خدمت

کر سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے، اس کے بعد اپنا مفاد بھی کسی حد تک مدِنظر رہتا ہے۔ اس کا حق بھی۔" وہ دوسرا سگریٹ زمین پر پھینک کر اسے پاؤں سے مسلتے ہوئے بولا۔ "خدا نے ہمیں دیا ہے۔"

اسد نے دوبارہ کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا مگر پھر بند کر لیا۔ آخر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اچانک اسد کی آنکھوں میں اشتیاق کی چمک پیدا ہوئی، جیسے کسی خیال نے اسے جگا دیا ہو۔ اس نے کہنیاں اپنے گھٹنوں پہ رکھیں اور آگے جھک کر بیٹھ گیا۔

—"آپ کو،" اس نے پُوچھا، "میری بے گناہی کا یقین ہے؟"

ذوالفقار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، جیسے اس سے کوئی غیر مناسب سوال پوچھ لیا گیا ہو۔

"قصور اور بے قصوری کا معاملہ خدا کی ملکیت میں ہے۔" پھر وہ بولا، "ایسے ہی جیسے سزا اور جزا کا اختیار اس کے پاس ہے۔ پھر ان باتوں پر سوال اُٹھانے کا کیا فائدہ؟ ہمارا معاملہ اپنے قانون سے ہے۔ قانون کی نظر میں تم بے گناہ ہو تو بے گناہ ہو۔ اس سے آگے ہم نہیں جان سکتے نہ اس سے آگے جاننے کا ہمیں کوئی حق ہے چنانچہ اس سوال پر مزید سوچ کا صرف بے سُود ہے۔"

— اسد کی نظروں کے سامنے شک و شبہ کے مجرت نے اپنا بڑا سا سیاہ کُھنک سر اُٹھانا شروع کیا اور اس کے دل میں ایک قدیم، سلگتی ہوئی، بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ مگر یہ باتیں اب اس کے رستے میں حائل نہ ہو سکتی تھیں: اب وہ ایک نشے کی بے خیالی میں تھا۔ وُہ ایک قلانچ بھر کر ان چھوٹی بڑی الجھنوں کے حلقے سے نکل گیا تھا۔ اس وقت جس کام کا ذمّہ اس نے لیا تھا وہ کام بھی اس کے خیال میں نہ تھا۔ اِس وقت اس کی نظروں کے سامنے مستقبل کا ایک منظر تھا— گنبد کے اندر وہ یاسمین کے پاس بیٹھا ہے، لیٹا ہے، چل پھر رہا ہے، اور ہر کام سے فارغ ہے۔

★ ★ ★ ★ ★

سب سے مشکل کام جو اسے درپیش تھا یاسمین سے نبٹنے کا تھا۔ "آدھی رات تک تم غائب ہو گئے کچھ بتائے بغیر، کوئی بات کیے بغیر۔ میں یہاں رو رو کر بے حال ہو گئی۔ تمہیں میرا کچھ خیال نہیں؟" وہ بولا

اسد سے استفسار کرتی، "ذوالفقار کے پاس تم کیا کرنے گئے تھے؟ مجھے تو اس کی شکل سے نفرت ہے۔ آدھی رات کے وقت کیا کرنے گئے تھے؟ بتاتے کیوں نہیں؟"

دو دن تک وُہ اُسے ٹالتا رہا۔ حیلے بہانے سے خوش مذاقی سے، سُنی اَن سُنی کر کر کے —— اس کو دو روز کی مُہلت مل گئی، مگر وقت اب اُس کے قابو میں تھا۔ اِس مشکل نوبت کے زیرِ زیر اسد کو احساس تھا کہ وہ جو چاہے اپنے ساتھ، یاسمین کے ساتھ، اپنے مشترکہ حالات کے ساتھ کر سکتا ہے، کہ اب یہ اُس کے اختیار میں ہے۔ واقعات کی رَو کو اس نے پنجے میں جکڑ لیا تھا۔

اپنی مشکل کا احساس اُسے اُس وقت ہُوا تھا جب اُس رات کو گھر لَوٹ کر اُس نے دفعتہً دروازے پر نظر ڈالی تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا اور اُس منظر کے سبب بے نظر صورت گاؤں میں صرف ایک ڈرا دینے کی صورت واقعہ تھا، اور اُس کے درمیان یاسمین کا اُڑے اُڑے بالوں والا پاگل چہرہ معلق تھا، جیسے جسم سے کٹ چکا ہو۔ وہ بتی نیچی کیے، لالٹین ہاتھ میں لٹکائے دروازے کے اندر، ہلکی سی شاخ کی مانند، سنبھل کر کھڑی تھی۔ اُس کا اُوپر کا دھڑ نسبتاً اندھیرے میں تھا، اور اُس اندھیرے میں اُس کا چہرہ دُھلتا ہُوا دکھائی دے رہا تھا۔ اسد نے قریب آ کر دیکھا کہ وہ بے حرکت کھڑی تھی اور اُس کی آنکھوں میں طویل جُدائی کی خشکی اور سوزش تھی۔

دو روز تک وہ غصّے سے، اصرار سے، غم سے اور جوش سے جواب طلب کرتی رہی اور دو روز تک اسد اپنے درد کے کونوں اور کناروں پر ہاتھ رکھ رکھ کر انہیں گولائیوں میں ڈھالتا، اُن کی کاٹ کو گھٹانے کی سعی کرتا رہا۔ اب ایک بات بیچ میں تھی اور یاسمین کے دردسے معاملہ طے کرنا ابھی باقی تھا۔ اِس کی ہمّت وہ اپنے میں نہ پا رہا تھا۔

اُس نے دبے لفظوں میں، سرسری لہجے میں یاسمین کو اپنے فیصلے کے بارے میں بتانا چاہا۔ یاسمین کی آواز وحشت سے گُونج اُٹھی:

"کہاں، کب، کس جگہ؟ کتنی دیر کے لیے جا رہے ہو۔ ذوالفقار کے ساتھ جا رہے ہو؟"

"ذوالفقار کے ساتھ نہیں جا رہا۔" اسد نے کہا۔ "اُس نے انتظام کیا ہے۔"

"کیسا انتظام کیا ہے؟ ذوالفقار کی شکل سے مجھے نفرت ہے۔ اُس کی نیولے کی طرح آنکھیں ہیں۔ دیکھتے ہی مجھے خوف آنے لگا تھا۔ مجھے علم تھا یہ کوئی شر پیدا کرے گا۔ وہ تمہارے جانے کا انتظام کر سکتا ہے، بُرائی سنگوانے کا انتظام نہیں کر سکتا؟ تمہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مَیں نے خود اُس سے کہا ہے۔ مَیں خود دیکھ بھال کر——"

"دیکھنے بھالنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ کیا چیز ہے، مَیں نے برسوں تک استعمال کی ہے۔

اُس آدمی سے جاکر تم نے کیوں پوچھا ہے ؟ میں تمہیں منگوا دوں گی ۔"

" خوشی محمد جیل میں ہے ۔ تم کیسے منگوا دو گی ؟"

" جیسے بھی منگواؤں ، تمہیں اِس سے کیا غرض ۔ تمہیں دوا سے غرض ہے ۔ دوا تمہیں مل جائے گی ۔"

اسد خاموش ہو رہا ۔

" تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو ، اسد ۔ کیا بات ہے ؟ ٹھیک ٹھیک کیوں نہیں بتاتے ۔ کہاں جا رہے ہو ؟"

— " میں سرحد پار جا رہا ہوں ۔" اسد نے صبر سے کہا ۔ " صرف ایک مہینے کے لیے ۔ کوئی زیادہ عرصے کے لیے نہیں ۔ ایک ماہ کے لیے واپس آجاؤں گا ۔"

" ذوالفقار نے کیسے انتظام کیا ہے ؟ پولیس کے ذریعے ؟"

" پولیس سے ذوالفقار کا کوئی تعلق نہیں ۔"

" پھر کس سے ہے ؟"

" شاید فوج سے ہے ۔"

یاسمین نے دہل کر پوچھا : " فوج میں بھرتی ہو کر جا رہے ہو ؟"

اسد ہنسا : " فوج میں تو بھرتی نہیں ہو سکتا ۔ سانس ٹھیک نہیں ۔"

" پھر ؟ پھر کیسے جا رہے ہو ؟"

" پرائیویٹ طور سے جا رہا ہوں ۔ آزادی سے ۔ جب چاہوں واپس آسکتا ہوں ۔ کوئی بندش نہیں ۔ ذوالفقار کی اِس معاملے میں پہنچ ہے ۔ میں نے خود اُس سے کہا ہے ۔" اسد

" تم نے خود ؟" یاسمین نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا : " ایسے ہی بیٹھے بیٹھے ؟ مجھ سے بات کیے بغیر اٹھ کر ایک دُوسرے ملک کو جا رہے ہو ؟ واہ ۔"

" کوئی دُوسرا ملک تو نہیں ۔"

" اور کیا ہے ۔ دُوسری حکومت تو ہے ۔"

" حکومت سے کیا ہوتا ہے ؟"

" ذرا جا کر دکھاؤ ۔ پتا چل جائے گا حکومت سے کیا ہوتا ہے ۔"

" تمہارے سب لوگ اِدھر سے اُدھر آتے جاتے رہتے ہیں ۔ کیا فرق پڑتا ہے ۔"

" ہمیں نہیں پڑتا ۔ ہماری بولی ، بات چیت ، رشتے داریاں سب ایک ہیں ۔ تمہیں پڑتا ہے ۔"

" میرے لیے تو پھر یہ بھی غیر ملک ہے ۔"

" تم اِدھر سے بچ گئے تو اُدھر پکڑے جاؤ گے ۔ اُدھر سے بچ گئے تو اِدھر والے — — "

" اِدھر نہیں پکڑا جاؤں گا ۔"

یاسمین نے جیسے اُس کی بات سننا چھوڑ دی تھی ۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی ۔ اُس کی پشت پر رونگٹے کھڑے تھے ، اور اُس کے کندھوں میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی ۔

" میرا دل ڈوب رہا ہے ۔" وہ لرزتی ہوئی کمزور آواز میں بولی ۔

اسد نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کھینچا ۔ وہ اپنی جگہ پہ بیٹھی رہی ۔ " تمہارے پکڑے جانے کا خیال کر کے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے ۔"

اسد نے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھ کر اُسے لٹا دیا ۔ " پاگلوں کی سی باتیں مت کرو ۔ میں کوئی پکڑا وکڑا نہیں جاؤں گا ۔ تم لوگوں کی طرح دکھائی دیتا ہوں ، بول لیتا ہوں ، کوئی پہچان نہیں سکتا ۔ پھر ذوالفقار کے جاننے والے اُدھر ہیں ۔ میں اُن کی حفاظت میں رہوں گا ۔ کسی خطرے کا امکان نہیں ۔ تھوڑے سے وقت کی بات ہے ۔ تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو ۔"

" خواہ مخواہ ! تم جا کیوں رہے ہو مجھے چھوڑ کر ؟ کیا ضرورت ہے ؟"

اسد کے جواب دینے سے پہلے وہ پھر بولی : " ذوالفقار کا کیا مطلب ہے اِس میں ؟"

" ضروری ہے کہ اُس کا مطلب ہو ؟"

" ہاں ۔ ایسی شکل والا آدمی اپنے مطلب کا آدمی ہوتا ہے ۔"

" معمولی سا کام میرے ذمے اُس نے لگایا ہے ۔"

" کیسا کام ؟"

" کچھ خبر رسانی وغیرہ کا کام ۔"

" خبر رسانی ؟ یعنی جاسوسی کا کام ؟ جاسوس بن کر جا رہے ہو ؟"

" جاسوسی تو بہت لمبا چوڑا کام ہے ۔ چونکہ میں جا ہی رہا ہوں اُس نے کہا ہے کہ اپنا کام ختم کر کے جب واپس آؤں تو اُسے وہاں کے عام حالات سے باخبر کر دوں ۔ رائے عامہ وغیرہ وغیرہ ۔ وہ بھی کوئی پابندی نہیں ۔ جب چاہوں واپس آسکتا ہوں ۔ کوئی روک ٹوک نہیں ۔ تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو ۔"

یاسمین نے کسما کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر اسد کے ہاتھوں کے دباؤ تلے لیٹی رہی۔ اسد کا ایک ہاتھ اُس کے پیٹ پہ رکھا سانس کی حرکت کے ساتھ لرز رہا تھا۔ یاسمین کی جلد سے آگ نکل رہی تھی۔ اس کے درد کے کنارے، اسد نے سوچا میرے ہاتھوں سے باہر ہیں۔

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔" یاسمین کا لہجہ دفعتاً دھیما پڑ گیا، جیسے اسد کی بات کو بکھیرنے کی بجائے سمیٹنا چاہ رہی ہو۔

"کیوں؟ سیدھی سی بات ہے۔"

"تمہاری کوئی بات،" وہ بولی، "میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

اسد خاموش لیٹا، ہاتھ یاسمین کے پیٹ کے تلاطم پہ رکھے، آخر اس کے سوال کی تہہ کو پہنچ گیا۔

"اِسی لیے جا رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"کیوں؟" یاسمین نے ہولے سے پوچھا۔

"کہ تمہارے پاس رہ سکوں۔ تمہارے ساتھ بات کر سکوں۔"

"جانے سے کیا ہوگا؟"

"تمہارے پاس رہنے کی آزادی مل جائے گی۔"

"اسدی!" وہ بپھر کر اُٹھی۔ "تم آزاد ہو۔ تم اب ——"

مگر اسد نے ہاتھ اُٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔ "میری زندگی،" وہ بولا، "ایک طویل قید بنتی جا رہی ہے۔ کوئی قدم اُٹھاؤں تو آزادی حاصل ہو۔ پھر تمہیں بھی میری بات کی کوئی سمجھ آئے ——"

"اگر چھوڑ کر جانے سے ہی آزادی ملتی ہے تو ایسی آزادی کا کیا فائدہ؟ کوئی بات اتنی اہم نہیں کہ اس کے لیے تم مجھے چھوڑ کر ہی چلے جاؤ۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نے سرایت کر آئی تھی مگر اس کی آنکھیں صحراؤں کی طرح پھیلی ہوئی اور خشک تھیں۔

"ایک بار تو جانا ہی پڑے گا۔" اسد نے کہا۔

"کیوں؟"

"اس کے بغیر چارہ نہیں۔" وہ بولا۔ "میرے اپنے لیے بھی یہ بات اہم ہے۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے جانے سے میری کچھ ہی چلی جائے گی؟ پھر بھی تمہارے لیے یہ بات اہم ہے ——؟" اس نے بات ختم کر دی۔

"ہاں۔" کچھ دیر کے بعد اسد نے جواب دیا۔

"پھر تم عورتوں کو کہاں جانتے ہو۔" یاسمین بولی، "مردوں والی بات کرتے ہو۔"

"کیسے؟"

"اپنی اہمیتوں کو اصل جان کر سمجھتے ہو کہ میرے کام بھی سیدھے ہو جائیں گے مگر اپنی بات کو میری بات سے کبھی نہیں ملاتے۔ اپنی سوچ سوچتے ہو اور مجھے دلاسا دیتے ہو۔ یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہیں پتا ہے کہ تمہارے بعد میرا دل فنا ہو جاتا ہے؟ جب تم پولیس کی قید میں تھے تو میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں، چمگادڑوں کی طرح۔ میں رات بھر آنکھیں کھولے دیکھتی رہتی تھی اور میرے دل میں کوئی خیال بھی نہ آیا تھا۔ میں کوشش کرتی تھی کہ مجھے اپنے بچپن کی کوئی بات یاد آئے، پتا چلے کہ میں زندہ ہوں۔ مگر ایک بات بھی یاد نہ آتی تھی۔ میرا حافظہ ٹھہر گیا تھا۔ ایسی حیران کر دینے والی بات تمہاری سمجھ میں کیسے آئے گی —— میرا پیٹ۔" اُس نے ایک خشک سسکی بھری، "سوکھ گیا تھا۔"

اسد نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا چہرہ تھاما، جیسے کانچ کے گلدان کو اُٹھا رہا ہو، اور آہستہ سے اپنے سینے پر رکھ لیا۔ ایک کھیت میں ایک جھاڑی ہے، اُس جھاڑی پہ ایک سُرخ پھول ہے، اسد کے ذہن سے گزرا، اور ہوا زور سے چل رہی ہے۔ وہ دیر تک ایک گال اسد کے سینے پہ رکھے اپنی بے جھپک آنکھوں سے دیوار کے اندھیرے کو دیکھتی رہی۔ اُس کا طوفان آہستہ آہستہ سرد پڑتا گیا۔ اُس کی دھیمی ہوتی ہوئی سانس کی رفتار سے اسد کو اُس کی ٹوٹ پھوٹ اور پھر اُس کی قوت کا اندازہ ہُوا۔ رات کی ہوا کھڑکی کے راستے کمرے میں آ رہی تھی۔ اسد نے چادر سے اپنے آپ کو اور یاسمین کو ڈھانپ لیا۔ چادر کے اندر بھی یاسمین کی آنکھیں کھلی رہیں۔ اُس چہرے کو ہاتھوں میں لیے اُس بے آواز رات میں اسد کو ایک ایسے درد کا احساس ہوا جس سے اُس کا دل آشنا نہ تھا۔ حیرت سے اُس نے سوچا کہ وہ اِس درد سے آشنا ہونے کا خواہاں بھی نہ تھا کیونکہ اسی لمحے اُس کو ایک عجیب سی سرخوشی اور توانائی کا احساس بھی تھا۔ دل کے اِس درجہ متضاد رنگوں نے اُس کے فہم کو پچھاڑ کے رکھ دیا تھا۔ وہ وقت کو مٹھی میں لیے، پھر اپنے آپ کو اسی وقت کے حوالے کیے، چت پڑا چھت کو دیکھتا رہا۔ اندھیرا گئی رس پہ محیط تھا۔

دیر کے بعد یاسمین نے سر ذرا سا اُٹھایا۔ "تم بیس سال کے ہو گئے ہو۔" اُس نے کہا۔

اسد نے چونک کر یاد کیا کہ کل اُس کی بیسویں سالگرہ تھی۔ "تمہیں کیسے پتا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"تم نے ایک بار بتایا تھا۔"

طویل خاموشی میں یاسمین کی سانس کی آواز آ رہی تھی: "میں تم سے چھ سال بڑی ہوں" وہ بولی۔

اسد نے اُس کے گال پر رکھا ہوا ہاتھ آہستہ سے دبایا، اور دیر تک دبائے رکھا، حتیٰ کہ کلائی کے پٹھوں میں لرزش پیدا ہونے لگی۔

"تم،" یاسمین نے کہا، "اس لیے تو مجھے چھوڑ کر نہیں جا رہے ہو؟"

ایک لمحے کو اسد نے سوچا کہ شاید وہ ہنس رہی ہے۔ اُس نے نیم اندھیرے میں نظر پہ زور دے کر دیکھا۔ یاسمین کے ہونٹ پتلے پتلے سوکھے ہوئے پھلوں کی مانند ایک دوسرے کے اُوپر رکھے تھے اور اُس کی آنکھوں میں اپنے سوال کی سوزش تھی۔ اسد کی سانس بوجھل ہونے لگی۔ وہ اُٹھ کر بستر پہ بیٹھ گیا۔ اُس نے دو تین لمبے لمبے سانس کھینچ کر سینے کو صاف کیا۔ پھر اُس نے پہلو کے بل پڑی یاسمین کو بچے کی طرح بازوؤں کے حلقے میں لے کر سینے کے ساتھ لگا لیا اور اُسی طرح بیٹھا بیٹھا ہلنے لگا، جیسے وظیفہ کر رہا ہو۔ یاسمین کا بوجھل بدن اُس کے بازوؤں میں بے مزاحمت ہلتا رہا۔

جب وہ رُکا تو اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کئی گھنٹوں تک لگاتار ہلتا رہا ہے۔ اُس کی کمر میں درد کے شرارے چھوٹ رہے تھے اور اُس کی سانس مشکل سے آ رہی تھی۔ وہ یاسمین کو بازوؤں میں لیے لیے بستر پہ گر پڑا۔ لیٹتے ہی وہ تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔ جب وہ جاگا تو اُس کی سانس ہموار ہو چلی تھی۔ یاسمین اُسی رُخ پہ اُس کی چھاتی پہ گال رکھے پڑی ہوئی بے معلوم سانس لے رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی ایک ہتھیلی اسد کی پسلیوں پہ چلاتی، انگلیوں کے پوروں کو ہولے سے پسلیوں کے درمیان والی نرم جلد پر دباتی، پھر ساکت ہو جاتی، جیسے ٹھہر ٹھہر کر بے زبانی سے انگلیوں کے تار جوڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ جنگلوں میں اُس رات درختوں کے چٹخنے کی آواز بھی نہ تھی۔

رات کا پچھلا پہر تھا جب اچانک بجلی کی کڑک کی مانند، سکوت کو چیرتی ہوئی ایک لمبی، اکلوتی چنگھاڑ کی آواز اُن کے کانوں سے آ کر ٹکرائی —— ہمیشہ کی طرح لامقام، بے سمت، اور بہت قریب۔ اسد نے مُڑ کر کھڑکی کی جانب دیکھا، جیسے کھڑکی میں شیر کا سر دیکھنے کا متوقع ہو۔ کھڑکی میں صرف ستاروں بھرے آسمان کا نیم روشن چوکھٹا تھا۔ وہ دونوں کان لگا کر اُس آواز کی شکل کو ہوا میں بنتے بگڑتے ہوئے دیکھتے رہے، پھر دیر تک دم سادھے اُس سے اگلی آواز کے منتظر رہے۔ مگر اُس آواز کا سلسلہ پیدا نہ ہوا، نہ کوئی دوسری آواز آئی۔ دھوئیں کی لاٹ کی مانند اُس ایک آواز کی لہر ہوا میں اُٹھی اور منجمد ہو گئی، اور خاموش کھڑی اُن کے کانوں میں سنسناتی رہی۔ آہستہ آہستہ اسد نے منہ موڑا اور بستر پہ سیدھا لیٹ گیا۔ رات کے عناصر پہ اُس آواز کا

سناٹا طاری تھا۔

دفعتاً یاسمین کا ڈھیلا بے جان جسم تڑپ کر بیدار ہوا۔ وہ کئی لمحوں تک گھٹنوں پہ کھڑی، ہوا میں اٹکی ہوئی اسد کو دیکھتی رہی، پھر وہ ہوا بھری چھتری کی مانند آہستہ سے اُس کے اُوپر آ گری۔ اسد کے بدن کو اُس نے چاروں ہاتھوں پاؤں سے ڈھانپ لیا اور اُسے چومنے لگی۔ اُس کے سر کو، ماتھے کو، آنکھوں کو، ہونٹوں کو اور ٹھوڑی کو، اُس کی گردن کے خم میں، سینے پہ، پسلیوں کی باریک جلد کے اُوپر، ناف کے اندر، گھٹنوں اور ٹخنوں کو چومتی ہوئی وہ پاؤں کے تلووں پہ چلی گئی۔

"میرے پاس رہو،" وہ رو کر بولی، "اسد جی۔"

اسد نے اُسے تھامنا چاہا مگر وہ اُس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اُس کے جسم میں غراتے ہوئے جانور کی سی تندی اور تیزی تھی۔

"اچھا۔ تمہارے پاس رہوں گا۔" وہ اُسے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا، "چند روز کی بات ہے۔"

"چند روز میں آ جاؤ گے؟" وہ اسد کے کندھے پر دانت رگڑتی ہوئی بولی، "پھر یہیں رہو گے؟"

آنسوؤں کے دو قطرے اسد کے گال پر گرے۔

"ہاں۔" وہ برابر اُسے بازوؤں میں قابو کرنے کی کوشش کرتا رہا، مگر وہ مچلتی ہوئی اسد کے سارے بدن پر پھسلتی رہی، جیسے پانی پہ تیر رہی ہو۔

"اچھا،" وہ بولی، اور اُس کی گردن پہ ہونٹ رکھ کر رونے لگی۔ اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کے حلقے میں اُس نے اسد کا سارا جسم اس طرح کس لیا تھا جیسے اُسے اپنے بدن کا حصہ بنا لینا چاہتی ہو۔

صبح کی خنک ہوا کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو رہی تھی۔ پہاڑ کے پہلو میں، گھاس کے اُوپر، سوتے جاگتے میں اسد نے دیکھا، ایک ہنستا ہوا چہرہ پڑا ہے جس کی آنکھیں پُرآب ہیں، اور کھڑکی کے اندر ایک بندوق ٹکی ہے۔

(۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ
عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ

یہ تھوڑے احوال ہیں بستیوں کے کہ ہم سناتے ہیں تجھ کو
کوئی ان میں قائم ہے اور کوئی کٹ گیا۔ (ہود: ۱۰۰)

القرآن الحکیم

(۷)

سبزی مائل رنگت کے فوجی خیمے گھٹاٹوپ درختوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مگر اس وسیع گھنے جنگل میں داخل ہوں تو جہاں تک نظر جاتی ان خیموں کا ایک شہر بسا تھا۔ ساری زمین پر سے جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کر دیا گیا تھا اور اونچے نیچے پتھروں کو کوٹ کاٹ کر سیدھی سیدھی پگڈنڈی نما سڑکیں بنائی گئی تھیں۔ ان سڑکوں پر جگہ جگہ چونے سے مختلف قسم کے علامتی نشان لگے تھے۔ کہیں گول دائرہ، کہیں ضرب کا کراس، کہیں جمع کا، وغیرہ۔ اکا دکا درختوں کو کاٹ کر گاڑیوں کے لیے جگہ صاف کی گئی تھی۔ زیادہ تر جیپ اور ڈاج گاڑیاں تھیں جن میں سے کئی کے اوپر درمیانے سائز کی توپیں نصب تھیں۔ دو توپوں کے دہانوں پر خاکی کینوس کے خول چڑھے تھے، باقی ننگی اپنی سونڈیں اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان کی گہرے سبز رنگ کی نالیوں پر کہیں کہیں دھوپ کی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ مگر ان کا روغن بے چمک تھا اور دھوپ ان پہ اٹھتی نہ تھی، جہاں پڑتی وہیں جذب ہو جاتی تھی۔ چند ایک جیپ گاڑیوں پر وائرلیس کا ساز و سامان فٹ کیا ہوا تھا، اور ان کے اوپر پتلے پتلے لچک دار ایریل سیدھی سیاہ ٹہنیوں کی مانند اٹھے تھے۔ زیادہ تر فوجی جنگل کے جنگی لباس میں ملبوس، جالی سے ڈھکے ہوئے خود پہنے، ٹوپی کے نیچے منہ والے سیاہ فل بوٹ ٹھمکاتے ہوئے ادھر

دھر آ جا رہے تھے، خیموں اور توپ گاڑیوں کے پاس کھڑے تھے یا وائرلیس کی بیٹریوں کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ کسی کسی جگہ پر پہاڑی پتھروں سے عارضی قسم کے کمرے بھی بنائے گئے تھے، جن کے آگے ایک سپاہی چھوٹی مشین گن کندھے سے لٹکائے کھڑا تھا یا پہریداروں کے پیچھے چوکس انداز میں چل پھر رہا تھا۔ کئی ہزار فٹ بلند پہاڑ کی اس ہموار چوٹی پر پائن اور دیودار کا بظاہر بے ضرر جنگل اس بھاری سامانِ حرب کو ڈھانپتے ہوئے ایک حصار کی شکل تھا۔

ایک خیمہ جس کا پردہ گرا تھا، پتھر کی پگڈنڈی سے ذرا دُور ایک مہیب درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ خیمے کے اندر بتی جل رہی تھی۔ ایک طرف کو میز اور اُس کے اطراف دو کرسیاں پڑی تھیں جن پر اسد اور ذوالفقار آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ خیمے کی دُوسری دیوار پر ایک بڑا سا نقشہ لٹکا تھا۔ سامنے خیمے کی نکڑ میں ایک فوجی کھاٹ فٹ کی ہوئی تھی جس کے اوپر کمبلوں کا بستر بچھا تھا۔ کھاٹ کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ میز پر ایک سُرخ جلد والی ڈائری نما کتاب، ایک ماچس اور شیو بنانے کا سامان پڑا تھا۔

خیمے کی دہنی دیوار پر، کھونٹے کے پاس، ایک چھوٹا سا شیشہ لٹکا تھا۔ کچھ دیر پہلے اسد جب خیمے میں داخل ہوا تھا تو کرسی پر بیٹھتے ہی شیشے میں اپنا عکس دیکھ کر چونک پڑا تھا، جیسے یکایک ایک موڑ مڑنے پر کوئی مدھم سا مانوس چہرہ سامنے آجائے۔ اب ذوالفقار باتیں کرتے کرتے رُک کر بے خیالی سے جیبی چاقو کے ساتھ پنسل کا سکہ باریک کر رہا تھا۔ اسد کو دوبارہ شیشے میں وہ شکل نظر پڑی۔ اُس کے بال دیہاتی کشمیریوں کے انداز میں کٹے تھے اور چار ہفتے کی ڈاڑھی بے ترتیبی سے بڑھ چکی تھی۔ اس دوران میں اگرچہ وہ چار بار نہا چکا تھا، مگر سر کے بال دھونے کی ممانعت تھی، چنانچہ اُس کے بال گدلی سی چکناہٹ لیے ہوئے چھوٹی چھوٹی رسیوں میں بٹنا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کے سر پہ گندی سی سفید کپڑے کی ٹوپی تھی جو مشکل آدھے سر کو ڈھانپ رہی تھی۔ شیشے سے نظر ہٹا کر اسد نے اپنے اوپر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ ایک میلے سے میلے چغہ نما کرتے اور بھاری شلوار میں ملبوس تھا اور اُس کے بے جراب پاؤں میں کشمیری چپل تھی۔

"چار ہفتے میں تمہاری صحت تو ٹھیک ہو گئی ہے۔" ذوالفقار نے کہا۔ "سانس کیسی ہے؟"

"ایک دورہ ہوا ہے۔ ڈھائی دن کا۔" اسد نے جواب دیا۔ "سخت نہیں تھا۔"

"کوئی دو رات کا پیدل سفر ہے۔ پانچ سیر نمک لے کر۔" ذوالفقار نے کہا۔ "ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔"

"اگر کچھ دن اور رُکنا چاہتے ہو تو . . . . . ."

"نہیں۔" اسد نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

ذوالفقار نے اچانک ہاتھ روک لیا۔ اُس نے چاقو میز پہ رکھا اور ہاتھ بڑھا کر اسد کی بائیں کلائی کو اپنے سامنے کھینچ کر اُسے دیکھنے لگا۔

"یہ نہیں چلے گا۔" وہ کلائی کو اُنگلی سے ٹھونک کر بولا، جہاں گھڑی باندھنے کی وجہ سے جلد پہ ہلکے رنگ کا مستقل فیتے کا نشان بن گیا تھا۔

"آستین کے نیچے آجائے گا۔" اسد نے کہا۔

"اونہوں۔" ذوالفقار نے فیصلہ کن انداز میں سر ہلایا۔ "رسک ہے۔" پھر اُس نے مُنہ اُٹھا کر آواز لگائی: "علی!"

خیمے کا پردہ اُٹھا اور ایک سپاہی نے اندر داخل ہو کر سلوٹ مارا۔

"گُل شیر کو بھیجو۔"

سپاہی دوبارہ سلوٹ کر کے باہر نکل گیا۔ ذوالفقار نے اسد کی کلائی پر سے ہاتھ اُٹھا کر کڑی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔"

"ہُنہہ؟"

"اپنے نام کی آواز پہ کوئی جوابی حرکت تمہاری طرف سے نہیں ہوئی۔"

"آواز سپاہی کو پڑی تھی۔"

"مَیں نے جب آواز دی تھی تو تمہاری طرف دیکھ رہا تھا۔" ذوالفقار تیزی سے بولا۔

"مجھے علم تھا کہ مخاطب میں نہیں ہوں۔"

"ریفلیکس، مائی فرینڈ۔ ریفلیکس۔ چار ہفتے تک تمہیں ٹریننگ کیمپ میں کیوں رکھا گیا ہے؟ صرف اس لیے کہ تمہارے ریفلیکس ڈویلپ ہوں۔ ریفلیکس۔" وہ زور دے کر بولا۔ "بہت آنکھ کی جھپک سے تم اپنا راز فاش کر سکتے ہو۔ انٹیلی جنس سب ریفلیکسز کا کھیل ہے، اور انسٹنکٹ کا۔ اس میں کوئی قانون نہیں، یا یہ کہ اس کے اپنے قانون ہیں۔ جنگل کے جانور کو پیچھے مُڑ کر دیکھے بغیر خبر ہو جاتی ہے کہ اُس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ تم نے کبھی دیکھا ہے وہ ایک پتا گرنے کی آواز سے بدک اُٹھتا ہے، حالانکہ اُسے علم ہوتا ہے کہ محض ایک پتا گرا ہے۔ مگر وہ جانتا ہے کہ اگر سو بار میں ایک بار بھی چُوک گیا تو جان گنوا بیٹھے گا۔ اس کام میں کوئی رسک کور نہیں ہوتا۔ موقع محل کے مطابق خود اپنا عمل وضع کرنا پڑتا ہے۔ کوئی حیلہ بہانہ کام نہیں دیتا۔"

"میں نے کوئی حیلہ بہانہ نہیں کیا۔"

ذوالفقار نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے صبر کی تلقین کی۔ "میری بات کو غلط مت سمجھو۔ میں تمہیں الزام نہیں دے رہا۔ محض اُٹیلی جنس کا فلسفہ بتا رہا ہوں۔ اب تُم دنیا کے واسطے ایک شخص بنام علی ہو۔ آج سے تمہارے اُوپر علی مُراد ولد شہباز قوم اجاڑ سکنہ لُوسیاہ پیشہ مزدور کی ذاتی ذمّہ داری ہی نہیں، بلکہ تمام تر اخلاقی ذمّہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔ آج سے تم نے عمداً اپنی ذات کی ایک شکل تخلیق کی ہے اور اس فیصلے کے ذمّہ دار ہو۔ تُو ڈٹے،" وہ میز پر آگے جُھکا اور اسد کے دونوں کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر جذبے سے بولا۔ "یو آر اے مین۔"

اُس کا جذبہ اور جوش اسد کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ خالی خالی آنکھیں کھولے ذوالفقار کو دیکھتا رہا۔ اسی اثناء میں خیمے کا پردہ اُٹھا کر ایک حوالدار اندر آیا اور سلوٹ کر کے انتظار کرنے لگا۔ ذوالفقار نے اُس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ اُٹھا کر سلوٹ کا جواب دیا اور اسد سے مخاطب رہا۔

"کیمپ کی ٹریننگ سے پُوری طرح مطمئن ہو؟"

"ہاں۔"

"پاتھ فائنڈنگ۔ اَن آرمڈ کامبیٹ۔ میپ ریڈنگ۔ مائننز؟"

"ہاں سب۔"

"یہ سب چیزیں حفظِ ماتقدم کے طور پر سیکھنی ضروری ہیں۔ مگر کامیاب اُنٹیلی جنس اوپریشن وہ ہوتا ہے جس میں کامبیٹ وغیرہ کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ بھُوت کی طرح چاروں کونوں میں پھر جاؤ اور دشمن کی ہوا کو خبر نہ ہو۔"

ذوالفقار نے حوالدار گُل شیر کی طرف دیکھ کر اسد کی کلائی کی جانب اشارہ کیا۔ حوالدار نے آگے بڑھ کر اسد کی کلائی ہاتھ میں لی، اور جلد کی اُجلی پٹی پر انگلی پھیر کر بولا:

"یہ تو ٹیپ سے ہی ہو گی، سر۔"

"ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی؟"

"بالکل، سر۔"

"آج ہی ہو جانی چاہیے۔"

"آج ہی ہو جائے گی، صاب۔"

"زیادہ نہ جل جائے۔ خیال رکھنا۔"

"پتا بھی نہیں چلے گا، صاب۔"

"ٹھیک ہے، گُل شیر۔"

"یس سر۔"

حوالدار سلوٹ کر کے باہر نکل گیا۔ ذوالفقار اُٹھ کر سامنے لگے ہوئے نقشے کے آگے جا کھڑا ہوا جس کے اُوپر جگہ جگہ رنگ دار گتّے کے مختلف شکلوں کے ٹکڑے چسپاں تھے۔

"میپ سائن۔" وہ اُنگلی اُٹھا اُٹھا کر نقشے پر رکھتا ہوا بولا۔ "آرمر۔ ایک ایک سا آرٹلری۔ سپلائز۔ انفنٹری۔ سائز۔ سٹرینگتھ۔۔۔۔۔۔ آج کل۔" اُس نے دو متوازی سبز لکیروں کے اُوپر اُوپر اُنگلی دوڑاتے ہوئے کہا، "یہ سلیپ کا پیڈور ہمارے استعمال میں ہے۔ اسی سے تُم جاؤ گے۔ اس بارے میں اُنٹیلی جنس ہماری اپنی یعنی آرمی کی ہے اور اپ ٹُو ڈیٹ ہے۔ ہمارے کاریڈور کو وہ مانٹر کرتے رہتے ہیں، مگر ہمیں چوبیس گھنٹے کے اندر خبر ہو جاتی ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ کل رات کو تمہاری روانگی ہے۔ جانے سے پہلے بہرحال ایک بار۔۔۔۔۔۔"

کوشش کے باوجود اسد اُس کی باتوں پہ اپنا ذہن مرکز نہ رکھ سکا۔ کچّی سبز سیاہی کی شکستہ متوازی لکیریں لمبی ہوتی ہوئی دُور تک چلی گئیں، اور ان کے بیچ بیچ نمک کے بڑے بڑے گلابی تودے اُبھرنا شروع ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تودے پگھلنا شروع ہو گئے، جیسے برف کے تودے ہوں۔ ایک بار اُس کے ذہن میں ایک شعلہ سا بھڑکا تھا، اسد نے یاد کیا، جس کی لَو میں ایک لمحے کے لیے ذوالفقار کا چہرہ بے راز ہو کر سامنے آ گیا تھا، پھر کھو گیا۔ یہ راز کیا ہے؟ اُس نے سوچا۔ نمک کے تودے میں ایک گہرا باریک سوراخ ہے جس میں کوئی آگ بھری ہے۔۔۔۔۔۔

★ ★ ★ ★ ★

"بانڑ چید۔" اسد نے کشمیریوں کے انداز میں گالی دی۔ اندھیرے میں اُس کا پاؤں کنکریوں کی ڈھلان پہ پھسل گیا تھا۔ بمشکل توازن قائم رکھتے ہوئے وہ دو گز نیچے جا کر پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ چند نوک دار کنکریاں اُس کے

چوتڑوں میں گھس گئی تھیں۔ اس نے احتیاط سے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ شلوار کے اندر نرم چرب دار گوشت میں جہاں کنکریں چبھی تھیں ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے تھے، جو ہاتھ سے ملنے پر رفع ہو گئے۔ اس نے دبا دبا کر دیکھا۔ چوتڑ خشک تھے، خون نہیں نکلا تھا۔

نمک کا ڈلا اس کے کندھے سے گود میں آ گرا تھا۔ اسد نے پھر زیرِ لب گالی دی۔

"یہ بھی ایک مصیبت ہے۔" وہ نیچی آواز میں بولا۔ "اسے پھینک دوں؟"

"اونہوں۔" امیر خاں نے بڑا سا سر ہلایا۔

"اب اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"اب ہی تو ضرورت ہے۔ ابھی ہم نے کاریڈور بھی پاس نہیں کیا۔ ہر جگہ چیکنگ کا خطرہ ہے۔ ادھر کوئی آنے والا نمک کے بغیر نہیں آتا۔ اس طرف تو یہ سونا ہے سونا۔ اسے منزل تک لے جانا ہے۔"

اسد نمک کو بازوؤں میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "سر پہ نہیں اٹھا سکتا؟"

"اونہوں۔" امیر خاں نے دوبارہ بڑا سا سر نفی میں ہلایا۔ "کوئی کشمیری سر پہ بوجھ نہیں اٹھاتا۔ جو سر پہ گٹھا اٹھائے دکھائی دے سمجھ لو جموں یا پونچھ کا ڈوگری ہے، یا ترک کا ہے۔ اصل کشمیری پیٹھ پر بوجھ اٹھاتا ہے اور کمر کے زور پہ چڑھائی چڑھتا ہے۔"

"کیوں؟"

"کشمیریوں کا قول ہے کہ سر پہ بوجھ اٹھانا عورتوں کا کام ہے۔ مرد کا سر آزاد ہوتا ہے اور اس کے کندھوں پہ دنیا کا بوجھ ہوتا ہے۔"

"عجیب بیہودہ رواج ہے۔" اسد نے کہا۔

"ہنسی مت اڑاؤ۔ ٹھیک ہے، بڑے بڑے بختاور قسمت کے نیچے لگ جاتے ہیں۔ اس وقت ہماری حالت اچھی نہیں، مگر کبھی نہ کبھی ٹھیک ہو کر رہے گی۔ عقیدے میں بڑی طاقت ہے۔ اس کے زور پہ ہم نے اپنا سر آزاد رکھا ہے۔"

اسد کو بے اختیار ہنسی آئی، مگر وہ رک گیا۔ عین وقت پہ اسے احساس ہوا کہ امیر خاں پوری سنجیدگی سے بات کر رہا ہے۔ اس نے دل میں شکر ادا کیا کہ اندھیرے میں امیر خاں نے اس کی ہنسی نہیں دیکھی۔ امیر خاں مانا ہوا سرحد پار کرانے والا تھا۔ چھ فٹ کے نقشے میں پنسل سے ایک نقطہ لگا دو، روانہ ہونے سے قبل اس نے ڈینگ ماری تھی، میں چل کر تمہیں اس نقطے پہ لے جاؤں گا۔ اسد کو اس پہ مکمل اعتماد تھا۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پہ اس درے کو متبادل راستے سے

انہوں نے یوں عبور کیا تھا جیسے جرنیلی سڑک ہو۔ ان کو چلتے ہوئے سات آٹھ گھنٹے ہو چلے تھے۔

"میری ہڈی میں چبھ رہا ہے۔" اسد نے چادر کی گٹھڑی بنا کر سر پہ جمائی اور نمک کا ڈھیلا اس پہ رکھ لیا۔ "جب کوئی آیا تو کندھے پر رکھ لوں گا۔"

"تمہارا خیال ہے تمہیں بتا کر آئے گا؟" امیر خاں نے کہا۔

"تم کشمیری ہو؟"

"اصل کشمیری۔ ہم لوگ صحابیوں کی اولاد میں سے ہیں۔"

"اصل کشمیری تو براہمن ہیں۔" اسد شرارت سے بولا۔

"ہمارے ہی بھائی بند تھے۔" وہ حقارت سے بولا۔ "آریہ سماجیوں نے پکڑ کر براہمن بنا دیے۔"

"ہم درے سے تو نکل آئے ہوں گے؟"

"ہاں۔" امیر خاں نے کہا۔

"دم لینے کے لیے ٹھہر نہیں سکتے؟"

"اونہوں۔ اب تو اصل ماتروں کے علاقے میں داخل ہوئے ہیں۔"

"میرا خیال تھا ہم ماتروں کے علاقے سے بچ کر چل رہے ہیں۔"

"ہاں آں۔" امیر خاں نے طنز بھری آواز نکالی۔ "بچ کر چلنا تھا تو گھر میں بیٹھے رہتے، باہر نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب اللہ مالک ہے۔ میرے پیچھے پیچھے چلتے آؤ۔"

راستے کے کنارے پر ایک بار پھر اسد کا پاؤں پھسلتے پھسلتے بچا۔ جب سے وہ چلے تھے وہ دو مرتبہ بری طرح پھسل چکا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے وہ گہرائی کو بخوبی دیکھ نہ سکتا تھا، مگر اسے علم تھا کہ وہ کئی سو فٹ گہری کھائی کے کنارے پہ جا کر رکا ہے۔ اب وہ جس علاقے میں جا رہے تھے وہاں دو طرفہ پہاڑ، جو رات بھر مہیب ہاتھیوں کی مانند جھومتے رہے تھے، کھلنے شروع ہو گئے تھے۔ دور ہٹتے ہٹتے وہ دھند سی سیاہ دیواروں کی شکل اختیار کر گئے اور آسمان کو کاٹتی ہوئی ان کی چوٹیوں کی تند لکیر تاریکی میں تحلیل ہونے لگی تھی۔ اب اس جگہ کھلے آسمان کے ستاروں کی لو تھی اور زمین کی ایک شکل ابھر رہی تھی۔ مگر ابھی تک وہ دونوں آدمی پہاڑ کے پیٹ پر کاٹے ہوئے ہموار رستے کی بجائے اس کے پہلو میں، چٹانوں کے آگے اور پیچھے، بھیڑوں بکریوں اور چرواہوں کی بنائی ہوئی تنگ، بے نشان پگڈنڈیوں پہ سفر کر رہے تھے۔ پچھلے ایک گھنٹے سے وہ مسلسل اترائی میں چلے جا رہے تھے۔

"اب ہم اُوپر نہیں جا سکتے؟" اسد نے راستے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"اونہوں۔ وہ چیڑ کا جانٹھ دیکھ رہے ہو؟" امیر خاں نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "وہاں سے وہاں تک۔ پیچھے وہاں اُوپر تک —— ایک بریگیڈ فوج پڑی ہے اس میں۔"

اسد کا بدن لمحے بھر میں جم گیا۔ خطرے کو اس قدر قریب پا کر اس کی چال میں خود بخود ایک واضح تبدیلی آگئی۔ اُس نے نمک کا ڈھیلا سر سے اُتار کر کندھے پر رکھ لیا اور پیر جما جما کر ہلکے پھلکے بے آواز انداز میں قدم رکھنے لگا۔ خطرے کا یہ احساس نیا تھا۔ اس سے وہ پہلی بار شناسا ہوا تھا۔ پولیس کی سپردگی میں، حوالات کے اندر جس خطرے سے اُس کا سامنا ہوا تھا اُس خطرے میں دہشت تھی، اور گلا گھونٹنے والی کثافت کا احساس تھا۔ اِن خطرے میں دہشت نہ تھی، یہ خطرہ اصل اور سنگین تھا، اس میں جرم کا قبول تھا اور سرکشی تھی اور کوئی ہیر پھیر نہ تھا، جان داؤ پہ تھی۔

"تھک گئے ہو؟" امیر خاں نے سرگوشی کی۔

اسد جواب دیے بغیر تیز تیز اس کے پیچھے چلتا رہا۔

"اُترائی مشکل ہوتی ہے" امیر خاں نے کہا۔ "چڑھائی میں پٹھے کام کرتے ہیں۔ دم لے لو تو سہل جاتے ہیں۔ اُترائی میں رگوں پر زور پڑتا ہے، اکڑ جاتی ہیں۔ اُترائی مرکزی ہڈیوں کا کام ہے، زور نہیں کھاتیں۔ حکیم سے تم نے کچھ حکمت سیکھی ہے؟"

"نہیں۔ تم حکیم کو جانتے ہو؟"

"واہ۔ اِس علاقے میں کون حکیم کو نہیں جانتا۔ اُس کے لوگوں پر بڑے احسان ہیں۔ یہ علاقہ ہی احسان فراموش ہے۔ ورنہ یہ لوگ اُس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے؟"

دفعتاً اسد لرز کر اپنے پیروں پر رک گیا۔ امیر خاں نے اُسے رُکتے ہوئے محسوس کر کے پیچھے دیکھا۔

"کیا ہے؟"

"وہ دیکھو" اسد نے سرگوشی کی، "وہ!"

"کہاں؟"

"وہ سامنے۔ درختوں میں۔"

امیر خاں نے ایک نظر اُدھر ڈالی اور چپکے سے ہنسا: "آنکھیں ہیں۔"

"آنکھیں؟"

"جانور کی۔"

"کس کی؟ شیر کی؟" اسد نے بے سوچے سمجھے پوچھا۔

"گیدڑ ہوگا۔ شیر اِدھر کہاں۔ اُدھر ہماری طرف ایک بجڑا ہوا آگیا ہے۔ کوئی باگھ ہے کبھی نہ کبھی مارا جائے گا۔ یہ علاقہ شیروں کا نہیں۔ چلو۔"

اسد کے دل میں خوف کا اندھیرا گہرا ہو گیا۔ اُس نے نمک کا ڈھیلا پھر اُٹھا کر سر پر رکھا اور کچکچی ٹانگوں سے امیر خاں کے پیچھے چل پڑا۔

"تمہاری قسمت اچھی ہے۔ اِس کاریڈور کے اندر سے یہ چھوٹا رستہ جاتا ہے۔ پچھلے مہینے جس طرف سے جانا پڑتا تھا اُدھر پیر رکھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ اب بارودی سرنگیں بھی مل گئی ہیں۔ پہلے کیل والی ہوتی تھیں، پاؤں گھسیٹ کر چلنے سے بچ جاتے تھے۔ اب نئی آگئی ہیں پتوں اور ڈھیلوں کی شکل والی۔ پتا بھی نہیں چلتا۔"

"چپ رہو" اسد نے کہا۔ "کوئی سن لے گا۔" خدا کے لیے چپ رہو، اس نے دل میں کہا۔

"میری آواز؟ میری آواز ایک فٹ سے آگے نہیں جاتی۔ مجھے بولنے کا تجربہ ہے۔ تم نہ بولو۔ تمہاری آواز دُور جاتی ہے۔ میری فکر نہ کرو۔ میں باتیں نہ کروں تو میرا سفر نہیں کٹتا ——"

میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں، اسد نے سوچا۔ اس نے بولنا بند نہ کیا تو میں نمک کا ڈھیلا اس کے سر پہ دے ماروں گا۔ آزاد سرکا بچہ۔ پوری رات نکل گئی ہے، بک بک بک بک۔ تھوڑی دیر اور چلتے رہے تو میری ٹانگیں جواب دے جائیں گی۔ یہ رات کب ختم ہوگی؟

"...... آج تک اللہ کے فضل سے میرے راستے میں کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔ سب دوسروں کے ہوتے ہیں، کسی کا ایک، کسی کے دو، چلتے اُڑ جاتے ہیں، یا پکڑے جاتے ہیں۔ میرا ریکارڈ ہے۔ مکھن میں سے بال کی طرح نکل جاتا ہوں۔ تم تھک گئے ہو؟ میں سمجھتا ہوں تمہارا قصور نہیں۔ تمہارا سانس بھی خراب ہے۔ کوئی بات نہیں، رات رات کا سفر بس آج کا ہے، آگے کھلا علاقہ آجائے گا، خطرہ بھی کم ہو جائے گا۔ کل دن دن میں چلیں گے۔ کل دوپہر کو نکل پڑے تو شام تک پہنچ جائیں گے۔ تم نے اپنی بوٹی بھی تلاش کرنی ہے؟ تمہیں کچھ خبر ہے کہاں ملتی ہے؟ خیر یہ تمہاری اپنی مصیبت ہے، مجھے کوئی مطلب نہیں۔ تمہیں کافی وقت مل جائے گا۔ مخبری میں ہو؟ مخبری میں وقت ہی وقت ہوتا ہے، خطرہ بھی کوئی نہیں۔ حکیم سے میں نے ایک بار دوا لی تھی، میری ایڑیوں میں درد اُٹھتا تھا۔ مجھے تو افاقہ ہوگیا تھا۔ خیر ....."

اُس کی مدھم، مختصر فقروں والی، باتُونی آواز اسد کے کانوں میں آتی رہی حتّٰی کہ اس نے سننا چھوڑ دیا اور

شدید تھکان کے باعث خطرے میں گھرے ہونے کا اندیشہ اس کے دل سے اتر گیا۔ مگر جب صبح کاذب کی لو لگی اور امیر خاں بات کرتے کرتے مڑا تو اسد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی آنکھوں میں وحشت کا خلا تھا اور طویل خوف کے مارے اس کا چہرہ نچڑ چکا تھا۔

کھلے علاقے میں داخل ہوتے ہی امیر خاں چپ ہو گیا اور اس کے چہرے پر خون کی رمق ظاہر ہوئی۔ اجالا ہوتے ہوتے وہ اپنے پہلے پڑاؤ پر جا پہنچے۔ یہ ایک جھنگنے سے پھیلے ہوئے ٹیلے کی ڈھلانوں پر بنا ہوا پچاس ساٹھ گھروں کا گاؤں تھا۔ صبح سویرے انہوں نے ایک دروازے پر جا کر دستک دی۔ بڑی بڑی ڈھلکی ہوئی مونچھوں اور منڈے ہوئے سر والے ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ امیر خاں کو پہچان کر اس نے خاموشی سے سر ہلایا اور راستہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ دونوں اندر داخل ہو گئے تو اس آدمی نے ایک لمحے کو سر باہر نکال کر دائیں اور بائیں نظر ڈالی اور دروازہ بھیڑ دیا۔

ان دونوں مسافروں کا کام یہاں صرف سستانے اور کچھ کھانے پینے کا سامان کرنے کا تھا۔ اسد کو معلوم ہوا کہ جیسے گھر کے مالک کو ان کی آمد کے مقصد کی چین نوعیت کا علم تھا اور وہ اسے وہیں تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ (بعد میں اسے پتا چلا کہ اس کام میں ہر شخص کو دوسروں کے کام کے علاوہ خود اپنے کام کی نوعیت کا بھی علم ہوتا ہے اور ہر کوئی، کو ضرورتاً اس میں ملوث ہوتا ہے نہ کہ شوقیہ، اسے وہیں تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔) کمرے میں داخل ہو کر فرش پر بیٹھتے ہی اسد نے پہلی مرتبہ بدن کو ڈھیلا چھوڑا، اور گویا پہلی ہی بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنا ترک کیا۔ بیٹھنے سے پہلے امیر خاں نے ہاتھ سے اسد کی جانب اشارہ کر کے مونچھوں والے سے کہا: "علی۔" مونچھوں والے نے اسد کی طرف دیکھے بغیر رضامندی سے سر ہلا دیا۔

گھر صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ ایک دیوار میں مٹی کا راکھ بھرا چولہا سرد پڑا تھا۔ چولہے کے آگے نصف دائرے میں زمین پر تین تکیے پڑے تھے۔ دو چھوٹے بچے ابھی محوِ خواب تھے جب کہ نو دس سال کی ایک بچی آنکھیں کھولے چت لیٹی تھی۔ ایک طرف ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی بھاری ڈنڈے کے ساتھ پتھر کی کونڈی میں آہستہ آہستہ کچھ کوٹ رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک کھاٹ پڑی تھی جس کی ادوائن ٹوٹ کر نیچے لٹک رہی تھی۔ کھاٹ پر میلے میلے پھٹے ہوئے لحاف اور کئی دوسرے کپڑے ڈھیر کی شکل میں پڑے تھے۔ نو دس سال کی بچی اٹھ کر بیٹھ گئی اور ٹکٹکی لگا کر اسد کو دیکھنے لگی۔ بچی کی طرح عورت بھی ٹکٹکی باندھے نمک کے ڈھیلوں کو تکتے ہوئے ہاتھ سے کونڈی میں ڈنڈا چلائے جا رہی تھی۔

"دوائی سے تمہیں آرام آ گیا تھا؟" اسد نے گفتگو کرنے کی سعی کی۔ بدن ڈھیلا چھوڑ کر اسے آرام محسوس ہو

رہا تھا۔

"بہت افاقہ ہوا تھا۔ کئی مہینوں کے بعد ایک ایڑی میں دوبارہ درد اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مگر دوسری میں اس کے بعد نہیں ہوا، بالکل جاتا رہا۔ حکیم کی دوا کارآمد ہوتی تھی۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے۔"

"اب بھی ہوتا ہے؟"

"نہیں۔"

"دوسری ایڑی میں؟"

"ہاں۔"

"ہر وقت؟"

"نہیں۔ ہر وقت تو پہلے بھی نہیں ہوتا تھا۔ بس سردی کے دنوں میں ہوتا ہے۔"

"دوبارہ درد اٹھا تو تم نے دوا لی تھی؟"

"اونہوں۔ فرصت ہی نہیں ملی۔ کچھ سستی بھی کر گیا۔" امیر خاں ہنسا۔ "اصل میں جب درد بالکل جاتا رہا تو مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہونے لگا۔"

"کیسے؟"

"چلنے میں تکلیف ہونے لگی۔ اتنی دیر سے میری ایڑیوں میں درد تھا کہ میں ایڑیاں اٹھا کر چلنے کا عادی ہو گیا تھا۔ جب درد جاتا رہا تو میں پورا پاؤں دبا کر چلنے لگا۔ اس سے پاؤں الٹ پڑنے لگا۔ میرے ٹخنے بھی درد کرنے لگے۔ جب ایک ایڑی میں درد اٹھا تو میں نے شکر کیا۔ جب درد کا دور میرا ساتھ ہی ہوا تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میری قسمت ہی ایسی ہے۔" وہ پھر خشک سی ہنسی ہنسا۔

گھر کے مالک نے لمبی سی قمیض کے اوپر روئی بھری ہوئی بغیر بٹن کی واسکٹ پہن لی تھی۔ اس نے دونوں مہمانوں کے آگے مکئی کی روٹی، میوے والا گڑ اور تھوڑا سا ترش دہی لا کر رکھا اور خود جا کر اپنی بیوی کے پاس بیٹھ گیا۔ سب سے چھوٹا بچہ جاگ کر رونے لگا تھا۔ اسد اور امیر خاں نے خاموشی سے کھانا ختم کیا۔ کھانے کے بعد دونوں نے اپنے اپنے نمک کے ڈھیلوں پر چادروں کی پگڑیاں بنا کر رکھیں اور سونے کے لیے زمین پر لیٹ گئے۔

اسد کے دل میں کھد بد لگی تھی۔ یہ شخص میرے بارے میں کیا کچھ جانتا ہے؟ اس علاقے کا ہے۔ اندیلی جنس کا آدمی ہے۔ سب کچھ جانتا ہوگا۔ پھر یہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا؟ ادھر ادھر کی مارتا ہے۔ حکیم کی طرف داری کیوں کر رہا ہے؟

"تم خوشی محمد کو جانتے ہو؟" اسد نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہمارے ساتھ رہا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہیں۔ ادھر کام کرتا تھا۔ پہلے پہل بہت اچھا رہا۔ پھر دغا دے گیا۔ بدبخت۔"

"کیسے؟"

"ڈبل ہو گیا۔"

اسد کی آنکھیں بند ہوتے ہوتے کھل گئیں۔

"اس بات کا پتا کب چلا تھا؟"

"کس بات کا؟"

"کہ ڈبل ہو گیا ہے۔"

"پچھلے دنوں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ہنہہ؟"

"اس نے حکیم کو قتل کیا ہے؟"

امیر خاں کی آنکھیں اب بند ہو چکی تھیں۔ "سچ پوچھتے ہو تو قتل وتل کرنے کی اس کی جان نہیں تھی۔ چڑی کی پھننک سے کانپ جاتا تھا۔ جنگل مزدور تھا۔ میں اسے اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ علاقے کا واقف تھا، روٹی کمانے کی خاطر اس کام میں آ گیا۔ مگر بدبخت تھا۔ زیادہ لالچ میں پڑ گیا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" اسد نے اصرار کیا۔

"خیال کیا ہوگا۔ تمہارے اوپر بھی شک کیا گیا تھا، مجھے علم ہے۔ مگر سچ پوچھو تو ایک آدمی کی جان لینا تمہارے بھی بس کی بات نہیں۔ مجھے آدمیوں کا تجربہ ہے۔ میں دیکھ کر آدمی کی خصلت بتا دیتا ہوں۔"

"پھر خوشی محمد پکڑا کیوں گیا ہے؟"

"واللہ اعلم۔ کوئی نہ کوئی ثبوت ہوگا پولیس کے پاس۔"

"ثبوت کا کیا ہے۔" اسد نے کہا۔ "مہیا کیا جا سکتا ہے۔"

"بس۔ اور کیا چاہیے؟"

"کیوں۔ اور کچھ نہیں چاہیے؟"

"بھائی۔" امیر خاں نے آنکھیں کھول کر صبر سے کہا۔ "اس طرح بحث کرنے لگے تو کہو گے کہ جرم بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ ٹھیک ہے، اس دنیا میں کیا کچھ نہیں مہیا کیا جا سکتا۔ حقیقت کا علم صرف خدا کی ذات کو ہے۔ میں سمجھتا ہوں پھر بھی خوشی اچھا رہا ہے، قید میں جا کر محفوظ ہو گیا ہے۔ ورنہ ڈبل کو ٹھکانے لگانا کوئی مشکل بات نہیں۔ اب آرام کرو۔ زیادہ سوچ والی باتیں کرو گے تو نیند اڑ جائے گی۔ میری نیند بھی خراب کرو گے۔ دو چار گھنٹے آرام کر لو۔ جتنی دیر سے چلے اتنی دیر میں پہنچیں گے۔ رات ہو جائے گی۔"

اسد چت لیٹا آنکھیں کھولے چھت کو تکتا رہا۔ ایک ہی منٹ کے اندر امیر خاں کا منہ کھل گیا اور اس کا ادھ گنجا سر نیند میں ٹرک کے ڈھیلے سے آہستہ آہستہ ڈھلکنا شروع ہوا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، سر کو ہوا میں اٹھائے خالی خالی نظروں سے اسد کو دیکھا، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو، پھر کروٹ لے کر، سر کو اچھی طرح سے چادر کی گٹھڑی پر جما کر سو گیا۔

اسد نے بھی کروٹ لی اور بازو کو سر اور چادر کے تکیے کے درمیان رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ "حرامزادے،" اس نے دل میں کہا۔

شام تک وہ پہنچ جائیں گے، اسد نے سوچا۔ پھر شلوار اتروا کر اس کی شناخت کی جائے گی۔ بس بارے میں ذوالفقار اسے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ جو چند باتیں اسد کو مستقل پریشان کیے ہوئے تھیں ان میں ایک یہ بات بھی تھی۔ جب سے ذوالفقار نے اس کا ذکر کیا تھا، بار بار اسد کو اس کا خیال آ رہا تھا۔ اکثر اس کو رات کے وقت اندھیرے میں یہ خیال آیا کرتا تھا، اور متعدد بار اس نے اپنے ذہن کی آنکھ میں اسے ہوتے ہوئے دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی، مگر بے سود۔ زیادہ سے زیادہ اسے حوالات میں اپنے ننگے بدن کی یاد آ جاتی۔ مگر اس میں وہ بات نہ تھی۔ حوالات والی شکل میں سارے بدن کا وجود اور اس بدن کی دہشت شامل تھی، مگر اس بات میں کوئی دہشت نہ تھی۔ اس میں بدن محفوظ تھا، صرف بدن کی دریافت کا ایک نہایت سنجیدہ اور کسی قدر مضحکہ خیز کھیل تھا جو اسد میں جھجک پیدا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ جھجک بڑھ کر اس کے ذہن میں ایک تردد کی شکل اختیار کر گئی۔ ایک بار ہمت کر کے اس نے ذوالفقار سے اس کا ذکر بھی کیا:

"اور تو سب ٹھیک ہے۔" اس نے کوشش کر کے عام سے لہجے میں بات شروع کی۔ "صرف یہ شناخت۔۔۔"

"شناخت کیا؟"

"اسے کسی طریقے سے ٹالا نہیں جا سکتا؟"

ذوالفقار نے اپنے ہونٹ ذرا سے سکیڑے، جیسے ایک عجیب سی مسکراہٹ کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ "نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا، "یہ بات تمہیں غیر معمولی سی معلوم ہوگی۔ مگر آج کل کون سی بات غیر معمولی نہیں۔ ان مخصوص حالات میں ہمارے پاس یہی ایک طریقہ اپنی آئیڈنٹٹی ثابت کرنے کا رہ گیا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی فول پروف طریقہ نہیں، مگر آئیڈنٹٹی ثابت کرنے کا آج تک کوئی فول پروف طریقہ ایجاد نہیں ہوا۔ عام حالات میں گواہیوں سے کام چل جاتا ہے۔ مگر آج کل گواہوں کا کیا اعتبار؟ ان حالات میں اپنے آپ کو ننگا کرنے سے کم کام نہیں چلتا۔" وہ اچانک نیم شرارت سے اسد کو دیکھ کر مسکرایا، "شرم کی کیا بات ہے۔ جوان آدمی ہو۔ مردوں کے سب کھیل ننگے بدن ہی ہوا کرتے ہیں۔"

اس کے بعد اسد نے اسے ذہنی طور پر قبول کرنے کی کوشش کی، مگر اس کے تردد کا بوجھ اس کے دل سے نہ گیا۔ آخر یہ بوجھ اتنا بڑھا کہ اس نے سوتے میں اس کی شکلیں دیکھنا شروع کر دیں۔ پچھلے چند روز میں وہ دو تین بار خواب دیکھ چکا تھا کبھی وہ سرحد کے اوپر کھڑا ہوتا (سرحد، زمین پر ایک سیدھی لکیر کی شکل میں کھنچی ہوتی، اور وہ ایک پاؤں لکیر کے اِدھر اور دوسرا اُدھر رکھے کھڑا ہوتا) اور اس کی ٹانگیں اور پیر ننگے ہوتے، شلوار کہیں غائب ہوتی، اور متعدد مسلح سپاہی اس کا کرتہ اٹھا کر جھانک رہے ہوتے۔ ایک بار اس نے دیکھا کہ وہ اسی طرح ٹانگیں چوڑی کیے سرحد کی لکیر کے آر پار کھڑا ہے اور ایک مونچھوں والا سپاہی جھک کر بغور اس کے آلۂ تناسل کا ملاحظہ کر رہا ہے۔ سپاہی کی مونچھیں اچانک لمبی ہونی شروع ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ آ کر اس کی رانوں سے ٹکرانے لگتی ہیں جس سے اسے جلد پر کھجلی محسوس ہونے لگتی ہے۔ سپاہی ہاتھ بڑھا کر اس سرِ گوشت کے لوتھڑے کو اپنی موٹی موٹی انگلیوں میں پکڑ لیتا ہے اور دبا دبا کر دیکھتا ہے، پھر چھوڑ دیتا ہے اور کھڑے ہو کر اطمینان سے سر ہلاتا ہے۔ پھر یکایک آلۂ تناسل بدن سے جدا ہو کر زمین پہ گر پڑتا ہے، جسے سپاہی اپنی بینٹ میں پرو کر اوپر اٹھا لیتا ہے۔ ان کے گرد چند لوگوں کا مجمع ہو گیا ہے اور سپاہی باری باری ملاحظے کے لیے ہر ایک کے آگے بینٹ لگی رائفل گھما رہا ہے۔ مجمعے میں چند مانوس چہرے ہیں۔ اس کے باپ کا چہرہ ہے، یاسمین کا چہرہ ہے، اس کے چچا کا اور حکیم کا چہرہ ہے پھر عینکوں والے خاکسار کا چہرہ ہے جو بینٹ پر لٹکتے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کو دیکھتے ہی اونچی آواز میں نعرہ لگاتا ہے:

"چور اچکے چودھری تے لنڈی رن پردھان۔" مجمعے میں سب لوگ اپنے غمناک چہرے سنجیدگی سے ہلا ہلا کر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں....... وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ وہ بازو پہ سر رکھے رکھے سو گیا۔

جب اسد نے آنکھیں کھولیں تو امیر خاں اس کے اوپر جھکا اسے جگا رہا تھا۔ "دوپہر ہو گئی ہے۔ چلو، کمرے

کا نقشہ ہو بہو وہی تھا، صرف تینوں بچے اٹھ کر اپنی ماں کے گرد زمین پہ پاؤں کے بل بیٹھے تھے۔ کپڑے چیتھڑوں کی شکل میں ان کے میل سے اٹے ہوئے جسموں پہ لٹک رہے تھے، اور وہ ہاتھوں میں مکئی کی روٹی کے ٹکڑے تھامے انہیں بے خیالی کے انداز میں چبا رہے تھے اور دونوں اجنبیوں کو دیکھے جا رہے تھے۔ دروازہ اسی طرح اندر سے بند تھا۔ کمرے میں روشنی ایک کھڑکی کے راستے داخل ہو رہی تھی جس کا صرف ایک پٹ کھلا تھا۔ چھوٹے بچے کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا چھٹ کر زمین پر آ رہا، جسے اس کی ماں نے اٹھا کر سختی سے دوبارہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"خیال سے کھا۔" وہ پہلے مہمانوں پہ، پھر اپنے خاوند پہ اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر بچے کے سر کے اوپر خلا میں دیکھتی ہوئی بولی، "جب سے ہوا ہے ایک دن اس نے خیال سے روٹی نہیں کھائی۔"

بچہ روٹی کا ٹکڑا پکڑ کر پھر بے خیالی سے اس کا کنارا چبانے لگا۔ اسد نے کمرے کے کونے میں جا کر تھوکا جہاں فرش میں پانی کے اخراج کے لیے موری نکلی تھی۔ ان کے میزبان نے مکئی کی ایک ایک روٹی اور گڑ کا ڈھیلا ان کے حوالے کیا جو انہوں نے آدھا آدھا کھایا، باقی اپنی اپنی چادروں کے کونوں میں باندھ لیا۔ پھر عورت نے کیتلی میں سے گرم چائے کا ایک ایک پیالہ بھر کر انہیں دیا۔ جب وہ جانے کے لیے تیار ہوئے تو اس وقت مونچھوں والے آدمی نے پہلی، اور آخری بار (غالباً اپنی بیوی کے اکسانے پر) بات کی۔ یہ بات اس نے چند الفاظ اور ہاتھ کے مختصر اشاروں کی مدد سے ادا کی اور اس کا مدعا نمک کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کی درخواست تھی۔

امیر خاں نے چند لمحے تک سوچ کی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد اپنا نمک کا ڈھیلا کندھے سے اتارا، اسے کونے میں پڑی ڈوری کے کنارے پر رکھا، اور ڈنڈا اٹھا کر احتیاط سے اس کے ایک کونے پہ مارا۔ صاف گلابی نمک پر جہاں ڈنڈے کی چوٹ پڑی وہاں سے دب کر سفید ہو گیا اور اس نشان میں سے چھوٹی بڑی سفید دھاریاں نکل کر نمک کی سطح پر پھیل گئیں۔ امیر خاں نے ہاتھ روک کر سفید پسی ہوئی سطح کا معائنہ کیا، جیسے اس داغ کا افسوس کر رہا ہو۔ پھر اس نے ڈنڈا اٹھا کر ذرا زور سے ڈھیلے پہ مارا تو نمک کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ٹوٹ کر ڈوری میں جا گرا۔ امیر خاں نے کرتے کے دامن سے اپنے ڈھیلے کو اچھی طرح سے صاف کیا اور اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ وہ دونوں خاموشی سے باہر نکل آئے۔ گھر کے مالک نے دروازے سے سر نکال کر دائیں اور بائیں نظر ڈالی، پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ سورج سر پر تھا اور میلے میلے بچے، عورتیں اور مرد اپنے راستوں پہ آ جا رہے تھے۔

اندر اندھیرا ہو گیا ہوگا، اسد نے خیال کیا۔ اندھیرے کمرے کے اندر بے خیالی میں روٹی کے

کنارے چباتے ہوئے بچّوں کا منظر اسد کی نظروں کے سامنے بڑی دیر تک پھرتا رہا۔

پہاڑوں کی اُونچی اُونچی دوطرفہ دیواریں اب پیچھے رہ گئی تھیں۔ یہ علاقہ کم و بیش ہموار زمین اور چھوٹی بڑی پہاڑیوں کا تھا جن کے بیچ ایک تنگ سا دریا بہتا تھا۔ اب وُہ دونوں باقاعدہ بنے ہُوئے رستے پر سفر کر رہے تھے۔ امیر خاں کو آگے چلنے کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ کبھی وہ اور کبھی اسد چلتا چلتا آگے نکل جاتا۔ یہاں زمین زرخیز تھی۔ چھوٹی بڑی چٹانوں کے عقب میں مٹی کے ذخیروں پر اُگے ہُوئے خودرو پھُولوں کے جھُنڈ چھلاووں کی طرح مُنہ نکال کر ہنستے ہُوئے نمودار ہوتے اور دو قدم چلنے پر غائب ہو جاتے۔ دھوپ میں چلنے سے اسد کو پسینہ آنے لگا تھا۔

"یہ علی کون تھا؟" اسد نے پُوچھا۔

"ہمارا آدمی تھا۔ مر گیا ہے۔"

"ڈبل تو نہیں تھا؟"

"نہیں۔ بڑا سچّا آدمی تھا۔ کیوں؟"

"ایسے ہی پُوچھا ہے۔ مَیں کسی ایسے چکّر میں نہیں پھنسنا چاہتا کہ نہ اِدھر کا رہوں نہ اُدھر کا۔ دونوں طرف کے آدمی میرے پیچھے لگے ہوں۔"

امیر خاں اپنی خشک ہنسی ہنسا۔ "اِدھر کا تھا۔ بڑا سچّا اور دلیر آدمی تھا۔ قضا آ گئی۔ مر گیا۔"

دھوپ ڈھلی تو ہواؤں میں خُنکی لَوٹ آئی۔ ایک لمبی پہاڑی کے سائے میں چلتے چلتے اسد نے چادر کا ایک پلّو نکال کر کندھوں کے گرد لپیٹ لیا۔

★ ★ ★ ★ ★

سُلطان شاہ کا کدو کی شکل کا اُسترے سے مُنڈا ہوا سر تھا جو تیل سے چمک رہا تھا۔ وہ درمیانے قد اور گٹھے ہُوئے بدن والا آدمی تھا جس کی سب سے نمایاں شے اُس کی گردن تھی۔ پلے ہُوئے بیل کی سی چوڑی

اور اُبھری ہُوئی گردن کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اگر یہ شخص دیمک کی طرح اپنا نوک دار سر سیدھا کر کے دوڑتا ہوا آئے تو دیوار پھاڑ کر نکل جائے گا۔

غروبِ آفتاب سے کوئی دو گھنٹے بعد امیر خاں اور اسد اس قصبے میں داخل ہوئے تھے۔ قصبہ چھوٹے موٹے شہر کے سائز کا تھا اور سلطان شاہ کا مکان قصبے کے سب سے گنجان آباد علاقے میں واقع تھا۔ سُلطان شاہ نے دروازہ کھول کر خاموشی سے امیر خاں کے ساتھ معانقہ کیا اور اسد کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ کمرے کے درمیان کچے فرش میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھُدا تھا جس میں چند لکڑیاں پڑی دہک رہی تھیں۔ گڑھے کے گرد زمین پر دو دریاں بچھی تھیں۔

مکان تک آنے کے لیے طویل پتھریلی گلی کی چڑھائی چڑھتے چڑھتے اسد کی سانس پھُول گئی تھی۔ اُس نے سُلطان شاہ سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنا نمک کا ڈھیلا ایک دری پر رکھا اور اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ دہکتی ہوئی لکڑیوں کی حرارت اُس کے تکان سے اکڑے ہوئے جسم کو بھلی معلوم ہُوئی۔ دروازے کے پاس امیر خاں اپنے میزبان کے پاس کھڑا نیچی آواز میں بات کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد دونوں نے اسد کی جانب نگاہ پھینکی، پھر بات ختم کر کے سُلطان شاہ نے اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور دونوں آ کر دری پر بیٹھ گئے۔ امیر خاں نے نمک کے ڈھیلے پر سر رکھا اور آگ کے پاس لیٹ گیا۔ سُلطان شاہ پرارتھنا کرتے ہوئے سادھوؤں کی مانند ٹانگیں سمیٹے، گھٹنے دائیں بائیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس بھاری، ساکت انداز میں بیٹھا وہ پہلے سے بھی زیادہ طاقتور دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کا چہرہ لمبا اور نقش تیکھے تھے۔ اُس کے مُنہ پر کوئی بال نہ تھا۔ یُوں لگتا تھا کہ اُس کا سر، مونچھیں اور داڑھی ایک ہی اُسترے سے، ایک ہی وقت بلکہ ایک ہی وار میں صفاچٹ کر دیے گئے تھے۔ وہ امیر خاں سے آہستہ آہستہ کشمیری میں باتیں کر رہا تھا۔ باتیں زیادہ تر سرحد پار کی اور غیر اہم تھیں جن سے اسد کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔

دو دو چار چار منٹ کے وقفے پر تین اور افراد دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئے۔ ہر بار سُلطان شاہ کا ہیبت ناک جثّہ سُرعت کے ساتھ اُچک کر اُٹھتا، اور اس سے پیشتر کہ پاؤں پر جم کر کھڑا ہو، دروازے تک پہنچ چکا ہوتا۔ تاہم اُس کی چال ڈھال سے کبھی نامناسب عجلت کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اُس کے انداز میں جنگل کے آزاد جانوروں کا سا قدرتی وقار تھا۔ اُسے کمرے میں اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر لحظہ بہ لحظہ اسد کے دل میں یہ احساس مضبوط ہوتا جا رہا تھا کہ اُس کے سفر کے دوران کہیں پر ذوالفقار کا اور امیر خاں کا علاقہ ختم ہو چکا ہے۔ اس جنگل میں اب اس کشمیری کا اختیار چلتا تھا۔ اسد نے وہاں بیٹھے بیٹھے

ایک میں سالہ عورت کو اندر داخل ہوتے اور متانت و اختصار کے ساتھ کوئی بات کر کے، دری پر بیٹھے ہوئے دو اجنبیوں کی جانب دیکھے بغیر، مکان کے پچھلے کمرے میں جاتے ہوئے، اور پھر دو تند شکل کشمیریوں کو سلطان شاہ سے بات کرتے کرتے، ایک غیر مرئی اطاعت کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے دیکھا۔

ان میں سے ایک ادھیڑ عمر کا، گھنی سیاہ ڈاڑھی اور مونچھوں والا شخص تھا۔ بالوں کی بے ترتیب اگاس کے نیچے اس کے چہرے کے نقوش قریب قریب اوجھل ہو چکے تھے۔ لالٹین کی اس مدھم روشنی میں بھی، دو گز کے فاصلے سے، اسد نے دیکھا کہ اس کی ناک کے نیچے کھڑے ہوئے مونچھوں کے دو بال اس کی سانس کے ساتھ ساتھ اندر اور باہر ہل رہے تھے۔ الجھی ہوئی دراز بھنوؤں کے نیچے اس کی آنکھیں کرخت اور چمک دار تھیں۔ باتیں کرتے کرتے وہ بار بار اپنے ڈھیلے کرتے کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پیٹ کھجا رہا تھا۔ سلطان شاہ نے اسد کی طرف اشارہ کر کے اسے متعارف کرایا۔

ادھیڑ عمر شخص جس کا نام غلام تھا، کھردری آواز میں بولا: "علی۔" ساتھ ہی اس نے سر کے ایک جھٹکے سے اسد کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک ہاتھ وہ اسد کے کندھے پر رکھ کر، دوسرے ہاتھ سے پیٹ کھجاتا ہوا، اسے دیوار کے پاس اس جگہ تک لے گیا جہاں لالٹین ٹنگی تھی۔ وہاں پر اس نے اسد کو دیوار کی طرف رخ کر کے کھڑا کیا، اور ایک اچٹتی ہوئی نظر پچھلے کمرے کی جانب ڈالی جہاں سے عورت کے چلنے پھرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر اس نے ایک لحظے کو سختی سے اسد کی آنکھوں میں دیکھا اور سر کے مختصر سے جھٹکے سے اس کی ٹانگوں کی جانب اشارہ کیا۔ اسد نے جلدی سے پیٹ پر سے کپڑا اٹھا کر ٹھوڑی کے نیچے دابا اور ازار بند کھول کر شلوار نیچے ڈھلکا دی۔ غلام نے جھک کر معائنہ کیا، پھر سر ہلا کر اسے ڈھانپنے کا اشارہ کر کے عجلت سے سیدھا ہو گیا۔ اسد نے ٹھوڑی کو ڈھیل دی تو کرتہ نیچے گر پڑا۔ وہ دیوار کے ساتھ کھسک کر ازار بند باندھنے لگا۔ شلوار سیدھی کرنے کے بعد اسد واپس دری کے اوپر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ یہ ساری کارروائی چند ساعتوں کے اندر تمام پا گئی۔

دوسرا اندر داخل ہونے والا شخص ایک نوجوان تھا جس کے گول چہرے پر صفائی سے کتری ہوئی مونچھیں تھیں جو ہونٹوں کے گرد ڈھلک کر ٹھوڑی تک چلی گئی تھیں۔ اس کی بڑی بڑی ملائم نظر والی آنکھیں تھیں جو اس کی تند مونچھوں سے مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ اس جبڑے تنے، اور اس کے خفیف سے پھولے ہوئے نتھنوں نے اس کے چہرے کو ایک عجیب سی بے قاعدگی عطا کی تھی جو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں اس سے کسی قدر خائف کر دیتی تھی۔ اسد کی "شناخت" کے دوران وہ نوجوان دروازے کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے خاموش کھڑا ان دونوں کی طرف دیکھتا اور ہولے ہولے جبڑے ہلاتا رہا، جیسے کچھ چبا رہا ہو۔ کچھ دیر کے بعد وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پچھلے کمرے

میں چلا گیا۔

"شناخت ضروری ہے۔" سلطان شاہ نے اپنی دھیمی آواز میں اسد سے کہا۔ "اب تو ایسا بھی ہونے لگا ہے کہ ان کے جاسوس برا بھلا اس کٹوا کر ہمارے اندر آ شامل ہوتے ہیں۔ مگر دھیان سے دیکھنے پر سنت کا اور جھٹکے کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے شناخت اور بھی ضروری ہو گئی ہے۔"

اسد نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔ چوڑی سی ننگی ہڈی والی عورت سپاٹ قدموں سے چلتی ہوئی پچھلے کمرے سے نمودار ہوئی۔ وہ ایک ہاتھ میں چائے دانی اور دوسرے میں مٹی کے پانچ پیالے، جو ایک دوسرے کے اندر جمے تھے، اٹھائے ہوئے تھی۔ سلطان شاہ نے پیالوں کا چھوٹا سا مینار عورت کے ہاتھ سے لے کر اسی طرح زمین پر کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے ایک ایک پیالہ اٹھا کر چائے سے بھرنا شروع کر دیا۔ جب چاروں کے ہاتھوں میں بھرے ہوئے پیالے جا چکے اور دری پر رکھا ہوا پانچواں پیالہ بھی بھر گیا تو عورت خالی چائے دانی لے کر واپس پچھلے کمرے میں چلی گئی۔ چند سیکنڈ کے بعد نوجوان لڑکے نے لکڑی کا ایک گول سا برتن لا کر دری پر رکھ دیا۔ تھال کشمش، بادام، اخروٹ کی گری اور خشک خوبانیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لڑکے نے پانچواں پیالہ اٹھایا اور دری کے کنارے پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

"ریاض میرا بھتیجا ہے۔" سلطان شاہ نے مختصراً اسد سے نوجوان کا تعارف کرایا۔ ریاض اس کی طرف دیکھے بغیر چائے پیتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے کمرے میں مکمل خاموشی ہو گئی۔ پانچ نفر کے جبڑے مضبوطی سے خشک میوے کو چبا رہے تھے۔ کھانے والوں کے چہروں پہ ایک عجیب مستی کا عالم تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی قوت سے پُر وہ پھل اور میوے، دانتوں کے بیچ پس پس کر اور زیر زبان ہل ہل کر پگھلتے ہوئے لعاب میں یک جان ہو کر حلق سے ڈھلتے اور حیاتین کی شکل میں سیدھے خون کی شریانوں میں اترتے جا رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں امیر خاں اور غلام پیالہ منہ سے لگا کر اونچی اونچی سسکیوں میں الائچی والی نمک دار سبز چائے پی رہے تھے۔ اسد نے اوپر تلے چھ سات خشک خوبانیاں چبا چبا کر کھائیں اور گرم مزے دار چائے کا گھونٹ بھرا۔ خوبانیوں کی ترش شیرینی نے اس کے تھکاوٹ اور اشتہا سے چور بدن میں ایک لہر دوڑا دی۔ ریاض نے دری پر پڑی ہوئی خوبانی کی چند گٹھلیوں میں سے ایک اٹھا کر اپنی ڈاڑھوں میں رکھی اور اسے توڑ کر اس کی گری چبانے لگا۔ گٹھلی کا چھلکا اس نے ہتھیلی میں تھرک کر سلگتی ہوئی لکڑیوں پر پھینک دیا، جہاں پہ وہ کچھ دیر تک دھواں دینے کے بعد بھڑک کر جل اٹھا۔ دو تین ننھے ننھے نیلے اور سبز رنگ شعلے چند سیکنڈ تک لو دینے کے بعد بجھ گئے۔ سلطان شاہ اور غلام نے دوبارہ دھیمے لہجے میں باتیں شروع کر دیں۔ اسد نے کچھ دیر تک کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ مگر ان کی باتیں بیشتر ذاتی

اور مقامی نوعیت کی تھیں۔ اسد کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ دری پر ٹانگیں پھیلا کر، نمک کے ڈھیلے پر سر رکھ کر سو جائے
اُس کا ذہن وقتی طور پر خالی ہو چکا تھا۔ وہاں پر بیٹھے بیٹھے، وقفے وقفے پر اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی چیز
چھوٹ گئی ہے، پیچھے رہ گئی ہے۔ مگر اُسے پتا نہیں چل رہا تھا۔ لکڑیاں جل چکی تھیں اور دہکتے ہوئے کوئلے آہستہ
آہستہ راکھ میں تبدیل ہونے لگے تھے۔ ریاض برابر خوبانیوں کی گٹھلیوں کو دانتوں میں توڑ توڑ کر ان کی گریاں کھا رہا تھا
گٹھلیوں کے چھلکے اب وہ ہتھیلی میں جمع کرتا، پھر جھک کر بجھتی ہوئی لکڑیوں پر پھونک مار کر راکھ کی موٹی جلد اڑاتا اور
ننگے کوئلے پر آہستہ سے چھلکوں کی ڈھیری لگا دیتا، جہاں پر وہ دیر تک دھواں دیتے رہتے۔ کمرے میں ان کا
دھواں پھیلتا جا رہا تھا۔ دو ایک بار سلطان شاہ نے باتیں کرتے کرتے ہاتھ اُٹھا کر ریاض کو ایسا کرنے سے باز
رکھنے کی کوشش کی، مگر وہ اپنے چچا کی بات پر دھیان دیے بغیر اپنے شغل میں مصروف رہا۔ بادام چھوڑ کر،
اسد نے بے خیالی سے سوچا، یہ خوبانی کی گریاں کیوں کھا رہا ہے؟

جب چائے کا دوسرا پیالہ بھی ختم ہو چکا تو وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"علی": سلطان شاہ بولا۔ "ریاض کے ساتھ چلے جاؤ۔"

"کہاں؟"

"گھر۔"

رات آدھی گزر چکی تھی اور ان کے پاس لالٹین تک نہ تھی۔ قصبے کی اونچی نیچی گھپ اندھیری گلیوں میں وہ
دونوں آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ اسد اگرچہ ریاض سے ایک قدم پیچھے تھا اور ریاض نے ایک مرتبہ بھی مڑ کر نہ
دیکھا تھا، مگر اسد کا یہ احساس دم بدم بڑھتا جا رہا تھا کہ نوجوان لڑکے کی آنکھیں اس پہ لگی ہیں —— کہ وہ ایک لحظے
کے لیے بھی ان کے احاطے سے باہر نہیں گیا ہے۔ ملائم نظر والی ان آنکھوں نے اندھیرے میں ایک چمک اور تندی
اختیار کر لی تھی جو اس کو چھیدے جا رہی تھی۔ یہ کون ہے؟ میرا ساتھی ہے؟ یا میرا دشمن ہے؟ مجھے کہاں لے جا رہا
ہے؟ گھر؟ اس نے ذہن پر زور دے کر اس قصبے کے نام کو یاد کرنے کی کوشش کی، مگر اس وقت نام اس کے ذہن
میں نہ آیا، حالانکہ ذوالفقار کے کیمپ سے روانہ ہونے سے پیشتر ہی اسد کو اس ان دیکھے قصبے کا نام معلوم ہو چکا تھا۔
اسد کی آنکھیں ہیت تار اپنے تاریک رہبر کی پشت پر لگی تھیں اور وہ ناہموار زمین پر اُلٹے سیدھے پاؤں رکھتا چلا جا رہا
تھا۔ ہو کے اس عالم میں یکایک اُسے محسوس ہوا جیسے وہ گمشدہ میں چلا جا رہا ہے کہ جیسے یہ کوئی دوسرا ملک اور
دوسرا قصبہ نہیں بلکہ گمشدہ گلیاں اور وہی اندھیرے خاموش مکان ہیں۔ اسد نے بے خیالی کے اس احساس کو گرانے
کی خاطر سر کو ایک بار آہستہ سے جھٹکا۔ ریاض کے سر کی پشت پر آنکھیں لگی تھیں جو اُسے تاڑ رہی تھیں۔ اس

کیفیت نے اُس کے اندر بے دخلی کے احساس کو تیز کر دیا، جیسے دنیا کے واقعات اپنے محور سے ذرا سا ہٹ
گئے ہیں اور چیزیں ذرا سی بے محل ہو گئی ہیں۔ جیسے کوئی اہم شے شاید چھوٹ گئی ہے۔

"علی": ریاض منہ موڑ کر بولا۔

اُس کی آواز پہ اسد اس طرح اُچھلا جیسے بجلی کی تار سے چھو گیا ہو۔ ایک بھونچالی لمحے میں دنیا کھٹ سے
گویا اپنے محور پر واپس آ گئی، اور باتوں کی پہچان وہاں سے نکل کر آئی ......

سب سے پہلی بات یہ کہ رات بھر میں پہلی بار ریاض نے منہ کھولا تھا۔ اُسے اُڑتی ہوئی سی حیرت
ہوئی کہ پہلے اُسے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا؟

آواز لڑکے کی آنکھوں کی مانند ملائم اور دوستانہ تھی: "تمہارے پاس موٹی چادر ہے؟"

"نہیں۔"

"رات کو سردی ہو جاتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" وہ جلدی سے بولا، "میں سو جاؤں گا۔" وہ لڑکھڑاتا ہوا گلی کا موڑ مڑ گیا۔

دوسری بات یہ کہ اب وہ بلاشک علی تھا۔ ذوالفقار نے اور امیر خاں نے اور سلطان شاہ نے مختلف
اوقات میں متعدد بار اُس کو پکارا تھا، مگر ریاض کی ملائم اور سرسری آواز نے جب اُس کا نام لیا: "علی" تو وہ چونک
اُٹھا، کیونکہ ریاض پہلا آدمی تھا جس کی نظر میں وہ، اسد کریم، اول و آخر علی مراد تھا۔ وہ جگہ بھی لامتناہی تھی۔ وہاں
رات کے اندھیرے میں اُلٹے سیدھے پاؤں رکھتے ہوئے وہ اُس آواز پر بالآخر اپنی شخصیت کی حد پار کر گیا۔
اب وہ اپنے وجود کے اُس گمنام خطے میں داخل ہوا تھا جو کسی کی ملکیت نہ تھا۔ ساری شام وہ ایک بے کچھ
مگر چاق و چوبند جانور کی مانند اس آنے والے خطرے کو محسوس کر کے پھڑکتا رہا تھا جب اُس کی زبان، جس نے
یہاں تک اس کا ساتھ دیا تھا، اُس کے نیچے سے سرک جائے گی اور وہ شناسائی کے دائرے سے نکل جائے گا۔ اُس
کے نام کی بے دخلی مکمل ہو چکی تھی۔

تاریکی میں لاشعوری طور پر اُس کی چال بدل گئی۔ اُس کے کندھوں کا جھکاؤ، اُس کی گردن کی اُٹھان، اُس
کی کمر، اُس کے بازو ہوا میں اپنی جگہ سے بے معلوم طور پہ گویا بال برابر سرک گئے۔ اس نامعلوم سرزمین پہ اس
نئے طور نے اُس کے دل میں اعتماد اور آزادی کا عجیب سا احساس پیدا کیا۔ اُس نے ریاض کے سر کی پشت پہ
دیکھا۔ آنکھیں وہیں تھیں، مگر اب ان سے اُسے خوف محسوس نہ ہوا۔ اس عجیب و غریب خطے پر سب
نوپید اور بھی کچھ نامعلوم تھا۔ اب وہ نئے سرے سے جوکس ہو رہا تھا......

تیسری بات یہ کہ اس قصبے کا نام باڑہ تھا۔ اُسے یاد آگیا۔ باڑہ سے باہر نکل کر وہ کوئی پون میل تک چلتے رہے۔ اس راستے میں اُترائی کم اور چڑھائی زیادہ پڑی۔ آخر وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پہ اُگے ہوئے جنگل میں پہنچ گئے۔ یہاں پہ گھُپ اندھیرا تھا اور درختوں میں ہوا چل رہی تھی۔ زمین پہ اُگی ہوئی جھاڑیوں کے بیچ ایک پتلا سا رستہ جاتا تھا جس پہ ریاض آسانی سے چلا جا رہا تھا۔ اپنے اس مختصر سے سفر کے دوران ریاض نے اُسے بتایا کہ سلطان اُس کا چچا ہے اور خشک میوہ جات کی ایک دکان کا مالک ہے جو باڑہ کی منڈی میں واقع ہے۔

"چچا کانفرنس کا آدمی تھا ساری عمر سے" اُس ملائم آواز نے بتایا "جب کانگریس کی حکومت نے کانفرنس کو دبا دیا تو چچا بددل ہو گیا۔ تین مرتبہ چھ چھ مہینے کی جیل کاٹ چکا ہے، مگر کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا۔ پکا آدمی ہے"

درختوں کا ذخیرہ پتلا ہوتے ہی اندھیرے میں سے ایک لمبی سی، اونچی نیچی شکل کی دیوار اُبھری۔ اسد کی آنکھیں اندھیرے سے شناسا ہو چکی تھیں، مگر پھر بھی اُسے اس دیوار کی صحیح نوعیت کا تعین کرنے میں دقت ہوئی دیوار کہیں سے اونچی اور کہیں سے نیچی تھی، جیسے کہ کسی بے ہنر شخص نے یا بہت سے بچوں نے مل کر تعمیر کی ہو۔ جہاں پہ دیوار ختم ہوتی تھی وہاں چوٹی کا یہ مختصر سا میدان بھی ختم ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ قریب پہنچ کر ریاض مڑا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسد نے اُچک کر دوسری طرف دیکھا۔ دیوار فی الواقع چوٹی کے کنارے پر بنی تھی۔ تاریکی کی وجہ سے وہ گہرائی کا اندازہ لگانے سے قاصر رہا، بس اتنا اُسے نظر آیا کہ دیوار کے ساتھ ہی ڈھلان شروع ہوتی تھی۔ کونے پر پہنچ کر وہ دونوں بیٹھ بیٹھ کر پہاڑ کی سیڑھیاں اُترنے لگے۔ دیوار ساتھ ساتھ نیچے کو جا رہی تھی۔ چند سیڑھیاں اُترنے کے بعد دیوار میں ایک شگاف نظر آیا۔ یہ شگاف ایک ڈھلوان صحن کا دروازہ تھا دیوار جس کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ دونوں اُس شگاف سے گزر کر احاطے میں داخل ہوئے۔ احاطہ پہاڑ کے پہلو میں بنی ہوئی قدرتی سیڑھیوں کی شکل میں اوپر سے نیچے کو جاتا تھا۔ احاطے کے ایک کونے میں ایک کمرہ بنا تھا۔ ریاض اور اسد اُچک اُچک کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کمرے کے دروازے تک پہنچے۔ کواڑ کے پاس ایک گائے بندھی تھی جو اُنہیں دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ تمہارا گھر ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"ہاں" ریاض نے کہا۔

ریاض نے کواڑ کھولا اور دونوں اندر داخل ہوئے۔ پچھلی دیوار پر ایک لالٹین ٹنگی تھی جس کی بتی بہت نیچی کر دی گئی تھی۔ مگر تاریکی سے آئی ہوئی آنکھیں اس دھندلکے میں بھی کمرے کی دیواروں اور بیشتر چیزوں کو دیکھنے

کے قابل تھیں۔

کمرے کا فرش پہاڑ میں بنی ہوئی تین چوڑی چوڑی پتھریلی سیڑھیوں پر مشتمل تھا جس سے کمرے کی قدرتی حد بندی ہو گئی تھی اور وہ ایک کی بجائے تین کمروں کا کام دے رہا تھا۔ ہر ایک سیڑھی چھ سے آٹھ فٹ چوڑے زینے والی اور تین فٹ کے قریب اونچی تھی۔ لمبائی کے رُخ پہ سیڑھیاں اسی زینے کی شکل میں چلتی، دیوار میں سے نکل کر باہر دور تک چلی گئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایک مقام پہ بے تدبیر دیوار چُن دی گئی تھی جس سے کمرہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک سیڑھی سے دوسری پر اُترنے کی آسانی کے لیے بڑے بڑے مکعب پتھر رکھے ہوئے تھے، چنانچہ کمرے کے اندر ایک سرے سے دوسرے تک جانے کے لیے چھلانگیں لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ پہلی سیڑھی پر دو آدمی سُرخ چھینٹ کے پتلے لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ ریاض اور اسد کے اندر داخل ہونے پر دونوں سونے والوں نے سر اُٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ دوسرے زینے پر چند چیزیں بکھری پڑی تھیں، جن میں کپڑوں کی ایک گٹھڑی، دو پھاوڑے، ایک کدال، موٹے رسّے کا بنا ہوا جال جو اس علاقے میں لکڑیوں کا لدا اُٹھانے کے کام آتا تھا، ایک مٹی کا لوٹا وغیرہ تھا۔ وہیں پہ ایک چمڑے کی پیٹی جو عموماً پتلون پہ باندھنے کے کام آتی ہے دیوار پہ لٹکی ہوئی اُن دوسری چیزوں کے درمیان عجیب سی دکھائی دے رہی تھی۔

تیسری سیڑھی پر دیکھنے سے آخر معلوم ہوتا تھا کہ یہ کمرہ ایک گھر ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک چولہا تھا جس پہ پتیلی رکھی تھی، چند مٹی کی رکابیاں پاس زمین پر پڑی تھیں۔ لوہے کی ایک گاگر، پانی پینے کا گلاس، اور متعدد گھریلو اشیا تھیں۔ ایک طرف مٹی کی دو تین بڑی بڑی مرتبان نما چاٹیاں رکھی تھیں۔ دوسری طرف کونے میں کوئی لحاف میں لپٹا ہوا سو رہا تھا۔ اُن دونوں کے آنے سے لحاف میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ اسد پہلی سیڑھی پر کھڑا رہا۔ ریاض نے نیچے جا کر لالٹین کی بتی اونچی کی اور پتیلی میں نظر ڈالی۔ "چاول ہیں" وہ سرسری لہجے میں بولا۔ اُس نے مٹی کی دو رکابیاں اُٹھا کر انہیں پانی سے دھویا، اور پتیلی سے گیلی گیلی رکابیوں میں چاول انڈیل کر پتھروں پہ پاؤں رکھتا ہوا اوپر چڑھ آیا۔ اُس نے ایک رکابی اسد کے حوالے کی اور زمین پر بیٹھ گیا۔

سفید چاول سرد ہو کر ایک دوسرے سے جُڑ گئے تھے اور وہ تودوں کی شکل میں اُن کی رکابیوں میں پڑے تھے۔ اسد اُسے ہاتھ سے توڑ کر کھا رہا تھا جب کہ ریاض پورے کے پورے تودے کو اُٹھا کر اُسے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر چبا رہا تھا۔ کھچڑی ہلکی نمکین اور بدمزہ تھی مگر اسد اسے اشتہا سے کھا رہا تھا۔ تاہم چند نوالوں کے بعد خشک چاول اُس کے حلق میں پھنسنے لگے۔ اُس نے رکابی زمین پہ رکھی اور نیچے جا کر پانی کا ایک گلاس پیا۔ پانی ٹھنڈا اور مزے دار تھا۔ خالی گلاس کو اُس نے دوبارہ گاگر سے بھرا اور لے کر اپنی جگہ پہ آ بیٹھا۔

"یہ کون ہیں؟" اسد نے سر کے اشارے سے پوچھا۔

"اپنے لوگ ہیں۔"

ریاض کی ملائم آواز اور ہر بات میں اُس کا انتہائی سرسری لہجہ اب اسد کے دل میں کھٹکنے لگا تھا۔ پہلے پہل جس آواز اور جس لہجے نے اُس کے دل میں ہلکا پن اور آزادی کا احساس پیدا کیا تھا، اب اُسی آواز اور لہجے کی یکسانیت اُسے خوفزدہ کرنے لگی تھی۔ وہ اب کھچڑی کے تودے کے اُس حصے کو کھا رہا تھا جس میں نمک بالکل نہ تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اُس نے جھنجھلا کر سوچا، کہ کھچڑی کے ایک حصے میں نمک موجود ہو اور دوسرے میں نہ ہو۔ بے مزہ خشک چاولوں کو چبا چبا کر انہیں لعاب سے تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اچانک اسد کو فضا میں ایک عجیب سی بے ترتیبی کا احساس ہوا۔ اُس کے بیٹھنے کا انداز اور تھا، اُس کے جبڑوں کی حرکت غیر مانوس سی تھی۔ کھانے کی چپ چپ آواز بہت اونچی تھی، یا اونچی اور نیچی تھی۔ اُس کے وجود کا پرانا، مانوس توازن بدل رہا تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے، وہ یہاں پر کیسے آن پہنچا ہے؟ اُس نے ریاض کی طرف دیکھا، پھر سوئے ہوئے لوگوں پہ نظر ڈالی۔ یہ کون لوگ ہیں، اُس نے سوچا، میں یہاں پہ کیا کر رہا ہوں؟ میرا طور، میرا طریقہ۔ اُس نے چاروں طرف نظر ڈالی کمرہ چار کونہ تھا، مگر نہ چوکور تھا نہ مستطیل۔ دیواریں فرش کے زینوں کے ساتھ بتدریج نیچے کو چلی جاتی تھیں اور ایک دوسری کے ساتھ مختلف زاویے بناتی ہوئی مڑتی تھیں، جس سے کمرے کی شکل مڑے تڑے گتے کے ڈبے کی مانند ہو گئی تھی۔

یہ میرا گھر ہے، اسد نے مایوسی سے سوچا۔ اب کب تک یہ میرا گھر رہے گا؟ جب ریاض نے گٹھڑی میں سے ایک موٹی چادر نکال کر اُسے دی اور خود بتی بجھا کر اپنی ماں کے قریب لیٹ کر سو گیا۔ تو پہلی سیڑھی پہ لیٹے لیٹے اسد نے قریب سوئے ہوئے دو آدمیوں کی بھاری سانس کی آواز سنی۔ یہ اپنے لوگ ہیں، اُس نے مایوسی سے دل میں دہرایا۔ اُس کا بدن تھکن سے چور تھا، نیند سے اُس کی آنکھیں جب بند ہوئیں تو چونک کر اُس نے ایک عجیب منظر دیکھا، جیسے اپنے تازہ تازہ چھوٹے ہوئے محور کا انکشاف اُس کی آنکھوں کے سامنے آگیا ہو۔ میں کون ہوں؟ اُس کے اندر سے ایک گہری مبہم آواز آئی — میں کیا ہوں؟

پھر تھکن اُس پہ غالب آ گئی۔

(۸)

صبح سویرے اسد اُٹھا تو تر و تازہ تھا۔ رات جو دو آدمی اُس کے قریب سوئے ہوئے تھے جا چکے تھے۔ ریاض کی ماں چولہے کے گرد کھٹ پٹ کر رہی تھی۔

"علی!" اُسے جاگتے دیکھ کر بڑھیا عورت تیز باریک آواز میں بولی، "میرا بیٹا ابھی آتا ہے۔ کچھ کھا پی لو۔ تم بیمار تو نہیں؟"

"نہیں۔" اسد نے کہا۔

"نیند میں تمہارا سانس رُک رہا تھا۔"

"ہاں۔"

"میں پہلے سنتی رہی کہ کس کا ہے۔ پھر میں اپنے بیٹے کے منہ پر ہاتھ پھیر کر اوپر آئی۔ پھر مجھے پتا چلا۔ میں نے کہا تھکاوٹ تمہارے سینے پہ بیٹھ گئی ہے۔ میں نے تمہارے منہ پر بھی ہاتھ پھیرا تھا۔" وہ رُکی، "تمہیں پتا چلا تھا؟"

"نہیں۔" وہ بولا، "میرے سانس میں خرابی ہے۔"

"تم سیدھے پڑے تھے۔ سیدھے سونے سے گلا بند ہو جاتا ہے۔ کیا خرابی ہے؟ تمہیں دورہ تو نہیں پڑتا؟"

"ہاں۔"

وہ کبڑی سی پستہ قد، قدیم چہرے والی بڑھیا ایک لمحے کو اُس کے سامنے رُک کر اپنی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ بڑھیا کی نظروں میں تشویش تھی۔ ریاض کے چہرے پر، اُس نے بے خیالی سے سوچا، اپنی ماں کا کوئی نقش نہیں۔ بڑھیا اب کونے میں ایڑیاں اٹھائے، چھائی کے منہ میں جھکی اس کے پیندے میں ہاتھ مار رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ وہاں سے ایک مٹی کا کوزہ نما برتن لیے نمودار ہوئی۔

"یہ لو۔" وہ کوزے کے منہ پہ بندھا ہوا کپڑا کھولتے ہوئے بولی۔ "شہد سے سینہ صاف ہو جاتا ہے۔" اُس نے سرعت سے کوزہ ذرا سا انڈیلا اور سیدھا کر لیا۔ شہد ایک بہت سے بلبلے کی شکل میں اسد کے دودھ بھرے گلاس میں گرا اور اُس کا باریک تار ہوا میں لٹکنے لگا۔ ریاض کی ماں نے اُسی سرعت کے ساتھ شہد کا تار اپنی انگلی پہ لپیٹا اور انگلی اسد کے منہ کے آگے بڑھا دی۔ اسد نے ایک لمحے کو جھجک کر اُس خشک لکڑی نما انگلی کو دیکھا، پھر اُس نے منہ کھول کر شہد لگی انگلی چوس لی۔

"میں اس کو منہ نہیں لگاتی۔ مجھے تکلیف دیتی ہے۔ مگر سو بیماریوں کی دوا ہے۔ ریاض کے باپ کو بھی سانس کا مرض تھا۔ اُسے شہد سے افاقہ ہوتا تھا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس مرض سے کوئی نہیں مرتا۔ بس لمبا مرض ہے، دُکھ دیتا رہتا ہے۔ سانس چھوا۔ تمہیں دورہ پڑا ہوا ہے؟"

"ہاں۔" اسد نے کہا، "مگر سخت نہیں۔ گزر جائے گا۔"

وہ شہد ملے گرم گرم دودھ کو گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔ بڑھیا نے مکئی کی بھربھری روٹی کا ایک ٹکڑا، جو اُس نے توے پہ ڈال کر ابھی ابھی گرم کیا تھا، اُس کے ہاتھ میں لا تھمایا۔ وہ روٹی کو دانتوں سے کاٹ کر دودھ کے ساتھ کھانے لگا۔

"میرا بیٹا اپنے چچا کی طرف گیا ہے۔" ریاض کی ماں اُس کے قریب زینے پر بیٹھ کر اُسے بتانے لگی۔ "اندھیرے اندھیرے ان دو آدمیوں کو لے کر چل پڑا تھا۔ یہ سرینگر سے آئے ہیں۔ دن دن میں جانے سے بچتے ہیں۔ مگر سلطان کا گھر محفوظ جگہ پہ ہے۔ سینکڑوں آدمی ہر وقت پھرتے رہتے ہیں، شہر کے اندر کوئی خطرہ نہیں۔ ہمارا گھر اکیلی جگہ پر ہے، دُور سے جاسوسی ہو سکتی ہے۔ مگر خیر۔ سلطان کہتا ہے وہ اب پکڑا گیا تو پھر باہر نہیں آئے گا، سارا کام خراب ہو جائے گا۔ میں کہتی ہوں خیر۔ میں ریاض کے باپ کو منع کیا کرتی تھی۔ ریاض کا باپ سلطان کا بڑا بھائی تھا۔ دونوں بھائی حکومت کے مخالف تھے۔ اصل آدمی تو ریاض کا باپ تھا، سلطان تو چھوٹے بھائی کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے لگا رہتا تھا۔

اب سردار بن گیا ہے۔ میں کہتی ہوں خیر۔ ریاض کا اپنا خون ہے۔ ان کے خاندان میں بغاوت کی رسم ہے۔ جب میرے باپ نے میری شادی تمہارے خاندان میں سوگ پڑ گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے عبداللہ اپنی بیٹی باغیوں کو بیاہ کر دے رہا ہے۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ایک دن ایسا غائب ہوا کہ پھر نہ آیا۔ کوئی کہے چھپ گیا ہے، کوئی کہے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ میں نے مہینوں تک ایک ایک پتھر کو ڈھونڈا۔ پولیس کے پاس گئی۔ تحصیلدار کے پاس جاتی رہی۔ سلطان چھ مہینے کاٹ کر واپس آ گیا۔ ریاض کا باپ نہیں آیا۔ دس برس ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے ابھی اس دروازے سے داخل ہو گا اور یہاں آ کر میرے پاس بیٹھ جائے گا۔ یہ گھر اُس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔" وہ سانس لینے کو رُکی۔ اسد نے گلاس خالی کر کے زمین پہ رکھا اور بوڑھی عورت کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا نشان تک نہ تھا، صرف زندگی کی خفیف سی ہراسانی کے آثار تھے۔ "جب ریاض جوان ہوا تو اپنے چچا کے ساتھ لگ گیا۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ مردوں کے ساتھ تو جھگڑا ہو سکتا ہے، بیٹوں کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے۔ مرد جائیں بھی تو نام چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ گھر اُس کے نام سے آباد ہے۔ بیٹے چلے جائیں تو کچھ بھی چھوڑ کر نہیں جاتے۔ پھر اب اتنی عمر کے ساتھ مجھے سمجھ آئی ہے۔ میرا بیٹا اپنے باپ کی طرح اور دادا کی طرح مزدوری کرے گا، اور ایک روز میری طرح بوڑھا ہو جائے گا۔" عورت نے ویران نظر سے گھر کی دیواروں کو دیکھا۔ "پھر کیا کرے گا؟" اُس نے پوچھا۔

اسد نے سر ہلا کر اُس کے سوال کا جواب دیا۔

"پھر کیا کرے گا؟" بڑھیا نے دُہرا کر پوچھا۔ "میں کہتی ہوں خیر، بغاوت اِس کے خون میں ہے، مزدوری کرنے کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔ تم بھی اِسی کام کے لیے یہاں آئے ہو، دُوسری طرف سے۔ مجھے معلوم ہے۔ میرے گھر میں بیٹے کی طرح رہو۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں کتنی عمر سے سانس کا مرض ہے؟"

"دو تین سال سے ہے۔" اسد نے کہا۔ "میں ایک بوٹی کی تلاش میں ہوں جس سے مجھے افاقہ ہوتا ہے۔"

"کون سی بوٹی؟"

"نام مجھے معلوم نہیں۔ مگر مجھے اس کی پہچان ہے۔ ہاتھ کی شکل کا۔" اُس نے پانچوں انگلیاں پھیلا کر بڑھیا کو دکھائیں۔ "اس کا پتا ہوتا ہے۔ اس علاقے میں ملتی ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ یہ علاقہ جڑی بوٹیوں کے لیے مشہور ہے۔ ضرور مل جائے گی۔ فکر نہ کرو۔"

"میرے پاس ایک عورت کا پتا ہے۔ اُدھر سے لے کر آیا ہوں۔"

"کہاں رہتی ہے؟"

"چارکوس۔"

"ہاں۔ یہی علاقہ ہے۔ ریاض تمہیں لے جائے گا۔ یا میں لے جاؤں گی۔"

وہ باتیں کرتے کرتے اُوپر دروازے میں آکھڑے ہوئے تھے۔ سُورج نکل آیا تھا۔

"یہاں سے چار کوس پر ہے؟" اسد نے ہنس کر پُوچھا۔

"نہیں۔ دُور ہے۔ مگر اس کے آس پاس جتنے گاؤں ہیں اُن میں ہر ایک سے چار کوس پہ واقع ہے۔ جیسے زمین ناپ کر بنایا ہو۔ کسی حکیم کی عورت ہے؟"

"نہیں۔ ایک شخص اُدھر جڑی بُوٹیوں کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ اُس کی عورت ہے۔"

اسد کے دل میں دُور کہیں ایک کھٹکا سا ہُوا، اور اُسے حیرت ہُوئی کہ قید میں اُس کی جگہ لینے والے آدمی کا کھٹکا ابھی وہاں موجود تھا۔

سامنے والے پہاڑ سے سُورج اُونچا ہوگیا تھا اور صُبح سویرے کی دُھوپ اُن کی اپنی پہاڑی کی پُشت پہ پڑ رہی تھی۔ جہاں پہ وہ کھڑے تھے وہاں سے اُن کی روشن ڈھلان نیچے ایک تنگ کھّی میں جاکر ختم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روشنی اور رنگ کی ایک وسیع چادر تیزی سے تنتی ہوئی جاکر سامنے والے پہاڑ کی سیاہ عمودی دیوار کے دامن میں کھُب گئی ہے۔ پہاڑی پہ دُور دُور کل پانچ یا چھ مکان تھے جن میں سے بیشتر کے گرد چھوٹے چھوٹے پتھروں کی ادھ بنی دیواریں تھیں اور اُن کی حدُود کے اندر اور باہر دو دو، ایک ایک ننھے ننھے کیاری نما کھیت تھے۔ یہ کھیت چوکور میدانی کھیتوں کے برعکس گول تکونے، پانچ کونے اور ایسی ہی مختلف بے قاعدہ شکلوں کے تھے۔ اُس وقت دُور سے اُنہیں دیکھ کر اسد کو اچانک خیال آیا کہ رات کو گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے اُسے فضا میں جس بے ترتیبی کا احساس ہوا تھا وہ اِس زمین سے پیدا ہُوئی تھی۔ اِس زمین کی شکل تعمیر کرنا آدمی کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ یہاں اِس کی جو شکل دستیاب ہوتی تھی، زندگی وہی صُورت اختیار کرلیتی تھی۔ وہاں کھڑے کھڑے اُسے وہ ٹیڑھا میڑھا گھر نما کمرہ، بُوڑھی عورت کی کُبڑی شکل، ٹوٹی پھُوٹی ہڈیوں والے پہاڑ، ٹیڑھے میڑھے کھیت اور گھُلے ہُوئے راستے، فطرت کے عین مطابق اور مناسب معلوم ہُوئے۔ اُس کی سانس اب آہستہ آہستہ درُست ہو چلی تھی۔

ریاض اُس کے لیے لکڑیاں کاٹنے کے اوزار لے آیا تھا۔ ایک کلہاڑا، اور رسّے کا ایک جال۔

"سُوکھی لکڑیاں اِدھر اُدھر سے اکٹھی کرتے رہنا۔ دس بارہ آنے تک لدا ایک جاتا ہے۔ بعد میں شاید کٹڑوں میں نوکری مل جائے۔ قسمت کی بات ہے۔ نوکری میں فائدے بھی ہیں، نقصان بھی ہیں۔ خیر، بعد میں جو فیصلہ ہو۔ ابھی یہ کام شروع کرو۔ سب سے اچھا کام ہے۔" ریاض اُس کو ایک رسّی کی بنی ہُوئی چپل دیتے ہُوئے بولا۔ "یہ چپل اِس علاقے کے واسطے اچھی ہے۔ وہ جُوتا اُتار دو۔ چپل کا تلا گدے دار ہے، پتھروں پر

چلنے کے کام آتا ہے۔ تھکاوٹ بھی نہیں ہوتی۔ پہلے ذرا ٹھنڈ لگے گی پھر پیر پکے ہو جائیں گے۔"

ریاض نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ چچا کے گھر سے کھاپی آیا ہے۔

"کھاپی آیا ہوں۔ کھاپی آیا ہوں۔ کیا کھاپی آئے ہو؟" وہ بولی۔ "وہاں کیا ملتا ہے۔ چا کے پیالے پہ سارے بادام ترکھا جاتا ہے آپ، اور دُوسروں کو دیتا ہے چا کے پیالے۔ اپنی بیوی تک کو کنجوس کا مانتا ہے۔ میں کہتی ہوں خیر، تمہارا چچا ہے اور تمہارا کون ہے۔ مگر تم جوان ہو رہے ہو۔ دُودھ کے بغیر کیا بنے گا تمہارا۔ گائے میں نے اپنے لیے تو نہیں رکھی۔ تمہارے باپ کی تھی، اب تمہاری ہے۔" وہ اسد کی جانب مُڑ کر بولی، "اصیل گائے ہے۔ بوڑھی ہوگئی ہے مگر دودھ نہیں سکھایا۔ ہماری ضرورت کے لیے اب بھی دے دیتی ہے۔" وہ پھر ریاض سے مخاطب ہُوئی، "علی نے بھی پیا ہے۔ میں نے شہد نکال کر دی ہے۔ اِس کو سانس کا مرض ہے۔ میں نے بتایا ہے اِس مرض سے کوئی نہیں مرتا۔ تمہارے باپ کو بھی تھا۔ لو پیو۔ بیٹھ جاؤ۔"

ریاض نے دودھ کا گلاس لے کر ایک طرف رکھ دیا اور اپنا بازو اُٹھا کر اُس کی دو ٹوٹی ہُوئی رسّیوں کو گانٹھیں دینے لگا۔ اُس کی ماں چند لمحوں تک اپنے ہاتھ کمر پہ رکھے، سرزنش کے انداز میں کھڑی اُسے دیکھتی رہی، پھر مایوس ہو کر سر دونیت سے اِدھر اُدھر پھرنے لگی۔ اسد نے ریاض کو پہلی بار دن کی روشنی میں قریب سے دیکھا۔ پھُولے ہُوئے نتھنوں اور ملائم نظروں والا چہرہ، اچھے دیکھ کر پچھلی رات کو اسد کو محسوس ہوا تھا کہ جیسے کسی نے دو ایک مختلف چہروں کے نقوش لے کر اِس ایک چہرے میں جمع کر دیا ہو، اب اُسے ایک عام کشمیری مزدور کا چہرہ دکھائی دیا۔ اسد نے خیال کیا کہ اِس سے پہلے، شاید اسی جگہ پہ بیٹھ کے، اسی طور، اِس لڑکے کا باپ اپنی مشقت کا صلہ، کئی کئی ایک روٹی اور دودھ کا ایک گلاس وصُول کرتا ہوگا۔ اُس کا چہرہ بھی اسی شکل کا ہوگا، بے قاعدہ، خالقت کرنے والا، اور معمولی! اور اُس سے پہلے اِس کے باپ کا، اور اُس کے باپ کا۔ اسد نے سر موڑ کر کمرے میں نظر دوڑائی۔ اِس رواں دواں وراثت کے درمیان حیرت ناک طور پر اپنا توازن قائم کیے، یہ برگ مُفلسی کے ایک ہی مقام پہ کھڑے تھے۔ یہ لڑکا، اُس نے سوچا، اِس توازن کو توڑنا چاہتا ہے۔ اِس لڑکے کے اندر ایک خواہش حرکت کر رہی ہے اور اِس حرکت کو شاید یہ سمجھتا بھی نہیں، مگر اپنے خون میں اِس کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ ذوالفقار کی طویل تقریروں کے باوجود جس بات کی سمجھ اسد کو نہ آئی تھی، اِس گھر بدمست میں بیٹھے بیٹھے خود بخود وہ بات اُس کے دل میں کھُلنے لگی۔ اُس وقت پہلی بار اسد کو محسوس ہُوا کہ اُس کے، اور اِس بے ہوار پُرخطر لڑکے کے درمیان ایک بے واسطہ رشتہ ہے۔ اُس نے اپنی چپل اُتار کر ریاض کی دی ہُوئی رسّے کی چپل پہن لی اور ریاض کے ساتھ ہی اُٹھ کر باہر نکل آیا۔

پہاڑ کے سرپہ عجیب گھر مندوں کی مانند ساتھ ساتھ رکھی گئی پہاڑیوں کی گرتی اور اُٹھتی ہوئی، ٹوٹی پھُوٹی بیہر

دُور تک چلی گئی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جب وہ دو پہاڑوں کو عبور کر کے تیسری کے دامن میں پہنچے تو سورج سر پہ آ چکا تھا۔ وہ دونوں ایک چٹان کے سایے میں جا بیٹھے۔ وہاں سے اُنہیں اپنی گائے جو اُن کے عقب میں چلی آ رہی تھی، پچھلی پہاڑی کی چوٹی کے قریب گھاس پہ منہ مارتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"اُس ڈھیری کے پیچھے سڑک جاتی ہے۔" ریاض ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا۔ "سڑک کے دونوں طرف کیمپ ہے۔ ایک کراس تک جاتا ہے۔ اِس طرف بارڈر ہے۔" اُس نے دُوسری جانب اشارہ کیا۔ "یہاں سے فوج آتی جاتی ہے۔ یہی بڑی سڑک ہے۔ تمہارے پاس نقشہ ہے؟"

اسد نے جلدی سے اپنی جیبیں ٹٹولیں، پھر معصومیت سے بولا: "گھر رہ گیا ہے۔" ریاض اُس کا مذاق سمجھ کر ہنس پڑا۔ اسد کی نظریں اُس کے چہرے پر لگی تھیں۔ اُس نے پہلی بار ریاض کو ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے ریاض کا چہرہ بدل گیا تھا۔ ایک لمحے کے تبسم نے اُس چہرے کے بکھرے ہوئے نقوش کو گویا یک جان کر دیا تھا، جیسے کہ اُن کے عقب میں کوئی پوشیدہ مقام ہو جس پہ بس اسی قدر نازک دباؤ سے کھٹ کر کے چہرے کے نقش اپنی اپنی مناسب جگہ پہ آ بیٹھے ہوں اور اُن کا کھویا ہوا ربط اُنہیں واپس مل گیا ہو۔ ریاض کے چہرے کو اس طور بدلتے دیکھ کر اسد کے دل کو ایک بے نام سی آسودگی کا احساس ہوا، جیسے اُس کے اپنے اندر کسی حصے میں ربط کا فقدان پیدا ہو گیا ہو اور ریاض کے متبسم چہرے نے اس کے ایک چھوٹے سے کونے کو پکڑ کر اُسے سیدھا کر دیا ہو۔

"میرا مطلب ہے۔" ریاض بولا، "تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں۔ مَیں اس علاقے کو جانتا ہوں۔" اسد نے کہا۔ "نقشے کی ضرورت نہیں۔"

"کیسے؟"

"مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مَیں پہلے یہاں آ چکا ہوں۔"

"کب؟"

"ایک سو برس پہلے۔" اسد بولا۔ "تمہیں پتا ہے کئی کئی پُشت پہلے کے واقعات ہمارے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں۔"

"نہیں۔" ریاض کے چہرے پہ گرہ گر کے آثار تھے۔ "چل۔" اُس نے بات بدلی۔ "جیب میں دس بارہ آنے ہر وقت ہونے چاہئیں۔ لکڑیاں نہ بِکیں تو بیچ کر آؤ، ثبوت موجود ہو۔ کبھی کبھی پکڑ کر خواہ مخواہ تلاشی لے لیتے ہیں۔"

اسد کا جی کر رہا تھا کہ وہ لڑکا ہنسے، یا کوئی اور بات کرے۔ اُس کے چہرے پہ حیرت یا تبسم یا پریشانی

کے آثار ہوں۔ وہ اُس کے ساتھ اپنے آپ کی، کلنڈرے پن کی، دوستی کی، وقت گزاری کی باتیں کرے۔

"ہو سکتا ہے۔" اسد نے کہا۔ "کہ چودہ پُشت پہلے میرے آبا میں سے کوئی یہاں پہ رہتا ہو۔ یا ادھر سے گزرا ہو۔"

ریاض ہنسا۔ "ہاں۔" اُس نے کہا۔ "خیر۔ گائے تمہارے ساتھ مل جائے گی۔ اصیل ہے۔ دن ڈھلنے سے پہلے شہر آ جانا۔"

"تم کیا کرتے ہو؟" آخر اسد نے پوچھا۔

"ادھر اُدھر کے کام۔" ریاض وہاں سے اُٹھتا ہوا بولا۔

وہ پہاڑی کے دامن کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پتھروں میں غائب ہو گیا۔ اسد وہیں بیٹھا اُس پہاڑی کو دیکھتا رہا جس کے پیچھے سے سڑک جاتی تھی اور فوج کا پڑاؤ تھا۔ اُس کا دل پھر خالی ہونے لگا تھا۔ اُس نے سورج کے مقابل آنکھیں اُٹھا کر گائے کو دیکھا جو آہستہ آہستہ نیچے اُترتی آ رہی تھی۔ ان پُرخطر پہاڑیوں کے بیچ، اسد نے ویرانی سے سوچا، اب اُسے ایک عرصہ بسر کرنا تھا۔ اِس عرصے کا اختیار اُس نے اپنے ہاتھ سے کھسکتا ہوا محسوس کیا۔ یاسمین کا متبسم چہرہ ایک لمحے کے لیے اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرا جس کے سارے نقش یک جان تھے۔

★ ★ ★ ★ ★

"دیکھ کے چل بڑی، گر جائے گی، چل چل۔ اب کھڑی کیوں ہو گئی ہے؟ ساری عمر ان پہاڑوں میں دھکے کھاتی رہی ہے، اب چلنا بھی نہیں آتا؟ تجھ سے تو بکریاں اچھی ہیں۔ اب کیوں کھڑی ہو؟ گھر جانے کو دل نہیں کرتا؟ ڈیں ڈیں ڈیں ...."

گائے کا نام سندری تھا اور وہ اپنا لمبوترا بے تاثر منہ اُٹھائے بے بسی سے اُسے دیکھتی، اور آنکھیں نیم وا کیے ہولے ہولے اُونگھتی جا رہی تھی۔ سُورج سر پہ آ چکا تھا اور اب گھر لوٹنے کا وقت تھا۔ اسد سندری کے گلے میں لپٹا ہوا رسہ پکڑے اُسے کھینچتا ہوا واپس لوٹ رہا تھا۔ وہ سڑک کے اُس حصے سے گزر رہے تھے جہاں دُوسرے کنارے پہ آہنی خاردار تار کی باڑ سڑک کے ساتھ ساتھ دُور تک چلی گئی تھی۔ باڑ کے دُوسری طرف ایک میدان میں جس کے ارد گرد بیسیوں فوجی

گاڑیاں سیدھی قطاروں میں کھڑی تھیں، چند فوجی جوان بنیانیں اور نیکریں پہنے والی بال کھیل رہے تھے۔

"علی علی علی!" اسد نے سرزنش کی۔ "سندری! کوڑمغز۔ روز بتاتا ہوں میرا نام اسد ہے۔ علی نہیں۔ اسد کریم سُنا؟ علی علی کرتی رہتی ہو۔ چلو چلو چلو۔"

گائے نے مُنہ کھولے بغیر مختصری ریں کرکے جواب دیا۔ دُودھ، پنیر اور گوشت کے خالی ڈبوں، شراب کی خالی بوتلوں اور پھٹے ہوئے پُرانے فلمی رسالوں سے اٹی ہوئی زمین پر وہ دونوں پچکے بچاتے ہوئے کچھ دُور تک سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے رہے پھر وہاں سے ایک پہاڑی راستے پر اُتر کر گھر کی جانب ہولیے۔ روزمرہ کی طرح اسد نے چند معمولی اِدھر اُدھر کی باتیں ذہن نشین کرلی تھیں۔ اُس کی پُشت پر لٹکتا ہوا جھولا چھوٹی بڑی خشک لکڑیوں سے ایک چوتھائی بھرا تھا۔ ان لکڑیوں میں سے ایک پہ، جس کی چھال نرم اور ہموار تھی، چند اُلٹی سیدھی مبہم لکیریں پڑی تھیں جو اسد نے یادداشت کے طور پہ ناخن سے اُس پہ بنائی تھیں۔ اُس کا صُبح بھر کا کام ختم ہوچکا تھا۔

گھر کی پچھلی دیوار میں سے بنے ہوئے گائے کے مخصوص ہموار راستے کی طرف سے اسد گھر میں داخل ہوا۔

گائے کو باندھ کر اُس نے ریاض کی ماں سے روٹی لے کر کھائی پھر جھولا اُٹھا کر کندھے پر ڈالا اور "شہر" کی جانب چل پڑا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے اُس کا جھولا بھر گیا، مگر اس طرح کہ ناخن کی لکیروں والی لکڑی ہمیشہ اُوپر رہی۔ سُورج نے تین چوتھائی آسمان سر کرلیا تھا۔ قصبے میں داخل ہوتے ہوئے وہ جگہ جگہ پر متلاشی نظروں سے دیکھتا گیا۔ ریاض اُس کو کہیں پہ نظر نہ آیا۔ تین چار مقام پہ اُس کو واقف چہرے نظر آئے، جن سے اُس کی سرسری سلام علیک ہوئی۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے وہ کسی نہ کسی وقت پہ مل چکا تھا۔ کبھی ایک کے گھر، کبھی دُوسرے کے گھر، دو دو تین تین کے گروہوں میں، کسی دکان پر یا ہوٹلوں میں۔ ہر دُوسری یا تیسری سہ پہر کو یا شام میں، چائے کے پیالوں اور کڑوے کشمیری تمباکو کے دھوئیں کے غبار میں، لالٹینوں کی مدھم روشنی میں باتیں کرتے ہوئے اور سُنتے ہوئے —— زیادہ تر سُنتے ہوئے —— اسد نے بیسیوں اجنبی چہروں سے واقفیت حاصل کی تھی، ایسے چہرے جن میں سے بیشتر کی اُس کو صرف شکل کی پہچان تھی، نام اُس کے حافظے سے نکل چکے تھے۔ ہر روز یا دُوسرے دن اپنے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد شہر میں کسی نہ کسی جگہ پہ ریاض سے اُس کی مُلاقات ہوجاتی۔ وہاں سے وہ چلتے پھرتے ہوئے کسی جگہ پہ جا پہنچتے۔ اس آبادی میں ایسی چار پانچ جگہیں موجود تھیں جن کے مالک بظاہر بے خطرہ مول لینے کو تیار تھے۔ وہاں پہ پھیر یک ایک دو دو کرکے لوگ آتے: نوجوان، ادھیڑ عُمر، بُوڑھے۔ کوئی کوئی بچوں کو ہمراہ لیے ہوتا۔ یہ لوگ وہاں گھنٹہ آدھ گھنٹہ رُکتے، چائے پکی ہوتی تو پیالہ پیتے، حال احوال پُوچھتے، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے، اور اُٹھ کر چلے جاتے۔ باتیں عموماً روزمرہ کی، شادی موت کی، بیماری و پیدائش کی، کمائی اور افلاس کی ہوتیں۔ ہر اچھی بُری بات کا اختتام خدا کے

شکر پہ ہوتا۔ بیچ بیچ میں ملکی حالات کی، سیاست اور جنگ کی بات بھی آجاتی۔ اسد علی کے رُوپ میں بیٹھا اُن کی باتیں سُنتا، بیشتر وقت اُن کے خیالات کی رَو جانچتا، معلومات حاصل کرکے اُنہیں دماغ کے کونوں میں ذخیرہ کرتا، اور کبھی کبھی بیچ بیچ میں گفتگو کو ایک خاص نہج پر لانے کی خاطر کوئی ایک آدھ بات ہُشیاری سے، احتیاط سے، کسی خاص رُخ دیے سے کردیتا۔ اِس زمانے میں پہلی بار وہ دُوسرے لوگوں کے خیالات، اُن کے احساسات، اُن کے رویّے کو کنٹرول کرنے کے اطوار سیکھ رہا تھا۔ چند ہفتوں کی جسمانی محنت اور اُس خطّے کی مخصوص آب و ہوا نے اُس کی صحت پہ اچھا اثر کیا تھا۔ اُس کا سینہ صاف ہوگیا تھا اور کئی ہفتوں سے اُس کی سانس خراب نہ ہوئی تھی۔ روزمرہ کے طویل پہاڑی سفر اور خشک پھلوں اور دُودھ کی خوراک نے اُس کی کمر اور ٹانگوں کو مضبوط بنادیا تھا اور کچھ عرصہ پہلے اُس کے بدن نے جو بدسلوکی سہی تھی اُس کے اثرات غائب ہوتے جارہے تھے۔ صرف اُس کی رُوح پہ کہیں کہیں اُس کے نشان ابھی باقی تھے۔ ان گھروں کے چھوٹے چھوٹے مدھم مدھم کمروں میں سیدھے سادے، مفلوک الحال مزدوروں، مسجد کے درویشوں، طالب علموں، دکانداروں کے ساتھ جب وہ بیٹھتا، یہ جانتے ہوئے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی مخبر ہوسکتا ہے، اِس کھیل کا ایک وار میں خاتمہ کرسکتا ہے، بس ایک بار کواڑ کھلنے کی دیر ہے اور تڑاخ —— اِس جیتے جاگتے ہوئے ہر دم حاضر خطرے کا احساس لیے جب وہ اُن کے ہمراہ بیٹھتا اور رفتہ رفتہ کوئی مختصر سی بات کرکے گفتگو کے دھارے کو اپنی خواہش کے مطابق رواں کرتا، تو اُس کے اندر اُترے ہوئے بید کے اُن نشانوں پہ میٹھا میٹھا درد ہوتا اور اُس کے دل میں ایک عجیب نشہ اور قوت کا احساس پیدا ہوتا۔ یہ عمل اُس کی عُمر کے ایک دور کی مانند تھا جس میں وُہ نیم رضامندی سے نہیں بلکہ عمداً داخل ہوا تھا اور اس کی تگ و دو سے کم و بیش لطف اندوز ہورہا تھا۔

تاہم قدم قدم پہ اُس کے دل کی قید کے آثار ابھی قائم تھے۔ خوشی محمد کے جرم اور سزا کا تصوّر اُس کے ذہن کو، اور یاسمین کی یاد اُس کے دِل کو دُکھتے رہتی تھی، اور اپنے کام کے عناصر سے بتدریج شناسائی حاصل کرنے کے باوجود وہ اِس علاقے کے سرو پا کو محض ریاض کی مانوس شبیہہ کے واسطے سے پہچانتا تھا۔ اِس بے نقش سرزمین پہ وہ اوّل و آخر ایک اجنبی مسافر تھا، چنانچہ اُس روز جب ریاض اُسے نظر نہ آیا تو وہ اپنی پُشت پہ لکڑیوں کا گٹھ اُٹھائے اُٹھائے بازار سے گزر گیا۔ اُس کو کوئی گاہک نہ ملا۔ کوئی گاہک مل جاتا تو چار چھ آنے زیادہ مل جایا کرتے۔ پھر وہ لکڑیاں گاہک کے گھر چھوڑنے کے لیے جاتا۔ لکڑیاں پھینک کر وہ پینے کے لیے پانی مانگتا اور اسی بہانے چند منٹ رُک کر دو چار باتیں کرلیتا۔

گاہک سے مایوس ہوکر اسد نے لکڑیوں کے ٹال پر اپنا گٹھا جا گرایا۔ وہاں سے اُسے جو اونے پونے دام ملے اُس نے جیب میں ڈالے اور ناخن کے نشان والی لکڑی گٹھے سے کھینچ کر چھڑی کے طور ہاتھ میں لٹکائے واپس ہولیا۔ واپس

آتے ہوئے راستے میں آخر ایک تمباکو والے کی دکان کے اندر ریاض اُس کو نظر پڑا۔ لمبی اور تنگ گلی نما دکان کے نیم اندھیرے میں چند لوگ دیوار کے ساتھ چٹائی پہ بیٹھے تمباکو پی رہے تھے۔ اسد جا کر اُن کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دو آدمی اور ایک بچہ اُٹھ کر چلے گئے تو وہاں پہ ریاض اور اسد کے علاوہ صرف ایک اور شخص بیٹھا رہ گیا۔ دکاندار اُٹھا اور انہیں چھوڑ کر باہر دکان کے سامنے پڑے ہوئے سٹول پر جا بیٹھا۔ جب وہ سٹول پر بیٹھ کر حقے کے دو کش لگا چکا تو اُس نے دکان کے اندر کی طرف مُنہ کر کے تمباکو کا دھُوں چھوڑا۔ ریاض کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے کرتہ اُٹھا کر شلوار میں اُڑسا ہوا ایک اخبار نکالا۔ یہ اُس روز کا چھپا ہوا ایک کشمیری روزنامہ تھا۔ یہ تازہ اخبار اس بات کی علامت تھا کہ یہ شخص اُسی روز سرحد پار کے لیے روانہ ہونے والا تھا اور اخبار کو ثبوت کے طور ساتھ لیے جا رہا تھا۔ اخبار کے پہلے صفحے پہ نیلے اخباری رنگ میں چھپی ہوئی چند بڑی بڑی تصویریں تھیں۔ اسد نے جلد جلد اخبار کے ورق اُلٹے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے بنیئے کی مری کے اندر چھپائی ہوئی چھوٹی سی دو رنگی پنسل کو کھسکا کر باہر نکالنے لگا۔ اخبار کے ایک اندرونی صفحے پر اُسی نیلے رنگ میں ایک اشتہار چھپا تھا۔ اسد نے پنسل کا نیلا سکہ اشتہار کی ہلکی نیلی زمین پر چلایا اور لکڑی کے ٹکڑے پر سے دیکھ کر اُسی شکل کی لکیریں کھینچ دیں، اس طرح سے کہ پہلی نظر میں دیکھنے پہ نظر آئیں مگر غور سے دیکھنے پر اُن کا نقش صاف دکھائی دے جائے۔ یہ کام ختم کر کے اُس نے اخبار دوسرے شخص کے حوالے کیا اور اپنی پنسل دوبارہ بنیئے کے سوراخ میں ڈال کر دُور تک کھسکا دی۔ دوسرے شخص نے اخبار کو تہہ کر کے اُسے شلوار میں اُڑسا اور کوئی بات کیے بغیر اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ اسد نے لکڑی کو توڑ کر اس کے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے اور اُن کو ہاتھوں میں بھر کر دکان کے باہر لے آیا۔ وہاں پر اُس نے اُنہیں زمین پہ ایک چھوٹی سی ڈھیری کی شکل میں ترتیب دیا اور دکان والے سے ماچس لے کر اُسے آگ لگا دی۔ جب لکڑی جلنی ختم ہو گئی اور کوئلے دہکنے لگے تو دکاندار نے حقے کی ٹوپی اُٹھائی، اُس میں تازہ تمباکو دھرا اور اُس پر کوئلے جما کر کش لگانے لگا۔ اسی دوران میں غلام اُن سے آملا تھا۔ وہ اور ریاض باتیں کر رہے تھے۔ جب حقہ چالو ہو گیا تو چاروں نے باری باری اُس پہ کش لگانے شروع کیے۔ دو دو کش لگانے کے بعد اُن تینوں نے دکان والے کو الوداع کہی اور چل پڑے۔

"چلو" ریاض نے قصبے سے نکل کر کہا، "تم گھر چلے جاؤ۔ میں غلام کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"کہاں؟" اسد نے پوچھا۔

"کام ہے" ریاض بولا۔ "میں آجاؤں گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں" اسد نے کہا۔

ریاض اور غلام نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ریاض بولا: "آجاؤ۔"

وہ تینوں سڑک کی جانب ہو لیے۔ راستے میں ریاض اور غلام نے لکڑیاں اُٹھا اُٹھا کر اپنے جھولوں میں ڈالنی شروع کر دیں۔ اسد اُن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

"غلام کو لکڑیاں چاہئیں" ریاض نے کہا، "اس کے گھر پھینکنے جائیں گے۔"

غلام کا گھر سڑک سے ذرا ہٹ کے تھا۔ اسد بھی لکڑیاں توڑ توڑ کر جھولے میں بھرنے لگا۔

اب سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ دیر ہوئی سڑک سے جا چکی تھی مگر پہاڑوں کی چوٹیاں ابھی چمک رہی تھیں۔ تینوں آدمی لکڑیوں سے بھرے جھولے پشت پہ اُٹھائے کشمیری مزدوروں کے انداز میں جھکے جھکے ایک قطار میں سڑک کے کنارے چلے جا رہے تھے۔ ایک مقام پہ آ کر اُن کی گفتگو کچھ چڑھائی، کچھ تھکاوٹ کی وجہ سے ختم ہو گئی تھی اور وہ کندھے سے کندھا لگائے چلتے چلتے بکھر کر ایک دوسرے کے پیچھے چلنے لگے تھے۔ کبھی کبھی کوئی فوجی جیپ یا بڑی گاڑی اُن کے پاس سے گزر جاتی تھی۔ ہر ایک گاڑی کی آواز کو قریب آتے سن کر وہ رک جاتے اور گاڑی کو منہ اُٹھا کر دیکھنے لگتے جب تک کہ وہ گزر نہ جاتی۔ پھر وہ چل پڑتے۔ آگے آگے غلام جا رہا تھا، اُس کے پیچھے ریاض، اور سب سے پیچھے اسد تھا۔ سڑک پر دُور دُور تک کوئی اور دکھائی نہ دے رہا تھا۔ غلام اور ریاض نے سروں پہ کشمیری کڑھائی کے کپڑے کی کھوپڑی نما ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ اسد ننگے سر تھا۔ دن کی روشنی تیزی سے معدوم ہوتی جا رہی تھی، مگر ابھی اتنی باقی تھی کہ بیس تیس قدم تک بآسانی نظر جاتی تھی۔ سڑک کی ہلکی، طویل چڑھائی چڑھتے چڑھتے اسد کو ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس قطار سے نکل کر سامنے والے پہاڑ کی چوٹی پر جا کھڑا ہوا ہے اور دُور سے ان تینوں آدمیوں کو چلتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ بے دخلی کی اس کیفیت سے اب وہ مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ اس کیفیت نے اسے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ ایسے نظاروں کو یوں دیکھ سکے جیسے اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ پہاڑ کی بلند چوٹی پر کھڑے اُسے دُور نیچے اس گہری اور خالی سرزمین پہ جھکی ہوئی یکساں چال سے چلتے ہوئے تین بوجھ بردار مزدوروں کا یہ قافلہ طویل العمر اور مانوس معلوم ہوا۔

اب کچھ دیر سے اسد محسوس کرنے لگا تھا کہ اُس کے دونوں ساتھیوں کی چال میں کچھ تبدیلی آچلی تھی۔ کاروں کی آوازوں پر وہ بدک کر رُک جاتے، پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر چل پڑتے۔ اسد اُن کے ساتھ ساتھ رکتا اور چلتا رہا۔ ایک گاڑی کے انجن کی آواز آئی تو وہ تینوں دُور سے ہی رک گئے۔ قریب آنے پر انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک درمیانے سائز کا کھلا فوجی ٹرک تھا جسے دو فوجی چلا رہے تھے۔ ٹرک میں اور کوئی نہ تھا۔ جب ٹرک پندرہ قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو اچانک غلام نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے ایک سیکنڈ کے وقفے کے بعد بریک لگائی اور ٹرک رکتا رکتا اُن سے چند قدم آگے نکل کر جا ٹھہرا۔ فوجی نے کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے دیکھا۔ چند

گولیاں داخل ہوئی تھیں۔ رخسار پہ، ناک کی ہڈی پہ، آنکھ میں۔ اُس کے چہرے کے ہونٹ بھنچ گئے اور دانت باہر نکل آئے۔ بوچھاڑ کے جھٹکے سے اُس کا سر پیچھے کو جھٹک گیا اور اس کا دھڑ سیٹ پہ جا گرا۔ اُس کا سر دوسرے فوجی کی گود میں جا کر پڑا جو سیٹ کے اوپر آدھا بیٹھا اور آدھا لیٹا ہوا تھا اور جس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ ریاض اب دہشت سے آنکھیں پھاڑے اُس فوجی کو دیکھ رہا تھا جو اُس کی گولیوں سے گرا تھا۔ وہ زخمی اب آہستہ آہستہ کہنیوں کے بل اُٹھ رہا تھا۔ اُس کا خون اُگلتا ہوا ٹوٹا پھوٹا چہرہ پیچھے کو ڈھلکا ہوا تھا، مگر اُس کے کندھے اوپر اُٹھتے آ رہے تھے۔ جیسے کسی بھوت نے اُس کے بدن کو اپنے قبضے میں لے لیا ہو۔ ریاض نے ایک دوبار اپنے ہاتھوں کو ایسے حرکت دی جیسے پھر گولی چلانا چاہتا ہو۔ پھر اُس کے منہ سے ایک گالی نکلی، اور اُس نے ایک ہاتھ کی پوری قوت سے دروازے کو دھکا دے کر کھڑاک سے بند کر دیا۔

"جال نکالو" وہ چیخا۔

اسد گویا یکایک جاگ پڑا۔ اُس نے ایک چھلانگ لگائی اور ٹرک کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ ایک ایک وار میں اُس نے چھروں کے رستے ڈھیلے کیے اور انہیں اُٹھا کر کے جال کھینچ لیے۔ وہ نیچے کود کر اپنا جال کھینچ رہا تھا کہ اُسے غلام کی جانب سے ایک مختصر سی بوچھاڑ کی آواز سنائی دی۔ پھر کھڑاک سے دروازہ بند ہونے کی آواز۔ اب وہ تینوں ٹرک کو دھکا لگا رہے تھے۔ غلام نے ایک گالی دے کر دوبارہ دروازہ کھولا اور پائے دان پہ کھڑے ہو کر گاڑی کو گیئر سے نکالا۔ پھر اُس نے پوری قوت سے سٹیئرنگ کو ایک چکر دیا اور چلا کر دھکا لگانے کو بولا۔ ریاض اور اسد نے کندھے ٹرک کی باڈی کے ساتھ لگا کر ٹانگوں کے زور سے اسے دھکانا شروع کیا۔ سڑک کے کنارے پہ پہنچ کر غلام باہر کود پڑا اور ٹرک سڑک سے اُتر کر گہری ڈھلان پہ لڑھک گیا۔ چند لمحوں تک ٹرک حیرت انگیز طور پہ سیدھا اپنے ٹائروں پہ چلتا رہا، پھر یک دم اُلٹ گیا۔ اس جگہ پہ کوئی گہری کھڈ نہ تھی، صرف پہاڑ کی اونچی ڈھلان تھی جو دُور تک جاتی تھی۔ پتھروں کے اوپر قلابازیاں کھاتے ہوئے بھاری ٹرک کے گرنے سے ایک شور اُٹھ رہا تھا، اور اندھیرے میں کہیں کہیں آگ کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ انہوں نے ٹرک کے رُکنے کا انتظار نہ کیا۔ اپنے اپنے جھولے اُٹھا کر وہ تینوں بھاگتے ہوئے بکھر گئے۔ غلام سڑک سے ایک طرف اور اسد اور ریاض دُوسری جانب، جدھر اُن کا گھر تھا، پہاڑی رستوں پر اُتر کر رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ سڑک سنسان رہ گئی۔ یہ ساری کارروائی ایک ڈیڑھ منٹ میں انجام پا گئی۔

ریاض کی ماں کو سگریٹ کے دھوئیں سے نفرت تھی۔ چنانچہ جب وہ سو گئی تو ریاض اُٹھا۔ اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر ایک سُلگتی ہوئی لکڑی سے جلایا، اور اوپر والے زینے پہ آ بیٹھا جہاں اسد لیٹا سونے کی کوشش

سیکنڈ تک کڑی نظروں سے تینوں کو دیکھنے کے بعد اُس نے سر کے ایک جھٹکے سے انہیں پیچھے بیٹھنے کی اجازت دے دی اور سر اندر کر لیا۔ وہ تینوں تیز تیز چلتے ہوئے ٹرک کے پیچھے تک پہنچے۔ وہاں پہ انہوں نے اپنے اپنے گٹھے پیٹھ پہ سے زمین پہ پھینکے۔ پھر دو دو نے مل کر اُن کو اوپر اُٹھایا اور دھڑام دھڑام انہیں ٹرک میں پھینکنے لگے۔ دو گٹھوں کو ٹرک میں لادنے کے بعد اب صرف اسد کا گٹھا زمین پہ رہ گیا تھا۔ اُس کو اُٹھا کر لادنے کی بجائے غلام اور ریاض نے گٹھوں میں ہاتھ ڈال کر روسی ساخت کی ہلکی سٹین گنیں نکالیں اور انہیں سنبھال کر اپنی اپنی طرف سے بھاگتے ہوئے ٹرک کے دونوں دروازوں تک پہنچے۔ اسد جو ریاض کے رُخ پہ تھا دم بخود کھڑا دیکھتا رہا۔ ریاض نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اُس کی سٹین گن سے، ہلکے ہلکے شعلوں کے ہمراہ گولیوں کی ایک بوچھاڑ نکلی۔ اُسی لمحے دُوسری طرف سے غلام کی گولیوں کی بوچھاڑ آئی جو ایک دو سیکنڈ دیر تک جاری رہی۔ ٹرک جس کا انجن گیئر میں تھا ڈرائیور کا پاؤں ایکسیلیٹر سے ہٹنے سے ایک جھٹکے کے ساتھ اُچھلا، پھر ایک دو ہلکے ہلکے جھٹکے کھا کر رُک گیا۔ اسد اب ریاض کے پاس کھڑا ٹرک کے اندر دیکھ رہا تھا۔ ٹرک کا ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا اینٹھ رہا تھا، جیسے اُس تنگ سی جگہ میں انگڑائی لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُس کی تازہ تازہ استری کی ہوئی وردی میں پیٹ سے ذرا اوپر دو سوراخ نظر آ رہے تھے۔ ایک ذرا بڑا تھا اور ایک چھوٹا۔ اس کے علاوہ اُس کے کپڑوں پہ اور کوئی داغ نہ تھا۔ اُس نے جمائی لینے کی طرح منہ کھولا اور کھولے رہا۔ اُس کے گلے سے ہلکی ہلکی خرخراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ اسد کو اُس کا نرخرہ نظر آیا جو ہوا کی خاطر تیزی سے کانپ رہا تھا۔ پھر اُس نے آہستہ آہستہ باہر کی جانب مُڑنا شروع کیا، جیسے خواب کی حالت میں کروٹ بدل رہا ہو۔ جیسے ہی وہ مُڑا اُس کی وردی کے بڑے سوراخ سے لہو کا دھارا اُبل کر نکلا اور اُس کے پیٹ پہ بہتا ہوا رانوں کے بیچ گرنے لگا۔ اُس نے اپنا ایک ہاتھ اُس سوراخ کے اوپر رکھ دیا، جیسے اسے بند کرنے کی کوشش کر رہا ہو، اور ٹانگیں گھسیٹ کر باہر کی جانب نکلنے لگا۔ ریاض مشین گن سیدھی کیے اُس کے سامنے کھڑا تھا، اور سپاہی خالی خالی متعجب نظروں سے ریاض کو دیکھتا ہوا باہر آ رہا تھا۔ اسد خوف اور استعجاب سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ چھت کی روشنی میں اُس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید اور بے تاثر تھا۔ اُس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں، اور وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے باہر ہی باہر نکلا آ رہا تھا۔ جب اُس کا منہ مشین گن کی نالی سے چند انچ کے فاصلے پہ رہ گیا تو ریاض فطری طور پہ ایک قدم پیچھے کو سرکا۔ اسد نے ریاض کو دیکھا۔ ریاض نے تیزی سے ایک نظر اسد پہ ڈالی۔ ریاض کے چہرے پہ گومگو کے تاثر تھے، جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ آدمی آخر چاہتا کیا ہے؟ اسد کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر اُس بے سُود شخص کو تھام لے اور اُسے آگے بڑھنے سے باز رکھے۔ پھر ریاض نے نالی اُٹھا کر لبلبی دبا دی۔ کٹھک کٹھک کٹھک! اسد کو یوں دکھائی دیا جیسے کسی نے اُس سفید چہرے پہ کیچڑ کا چھینٹا مار دیا ہو۔ پھر اُس نے دیکھا کہ یہ سوراخ تھے جہاں

کر رہا تھا۔

"علی" وہ سرگوشی میں بولا۔

"ہاں"

"یہ لو" اس نے دوسرا سگریٹ نکال کر اسد کی طرف بڑھایا۔ اسد نے سگریٹ لے کر ریاض کے سگریٹ سے جلایا اور دونوں اندھیرے میں بیٹھ کر کش لگانے لگے۔ وہ سگریٹ پینے کے عادی نہ تھے، مگر کبھی کبھی ریاض کو کہیں سے سگریٹ مل جاتے تو وہ پی لیا کرتے۔ اس وقت اسد کے دل سے بے وجہ ایک خیال گزرا کہ یہ سگریٹ کہیں ان ٹرک والے فوجیوں کے تو نہ تھے؟ اگر تھے تو ریاض نے کس وقت اڑائے تھے؟ شاید جس وقت وہ جال نکال رہا تھا؟ اندھیرے میں اسے دکھائی نہ دیتا تھا ورنہ پہچان لیتا۔ سب فوجیوں کو ایک ہی قسم کے سگریٹ ملا کرتے تھے۔

"کیمپ ادھر سے دو میل ہوگا؟" ریاض بولا۔

"ہاں" اسد نے جواب دیا، "آواز پہنچی ہوگی؟"

"اونہوں" ریاض نے نفی میں سر ہلایا، "بیچ میں پہاڑ تھا۔ پہاڑ آگے آجائے تو آواز ایک فرلانگ نہیں جاتی۔"

"یہ بات تو ہے۔"

وہ بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ اسد نے دو تین بار سر ہلا کر اس منظر کو جھٹکنے کی کوشش کی جو اس کی آنکھوں میں جم گیا تھا۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" اسد نے پوچھا۔

"تمہارا کیا پتہ تھا؟"

"کیوں؟"

"کام خراب کر دیتے۔"

"پھر اب؟"

"ہُنہہ؟"

"کام خراب تو نہیں ہوا۔"

"نہیں۔ مگر پہلے کیا پتا تھا۔"

"ہاں" اسد نے اشتیاق سے کہا، "پھر اب اگلی بار؟"

"ہُنہہ!" ریاض ہنسا، "اگلی بار کا کسے پتا ہے۔ ہم نے تو آڈر کے بغیر کام کیا ہے۔"

"اب کیا ہوگا؟"

"ہوگا کیا۔ بچ گئے تو بچ گئے۔ پکڑے گئے تو بس ختم۔"

اس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا۔ اسد ہکا بکا سگریٹ کی لو میں اس لڑکے کے چہرے کو دیکھتا رہا جو اپنی زندگی میں، نفع خور سوداگر کی طرح، بلاوجہ خطرے کی ذخیرہ اندوزی کرتا جا رہا تھا۔

"آرڈر کے بغیر کیوں؟" اسد نے پوچھا۔

"ہمیں اجازت نہیں۔ ادھر سے فوجی آتے ہیں۔ کمانڈو۔ ہم صرف رہبری کا کام کرتے ہیں یا مخبری کا۔"

"کسی کو بھی اجازت نہیں؟"

"کسی کسی کو ہے۔ غلام ان کے ساتھ کبھی جاتا ہے، رستے کے لیے۔ اس کی شٹین گن بھی سرکاری ہے۔"

"اور تمہاری؟"

"غلام نے لا کر دی ہے۔ میرے ساتھ اس نے وعدہ کیا تھا۔"

"ان میں سے کسی کی اٹھا کر لایا ہے؟"

"ہاں۔"

"اب تم بچ گئے تو پھر؟"

"پھر کیا۔"

"پھر تم بھی ان کے ساتھ جا سکو گے؟"

"شاید۔" ریاض نے کہا۔

"میں بھی؟" اسد نے اشتیاق سے پوچھا۔

"تم تو ان کے اپنے آدمی ہو، تمہیں کیا فکر ہے۔ اپنی مرضی سے جو چاہو کرو۔ مشکل تو ہماری ہے۔"

سگریٹ آدھے سے زیادہ جل چکے تھے۔ اسد کو علم ہوا کہ خود سری کے اس مقام پر بھی پیشہ وری کے درجے ہیں، اور وہ اس مقام پر ان لوگوں کے درمیان بھیس بدل کر بھی اجنبی ہے۔ یہ سوچ کر اس کا دل مرجھا سا گیا۔

انہوں نے اپنے اپنے سگریٹ زینے پر مسل کر بجھا دیے۔ ریاض اٹھ کھڑا ہوا۔ اسد کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے، تاکہ اس کو سوچنے سے نجات مل جائے، مگر اس کے دل میں کوئی بات نہ آ رہی تھی۔

"تم مشین گن سامنے لے کر سوتے ہو؟" اُس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"نہیں۔ چاٹی میں رکھ دیتا ہوں۔"

"ماں کو پتا ہے؟"

"ہاں۔"

"تمہیں کچھ نہیں کہتی؟"

"نہیں۔"

وہ آنکھیں کھولے پتھر پہ چت لیٹا رہا۔ کبھی وہ آنکھیں بند کر لیتا، کبھی کھول دیتا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کوئی بات کرے۔ اُس کا سانس بھاری ہو گیا تھا۔ ریاض نیچے والے زینے پر اپنی ماں کے قریب لیٹ کر سو چکا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتا یا کھولتا، ایک منظر تھا جو چھوڑتا نہیں تھا، بے سر کے اُس دھڑ کا منظر جو کہنیوں کے زور پہ اُٹھتا ہی آ رہا تھا، جیسے کوئی بھوت ہو۔

(۹)

وہ پہاڑی کا موڑ مڑے تو سامنے گاؤں نظر آیا۔

"وہ ہے۔" ریاض سر کے اشارے سے بولا۔

"چار کوس؟" اسد ہنسا۔ "عجیب نام ہے۔ اگر پانچ کوس پہ ہوتا تو نام پانچ کوس رکھ دیتے؟"

"یہ تمہیں کس نے بتایا ہے؟"

"ماں نے۔"

"اونہوں۔" ریاض نے نفی میں سر ہلایا، "نگری سے پانچ کوس پر ہے، اور تری سے تین کوس سے بھی کم۔ لوگوں نے کہانی بنالی ہے۔"

اسد حیران رہ گیا: "کیسے؟"

"بس۔ باتیں سن کر ایک خیال بنا لیتے ہیں، پھر اسی کو بتاتے جاتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ ارد گرد کے گاؤں کا قصہ کچھ اور ہے۔"

"کیا ہے؟"

"ایک دفعہ ایک شخص کہیں سے اِدھر آ نکلا تھا۔ وہ چارکوس کی ایک عورت پر عاشق ہو گیا۔ وہ عورت بیاہتا تھی۔ بات باہر نکل گئی، اور عورت کے مالک اُس شخص کے پیچھے لگ گئے۔ آخر اُسے گاؤں چھوڑنا پڑا۔ مگر جانے سے پہلے اُس نے قسم کھائی کہ اگر اُس کا عشق سچا ہے تو وہ اِس گاؤں کے گرد اپنا نام لینے والوں کی ایک لکیر کھینچ دے گا۔ وہ گاؤں سے چند کوس کے فاصلے پہ جا کر ایک جھونپڑی ڈال کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ خدا کے نام میں غرق ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ چند مہینے کے بعد جب وہ نکلا تو سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا، مگر اُس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ جو بھی اُس کو ایک نظر دیکھ لیتا اُس کا مرید ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ اُس کے مرید وہاں آکر آباد ہونے شروع ہو گئے۔ دو تین برس میں وہاں آبادی پڑ گئی۔ پانچ برس کے بعد ننگے شاہ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔"

"ننگے شاہ اُس کا نام تھا؟"

"پتا نہیں اُس کا نام کیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں۔ مگر پہلے دن سے اُس نے کپڑے اتار دیے تھے۔ اُس کے بعد کبھی کسی نے اُسے کپڑے پہنے نہیں دیکھا۔ گرمی ہو یا سردی، ایک لنگوٹی میں رہتا تھا۔ جب برف پڑتی تو ایک کمبل کی بُکل مار لیتا تھا۔ اِس سے اُس کا نام ننگے شاہ پڑ گیا۔ خیر، اُس کے بڑے بڑے مرید اُس کے ساتھ کوچ کر کے اگلی جگہ پہ پہنچ گئے، مگر زیادہ تر وہیں بیٹھے رہے۔ بستی ڈالنا آسان ہے، چھوڑ کر جانا آسان نہیں۔ نئی جگہ پہ نئے لوگ اُس کی شہرت سُن کر آنے، اپنی اپنی غرضیں لے کر آئے اور کچھ وہیں رہ گئے۔ غریب لوگ روٹی کے نام پر آئیں یا نہ آئیں، خدا کے نام پر ضرور آتے ہیں۔ اور خدا کا نام پیر فقیر کا نام ہی ہوتا ہے۔ خیر، یہاں بھی جیتے جیتے گاؤں پڑ گیا۔ پانچ سال کی مدت پوری کر کے ننگے شاہ وہاں سے بھی چل پڑا۔ اسی طرح جگہ جگہ گاؤں آباد کرتا ہوا وہ چارکوس کے گرداگرد چلتا رہا۔ آخر چالیس سال کے عرصے میں اُس نے چکر ختم کر کے اپنی بات پوری کر دی۔"

"پھر کہاں گیا؟"

"وہ سامنے۔" ریاض نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا۔ "جہاں سبز جھنڈا لگا ہے۔"

"واپس چارکوس؟"

"ہاں۔ یہ اُس کا مزار ہے۔ چالیس سال میں چارکوس کے بہت سے لوگ اُس کے مرید بن گئے تھے۔ جب اُس کا حصار ختم ہوا، ان گاؤں کو ننگے شاہ کا حصار کہتے ہیں، اور بھی اِدھر اُدھر کے بہت سے گاؤں حصاری گاؤں کہلاتے ہیں، جب حصار ختم ہوا تو چارکوس والے زور دے کر اُسے اپنے گاؤں لے آئے۔ کہتے ہیں سو سال سے اوپر اُس کی عمر ہوئی تھی۔ یہ اُس کا مزار ہے۔"

"اُس عورت کا کیا بنا؟"

"کس عورت کا؟"

"جس پر وہ عاشق تھا۔"

"پتا نہیں۔" ریاض لاپروائی سے بولا۔ "مر مرا گئی ہوگی۔"

"عجیب بات ہے۔" اسد حیرت سے بولا۔ "اُس کی خاطر ایک علاقہ آباد ہوا، اور اُس کا نام بھی کوئی نہیں جانتا۔"

"یہ تو عشق کے کام ہیں۔" ریاض نے کہا۔ "بہانہ جو بھی بن جائے۔"

"یہ بھی ایک کہانی ہی ہے۔" کچھ دیر بعد اسد بولا۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ کہانی سچی ہے۔"

"ثبوت؟" چلتے چلتے ریاض نے اُس کی طرف یوں دیکھا جیسے اُس کی کم عقلی پر حیران ہو رہا ہو۔ "سارے اردگرد کے گاؤں بعد میں بنے ہیں۔ ثبوت کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ تمہیں کیسے پتا ہے؟"

"سب کو پتا ہے۔ تحصیل کی کتابوں میں، پٹواری کے کاغذوں میں، سب جگہ لکھا ہے۔ چارکوس سب سے پرانا ہے۔ اُس وقت بھی یہ چارکوس تھا جب یہاں اور کوئی گاؤں نہیں تھا۔"

اسد کھسیانا سا ہو کر چپ ہو رہا۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ کیسے ان لوگوں نے اپنے زور دار مفروضوں میں اُلجھا کر اُس کی عقل کو کچھ دیر کے لیے معطل کر دیا تھا۔ آخر اِس سے رہا نہ گیا:

"اگر لوگوں کو اِس بات کا علم ہے،" اُس نے پوچھا، "تو پھر کیسے سب اِس فرضی کہانی پہ یقین کر لیتے ہیں؟"

"آسانی کے لیے۔" ریاض نے جواب دیا۔ "اُس کے نام سے ہی کہانی بنتی ہے۔ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ لوگوں کو فرضی باتوں پہ یقین کرنے کا کوئی شوق تھوڑی ہوتا ہے۔"

سورج سر پہ تھا اور گلیوں میں دھوپ سیدھی پڑ رہی تھی جب وہ گاؤں میں داخل ہوئے۔ ریاض نے دو ایک جگہ رک کر عورت کا پتا دریافت کیا اور وہ اُس کے گھر پہنچے۔ گھر اُس کے علاقے کے بیشتر گھروں کی طرح ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ عورت گھر کے آگے مختصر سی لیپی ہوئی زمین پر، جو صحن کا کام دیتی تھی، جھاڑو دے رہی تھی۔ اُس نے کمر سیدھی کر کے لڑکوں کی بات سُنی اور سادگی سے انہیں گھر کے اندر بیٹھنے کو کہا۔ دالانے میں دس گیارہ برس کا ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ ریاض اور اسد اُس کے پاس سے گزر کر اندر داخل ہوئے اور ایک طرف زمین پر بیٹھ گئے۔ کمرے

میں صرف چند چیزیں تھیں اور وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر رکھی تھیں۔ اس کمرے میں صفائی کا احساس ہوتا تھا۔ اس کی دیواریں بھی، جو چھوٹے چھوٹے ٹیڑھے میڑھے پتھروں کو مہارت سے چن کر کھڑی کی گئی تھیں، نسبتاً سیدھی اور صاف تھیں۔ عورت اندر آ کر ان کے پاس زمین پر بیٹھی تو اسد کو اس کی چال میں، اس کے بیٹھنے کے انداز میں ایک ترتیب کا احساس ہوا۔ وہ ایسی عورتوں میں سے تھی جن کے چہرے سے ان کی عمر کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کم سے کم اجزا کے استعمال سے اس عورت کی شبیہہ تیار ہوئی تھی، اور اسی وجہ سے پائیدار تھی۔ اس شبیہہ میں کوئی شے فالتو نہ تھی۔ اس کی موجودگی میں اسد اور ریاض دونوں پر خاموشی چھا گئی۔

"خوشی کیوں نہیں آیا؟" عورت نے پوچھا۔

"خوشی کام پر ہے" اسد نے جواب دیا، "کچھ دن کے بعد آئے گا۔"

وہ چند لمحوں تک شیشے کی سی شفاف نظروں سے اسد کو دیکھتی رہی۔ آخر اسد کی نظر ہٹ گئی اور وہ آنکھیں جھکا کر انگلیوں سے کرتے کی جیب ٹٹولنے لگا۔

تھوڑی دیر میں اس نے جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ برآمد کیا۔

"دکھاؤ۔" عورت اس کی جانب سر جھکا کر بولی۔

اسد نے پرزہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ کئی لمحے تک کاغذ پر بنی ہوئی اس پتے کی شکل کو دیکھتی رہی، جیسے ذہن کو کھرچ رہی ہو۔

"ہاں۔" پھر وہ سر اٹھا کر بولی۔

"اس کا نام کیا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"نام معلوم نہیں۔ مگر میں جانتی ہوں۔"

"کہاں ملتی ہے؟"

"یہیں۔" وہ سر کے ہلکے سے اشارے سے بولی، "رجار کے بیلے میں۔"

"اس موسم میں ہوتی ہے؟"

"ہاں۔"

اسد نے ریاض کی طرف دیکھا۔

"اس کا ڈھونڈنا مشکل کام ہے۔" عورت بولی، "تمہارے بس کا نہیں۔ نکی بوٹی ہے۔ میں لے آؤں گی۔ کس مرض میں کام آتی ہے؟"

"سانس کے مرض میں۔" اسد نے کہا۔

"کس کو ہے؟"

"علی کو ہے۔" ریاض نے جواب دیا۔

"تہ تہ۔" وہ افسوس سے سر ہلا کر بولی، "لمبا مرض ہے۔ جان کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ مگر بوٹی میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اللہ شفا دے گا۔ نکی بوٹی ہے، دو دو چار چار پتے چننی پڑتی ہے۔ ایک دو دن میں جتنی ملی لے آؤں گی۔ تیسرے دن آ کر لے جانا۔ پتے اتار دوں؟"

"ساتھ ہی رہنے دینا۔" اسد نے کہا۔

"خوشی کہتا ہے کسی کسی بوٹی کے پتوں کی خاصیت اور ہوتی ہے، ڈنڈی کی خاصیت اور ہوتی ہے۔ اپنا اپنا علم ہے۔"

"میں پیسے دے دوں گا۔" اسد نے کہا، "میرے پاس پیسے ہیں۔"

"پیسوں کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں محنت کرتی ہوں۔ تم خوشی کے جاننے والے ہو،" عورت بولی، "یہ بتاؤ وہ کیوں نہیں آیا؟ تین مہینے ہو گئے ہیں۔ کس کام پر گیا ہے؟"

"ضروری کام پر گیا ہے۔" اسد نے کہا۔ عورت کی نظریں اس پر لگی رہیں۔ اسد کو کوئی اور بات نہ ملی تو بولا، "میں نے سنا تھا کوئی اور آدمی ہے جو یہاں بوٹیوں کا کام کرتا ہے اور خوشی اس سے لے جایا کرتا ہے۔"

"تم خوشی سے مل کر نہیں آئے؟"

اسد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "وہ کام پر گیا ہوا ہے۔" اس نے دہرا کر کہا۔

"نہیں۔" وہ بولی، "اس علاقے میں کسی اور کو اس چیز کا علم نہیں۔ خوشی سارا سارا دن ان کے پیچھے جنگلوں میں پھرتا رہتا ہے۔ جیسے کوئی سودائی ہو۔ پھر لا کر ان لوگوں میں بانٹ دیتا ہے۔ کچھ باندھ کر ادھر لے جاتا ہے۔ کہتا ہے ادھر کوئی بڑا حکیم ہے اس سے تھوڑا بہت علم اسے ملا ہے۔ کوئی کچھ دے دے لے لیتا ہے، نہیں تو کہتا ہے یہ اللہ واسطے کی چیز ہے، اس میں شفا ڈالتا ہے، وہی نکال لیتا ہے۔ ادھر سے جب آتا ہے تو کچھ پیسے لاتا ہے۔ ادھر اس کا کچھ کاروبار ہے۔ مگر پہلے اتنی دیر تک ادھر نہیں رہا۔ تین مہینے ہو گئے ہیں۔ آج سورج میں بڑی تپش ہے۔ تمہیں پیاس لگی ہو گی۔ میں تمہارے لیے لسی لے کر آتی ہوں۔"

وہ اٹھی اور دیوار کے پاس رکھی ہوئی کھلے منہ کی مٹی کی ایک مٹکی اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اسد نے اسے بے کاوش چلتے پھرتے، مڑتے اور باہر جاتے ہوئے دیکھا، جیسے ہوا چلتی ہو، اور اس کے دل میں بے معلوم سا افسوس پیدا ہوا۔

بچہ وہیں پر بیٹھا روٹی چباتا اور بھری بھری نظروں سے اُن دونوں کو دیکھتا رہا۔ چند منٹ کے بعد عورت دونوں ہاتھوں میں مٹکی تھامے اندر داخل ہوئی۔ اُس نے مٹکی زمین پر رکھ کر چٹکی بھر پسی ہوئی سُرخ مرچیں اُس میں چھڑکیں۔ اُس کے بعد مٹی کے ایک برتن سے نمک کی چھوٹی سی ڈلی نکال کر مٹکی میں گرائی۔ پھر اس نے المونیم کا ایک گلاس پانی سے دھویا اور ایک ہاتھ سے مٹکی اُٹھا کر لسی گلاس میں انڈیلی۔ نمک کی ڈلی لسی کے ساتھ کھٹاک سے گلاس میں گر پڑی۔ پھر گلاس کو دیکھا ہے جاکر ایک دھار سے لسی واپس مٹکی میں گرائی۔ نمک کی ڈلی کھٹاک سے مٹکی میں آ گری، جس سے لسی کا ایک چھلکا سا جھپاکا مٹکی کے منہ سے اُچھل کر باہر زمین پر آ گرا۔ دو تین بار اسی طرح لسی کو پھینٹنے کے بعد اُس نے مٹکی اور گلاس اُن دونوں کے سامنے زمین پر لا رکھے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

"تم چار کوس کی رہنے والی ہو؟" ریاض نے لسی گلاس میں انڈیلتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں جھنگ باس کی ہوں۔ میں ڈسپنسر صاحب کے گھر کام کرتی تھی۔" عورت نے دیہاتیوں کے آسان انداز میں اپنی کہانی بیان کرنا شروع کر دی۔ "وہیں پر میں بڑی ہوئی۔ وہاں سے میں اسمٰعیل دکاندار کے ساتھ نکل کر رجھار چلی آئی۔ اُس نے مجھے مسلمان کر کے میرے ساتھ نکاح کر لیا۔ دو سال میں اُس کے ساتھ رہی۔ دو سال کے بعد وہ مجھے چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ عبداللہ" اُس نے دروازے میں بیٹھے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھا، "میرا بیٹا ہے۔ میں نے پھر گھروں میں محنت شروع کر دی۔ وہیں پر خوشی رجھار کے میلے میں آیا کرتا تھا۔ وہ مجھے اور عبداللہ کو یہاں لے آیا۔ مجھے اُس نے بڑی آرام سے رکھا ہے۔ یہ گھر" اُس نے کمرے کی دیواروں پر نظر ڈالی، "اُس نے اپنے ہاتھوں سے میرے لیے بنایا ہے۔ مگر اُس کے سر میں کوئی سودا ہے۔ کہیں ٹِک کر نہیں بیٹھتا۔ اِدھر سے اُدھر پھرتا رہتا ہے۔ ہاتھ میں جو کچھ ہوتا ہے دے دیتا ہے۔ اُس کے اندر کوئی ایسی چیز ہے ۔۔۔"

عورت کے سفید چہرے پر پہلی بار رنگ کی ایک جھلک آئی، پھر دُوسری، پھر تیسری، جیسے تیزی سے خیال بدل رہے ہوں۔

"کیا چیز ہے؟" اسد نے تجسس سے پوچھا۔

وہ آنکھیں پھیلائے ایک تار اُسے دیکھتی رہی، جیسے کوئی خیال ڈھونڈ رہی ہو۔ پھر سادگی سے بولی: "اُس کے دل میں لالچ نہیں۔"

اسد نے دروازے کے باہر نظر دوڑائی۔ باہر دھوپ میں چمکتی ہوئی مکانوں کی ننگی دیواروں کا اسرار پھیلا تھا۔ ریاض نے دو گلاس لسی کے چڑھا کر خالی گلاس اسد کے آگے رکھ دیا۔ اسد نے گلاس بھر کر لسی کا پیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اسد خاموش تھا۔ وہ پہاڑی راستوں پر آگے پیچھے چلے آ رہے تھے جہاں دھوپ تیز اور نیم سرد پتھروں پر

چمک رہی تھی۔ انسانی زندگی کے اسرار میں تہہ در تہہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس آدمی کی حقیقت کیا تھی؟ خوشی محمد — ایجنٹ۔ ڈبل ایجنٹ۔ ملزم۔ اور اب؟ درویش!

اور میرا محسن؟ کیا یہ میری قسمت میں لکھا ہے، اسد نے سوچا، کہ جس شخص سے مجھے فائدہ ملے وہ ہمیشہ میرے سامنے ایک معمہ بنا رہے؟ پہلے حکیم، اور اب خوشی۔ یہ کیسا راز ہے .... اسد کے دل میں شبہے کا تاریک اور جسیم دیو، جس کو اُس نے ایک مثبت عمل کا قدم اُٹھا کر اپنے تئیں سلانے کی کوشش کی تھی اور یہ سمجھ رکھا تھا کہ اب راستے سے ہٹ چکا ہے، وہیں موجود تھا اور دوبارہ کروٹ لے رہا تھا۔ آدمی کے اسرار کی کون سی ایسی صورت پیدا ہو جس پر وہ دو ٹوک یقین کر سکے؟ وہ ہاتھ پیچھے باندھے، سر جھکائے، ماتھے پر فکر کا بوجھ لیے چلا جا رہا تھا۔ ایسی کوئی ایک صورت ناپید تھی۔ ہر ایک تہہ کا ایک رُخ تھا، اور خوشی محمد کے اِس رُخ نے اُس کے فہم کو پچھاڑ دیا تھا۔ اُس نے گھبرا کر اِس خیال کو جھٹک دیا۔

ریاض باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ عورت کی موجودگی میں خاموش بیٹھے رہنے کے بعد اب گویا اُسے زبان لگ گئی تھی۔ اسد نے دیکھا کہ باتیں کرتے کرتے ریاض اُس عورت کا ذکر بار بار کرتا، اور جب وہ اُس کا ذکر کرتا تو اُس کی باتوں میں ایک چمک پیدا ہوتی۔ عورت کا نام جنت تھا اور وہ عمر میں ریاض سے پندرہ سال بڑی ہوگی، مگر اُس نے اس نوعمر لڑکے کو مسحور کر دیا تھا۔ ریاض کو اِس حالت میں دیکھ کر اسد کو ایک انجانی سی مسرت ہوئی۔

"پرسوں آئیں گے؟" اسد نے کہا۔

"کل بتاؤں گا۔" ریاض نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"رات کو چچا کے گھر پہ پتا چلے گا۔"

"کس بات کا؟"

"اُدھر سے سپاہی آ رہے ہیں۔"

"اِتنی جلدی؟"

"ہاں۔" ریاض نے کہا، "دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔"

جب سے انہوں نے ٹرک مارا تھا اُس دن سے اُن کی نقل و حرکت پر مکمل پابندی لگ چکی تھی۔ فوج اور پولیس نے وسیع پیمانے پر چھاپے مارے تھے اور بیسیوں لوگوں کو پکڑ کر لے گئی تھی۔ گرفتار شدگان میں کئی ان کے آدمی بھی تھے۔ اب یہ لوگ اِس دھڑکے میں دم سادھے بیٹھے تھے کہ ایذا کے زیر کس کس کی ہمت جواب دے

جاتی ہے اور کون کون بک اٹھتا ہے، اور بکتا ہے تو کیا بکتا ہے۔ سلطان شاہ کے حلقے میں رائے دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک دھڑے کی رائے تھی کہ سرکار اس وقت گھبراہٹ کے عالم میں ہے، فوج اور پولیس پہ دباؤ بڑھانے کے لیے اپنی کارروائی تیز کر دینی چاہیے تاکہ بدامنی بڑھے، فوج کی دست اندازی میں اضافہ ہو، حکومتوں پر دباؤ پڑے اور جنگ کی کوئی صورت نکلے۔ دوسرا دھڑا، جس میں پرانے پرشنگی قسم کے لوگ شامل تھے، کہتا تھا ابھی وقت نہیں، دبکے رہو اور یہ مرحلہ کاٹو، مناسب وقت کا انتظار کرو۔ اِن دنوں بہر کیف تمام کارروائیوں میں ایک عارضی تعطل پیدا ہو چکا تھا۔ ریاض، غلام اور اسد کو سخت سرزنش کے بعد سلطان شاہ نے گھروں میں تقریباً مقید کر دیا تھا۔ اُن کا ابھی تک فوج یا پولیس کی گرفت سے بچے رہنا ایک معجزے سے کم نہیں تھا، گو وہ دن دن، رات رات بھر گھر میں بیٹھے چوہے سے چھوٹے کھٹکے پہ چونک اٹھا کرتے تھے۔ چند روز کے بعد تنگ آ کر ریاض نے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ اس کی ماں نے دو ایک بار اُسے منع کیا، پھر خاموش ہو رہی۔ ریاض سلطان شاہ کے پاس بھی ہو آیا تھا، اور گو سلطان شاہ نے اُسے دُور کہیں جانے سے سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا، مگر آج خود سری میں وہ اسد کو لے کر چند کوس تک نکل آیا تھا۔ اور اب اُس نے یہ خبر دی تھی۔

"اتنی جلدی کیوں آ رہے ہیں؟" اسد نے پھر پوچھا۔

"کچھ لوگوں نے پیسوں کے لیے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے اپنے لوگ تو ٹھیک ہیں، مہینہ دو مہینے بھی نکل جائیں تو چپ رہتے ہیں۔ بیچ کی طرف کے لوگ لالچی ہیں، پیسے کے لیے اُن کا گرتہ اور بندوق کے بیلے ہاتھ کھلا رہتا ہے۔ اُن کا پیٹ نہیں بھرتا، پیسے کے بغیر ایک قدم نہیں چلتے۔"

"ہو سکتا ہے اُدھر سے بھی پیسہ لیتے ہوں۔"

"اُدھر سے اُن کو ملتا نہیں ورنہ لینے سے انکار نہ کریں۔"

"اسلحہ بھی ان کو دیتے ہو؟"

"پہلے دیتے تھے، اب نہیں۔ بیچنے لگ گئے تھے۔ کچھ بندوقیں فوج کے ہاتھ میں چلی گئی تھیں۔ اب پیسوں سے ان کا منہ بھرتے ہیں۔ مگر مانگنے سے باز نہیں آتے۔"

"ہو سکتا ہے،" اسد نے بات کی، "صرف پیسے دینے آ رہے ہوں۔"

"ہاں،" ریاض نے جواب دیا، "مگر افواہ ہے کچھ نہ کچھ ہو گا۔"

"تمہیں کہاں سے پتا چلا ہے؟"

"چچا سے۔ ایک نیا آدمی کل اِدھر آیا ہے۔ شہر چلو گے؟"

"ابھی؟"

"رات کو۔"

اسد نے غیر یقینی نظروں سے ریاض کو دیکھا۔

"چچا کچھ نہیں کہے گا،" ریاض شرارت سے بولا، "میں تین بار ہو آیا ہوں۔"

"تم آج بھی بغیر اجازت کے مجھے اِدھر لے آئے ہو۔"

"ٹھیک ہے،" ریاض ضدی لہجے میں بولا، "تمہارا کام ضروری تھا، کبھی نہ کبھی تو کرنا ہی تھا۔"

"تم ایسی منہ زوری کیوں کرتے ہو؟" اسد نے پوچھا۔

"تم تو آرام طلب ہو۔ باتیں کرنے میں ہشیار ہو، ہاں ہاں کرتے رہتے ہو مگر تمہارے ہڈ نہیں ہلتے۔ میں اندر بیٹھا بیٹھا تنگ آ جاتا ہوں۔"

"ہماری حفاظت کے لیے ہی سلطان کہتا ہے۔"

"چچا تو بے عقل ہے۔ تم اُس سے بھی بنبرے گئے ہو۔ تمہیں پتا ہے کہ جتنے لوگ چھاپے میں پکڑے گئے ہیں سب گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے، یا سوئے ہوئے تھے۔ چچا کے کہنے پر میں دو دن گھر پہ بیٹھا رہا، میرے ہاتھ میں ہوتا تو گھر آتا ہی نہ۔ تم لوگوں کی عقل میں اتنی سی بات نہیں آتی۔ آگے کیا کرو گے؟"

اسد حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ اچانک اُس کو ایک خیال آیا، جو کئی بار اُس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

"ریاض،" کچھ دیر کے بعد وہ بولا، "تم یہ کام کیوں کرتے ہو؟"

"کون سا کام؟"

"یہ خون خرابے کا کام۔"

"سب کرتے ہیں۔"

"میرا مطلب ہے پیسوں کی تمہیں حرص نہیں، اور کسی چیز کا لالچ نہیں، پھر کیوں اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتے رہتے ہو؟"

"کیوں کا تو کوئی جواب نہیں۔"

"پھر بھی، کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔"

"وجہ کیا ہو گی،" ریاض لاپروائی سے بولا، "ہم غریب لوگ ہیں۔ دولت والے لوگ اپنے لیے قانون بناتے ہیں، ہم انہیں توڑتے ہیں۔ جب تک وہ اپنے قانون بناتے رہیں گے، غریب لوگ انہیں توڑتے رہیں گے۔"

وہ دھوپ میں آگے پیچھے چلتے رہے۔

"تمہارا مجھے پتا نہیں، مَیں پرسوں آؤں گا۔" کچھ دیر کے بعد اسد بولا۔

"اکیلے آؤ گے؟"

"ہاں، تمہارا کیا خیال ہے، جنت تمہارے بغیر مجھے روٹی نہیں دے گی؟"

ریاض ہنس پڑا۔ "تم اکیلے نہیں آ سکتے۔"

"کیوں؟"

"رستہ بھول جاؤ گے۔"

"پوچھ پوچھ کر آ جاؤں گا۔ جنت کا پتا تو بہت آسان ہے۔"

دفعتاً چلتے چلتے اسد کو احساس ہوا کہ اس قدم پر جو موڑ آ رہا ہے، وہ مڑنے کے بعد چار کوس نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ غیر ارادی طور پر اُس کے قدم رُک گئے۔ اُس نے مڑ کر نظر ڈالی۔ گاؤں آدھے سے زیادہ ایک پہاڑی کی اوٹ میں جا چکا تھا، مگر چند لمحے تلاش کرنے کے بعد اُس کی نظروں کو جنت کا گھر مل گیا۔ وہ معمولی سا نیچی چھت والا گھر وہاں اس فاصلے سے بھی ان آڑے ٹیڑھے گھروں کے ہجوم میں الگ تھلگ دکھائی دے رہا تھا گو اُس کی دیواریں ساتھ والے گھروں سے ملتی تھیں۔ اُس کے طول و عرض میں اور اُس کی بناوٹ میں ایک صاف ستھری ترتیب دکھائی دیتی تھی جو دیواروں کے اس جمگھٹ میں ایک محور کے مانند تھی، جس نے کو معلوم ہوتا تھا اس بے ترکیب بنی ہوئی آبادی میں اپنی موجودگی سے ایک توازن پیدا کر رکھا تھا۔ اِس گھر کو، اسد نے سوچا، کیوں میں یہاں رُک کر دیکھ رہا ہوں؟ اِس گھر سے میرا کیا تعلق ہے؟ وہ پلٹا اور تیز تیز چلتا ہوا راستے کا موڑ مڑ گیا۔ چار کوس اُس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ جتنی بھی کوشش کرتا کہ خوشی محمد کا خیال اُس کے دل میں نہ آئے، اتنا ہی وہ خیال اُس کے دل میں جمتا جا رہا تھا۔ آخر تنگ آ کر اُس نے اِس خیال کو دل سے نکالنے کی کوشش ترک کر دی اور پہلی بار عمداً خوشی محمد کی شکل کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ اُسے یہاں تک اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اِس آدمی سے واقف ہے، اِسے دیکھ بھی چکا ہے، مگر کوشش کے باوجود اُسے اُس کا چہرہ یاد نہیں آ رہا تھا، جیسے کوئی خیال ہو جو دل پہ پھر رہا ہو مگر ذہن میں نہ آتا ہو۔ اُس کے منہ پر داڑھی تھی، یا وہ داڑھی منڈاتا تھا؟ اُس کا چہرہ لمبا تھا یا چوڑا تھا۔ سر پہ بال تھے یا وہ سر سے گنجا تھا، یا کہ اُس کے بال ٹوپی میں چھپے تھے؟ اُس نے کئی مختلف شکلوں کو آنکھوں کے سامنے لانے کی کوشش کی، مگر اُس کے ذہن میں اگر آتا تھا تو ایک ہی نقشہ آتا تھا، اور وہ نقشہ یہ تھا، حوالات کے دروازے کی سلاخیں ہیں اور ان کے پیچھے نیم اندھیرے میں ایک دھندلا سا چہرہ ہے جس کے نقش صاف نظر نہیں آ رہے۔ اُس نے ذہن

کی آنکھوں کو بار بار پھیلا کر اور سکیڑ کر دیکھا، مگر یہ نقشہ نہ بدلا۔ صرف کبھی کبھی، حیرت انگیز طور پر، وہ چہرہ اندھیرے میں سے اُبھرتا اور لمحے بھر کے لیے اُس کے نقش صاف ہو جاتے، اور وہ چہرہ اسد کا اپنا چہرہ ہوتا۔ پھر فوراً ہی وہ نقش پھیل کر دھندلا جاتے اور خوشی محمد کے غیر معین چہرے میں تبدیل ہو جاتے۔ اسد نے کئی بار نظریں اُٹھا کر ریاض کی جانب دیکھا، جیسے مدد کے لیے پکار رہا ہو۔ مگر ریاض اب خاموش تھا اور آگے آگے چلا جا رہا تھا۔

باقی کا دن گھر پہ گزار کے وہ دونوں شام کے وقت بارڈر کے لیے روانہ ہوئے۔ جس وقت وہ آبادی میں داخل ہوئے رات پڑ گئی تھی۔ سلطان شاہ کے گھر کا دروازہ اُس کی بیوی نے کھولا۔ ایک منٹ تک اُس نے ریاض سے بات کی اور دروازہ بند کر لیا۔ ریاض اسد کو لے کر واپس چل پڑا۔

"سلطان گھر پہ نہیں؟" اسد نے پوچھا۔

"دین کے گھر ہے۔"

"کہاں؟"

"اُدھر۔"

وہ اندھیری گلیوں میں دیر تک چلتے رہے حتیٰ کہ قصبے سے باہر نکل آئے۔ پھر وہ ایک مختصر سا چکر لگا کر ایک مقام پہ دوبارہ قصبے میں داخل ہوئے۔ اسد دین سے پہلے مل چکا تھا مگر اُس کے گھر کبھی نہیں آیا تھا۔ اُس تاریک گلی کے وسط میں بڑے گھروں کے درمیان پھنسا ہوا تنگ سا دین کا گھر تھا۔ اُس کا دروازہ عام دروازوں کی نسبت چھوٹا تھا، جیسے ذرا بڑے سائز کی کھڑکی ہو۔ اسد اور ریاض ابھی چند قدم دُور ہی تھے کہ دروازہ کھلا، ایک سر اندر سے لمحے دو لمحے کو نمودار ہوا، پھر غائب ہو گیا۔ اُس کے بعد تین آدمی یکے بعد دیگرے دروازے سے جھک جھک کر باہر نکلے۔ ایک سیکنڈ کو تینوں نے رُک کر سامنے نظر ڈالی اور دوسری طرف کو چل پڑے۔ دروازہ کھلا رہا، اندر جو شخص کھڑا تھا اُس نے ریاض کو پہچان لیا تھا اور وہاں رُکا ان دونوں کے داخل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

اسد ٹھٹک کر رُک گیا۔ اُس کی نظریں اُن تین آدمیوں میں سے ایک پہ لگی ہوئی تھیں۔ یہ کون ہے؟ اسد نے ذہن پہ زور دیتے ہوئے سوچا، مَیں اسے جانتا ہوں۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ اُس کی شکل نہ دیکھ پایا تھا، مگر اُس کی شبیہہ دیکھی بھالی تھی اور اُس کی چال بے حد مانوس تھی۔ مَیں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ ہے کون؟ وہ تینوں آدمی تیزی سے اندھیرے میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ اسد آنکھیں پھیلائے پہچاننے کی کوشش کرتا ہوا اُن کے پیچھے چل پڑا اور دروازے سے آگے نکل گیا۔

"علی!" ریاض نے نیچی آواز میں اُسے پکارا۔

جیسے ہی ریاض کی آواز اس کے کان میں پڑی اسی لمحے گویا کسی نے اسد کے ذہن کا کوئی بٹن دبا دیا ہو۔ اس نے زیرِ لب ایک حیرت زدہ گالی دی اور اس کے جسم پہ رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ میر حسن! یہ میر حسن ہے۔ یہاں کیا کر رہا ہے؟ اسد کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے، میر حسن کے پیچھے بھاگے یا وہیں کھڑا رہے۔ ریاض کی آواز دوبارہ اس کے کان میں پڑی۔ ریاض اب دروازے کے اندر کھڑا اشارے سے اسے بلا رہا تھا۔ اسد بھاگ کر دروازے پر پہنچا اور ریاض کو ایک بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا بولا:

"وہ کون ہے؟"

"کون؟" ریاض نے جھک کر ایک قدم باہر رکھا اور اندھیرے میں آنکھیں پھیلا کر دیکھنے کی کوشش کی۔

"وہ جو زیچ میں جا رہا ہے۔"

"کیوں؟" وہ بولا۔

"میں اسے جانتا ہوں۔"

"پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"نہیں پتا ہوگا۔"

اسد اس کا بازو چھوڑ کر میر حسن کے پیچھے بھاگنے لگا تو ریاض نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"یہ پیلے کے آدمی ہیں۔ پیسے ویسے لینے آئے ہوں گے۔ میں اسے جانتا نہیں، مگر پہلے میں نے دیکھا ہے۔ تم کہاں بھاگ رہے ہو؟"

"میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا بات؟"

"یہ گمشدہ کا لڑکا ہے۔ وہاں سے بھاگ کر آیا ہے۔"

"کیوں؟"

اسد ٹھٹک کر اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا ذہن مکمل طور پہ خالی ہو گیا۔ وہ کیا جواب دے۔ کیا وہ اس کو ساری بات بتا دے؟ ساری نہیں تو کتنی بتائے؟ اتنی جلدی میں کیسے بتائے؟ ریاض اس کا ہاتھ مضبوطی سے کھینچ رہا تھا۔

"چلو۔" ریاض بیتابی سے بولا۔ "دروازے میں نہیں رک سکتے۔"

اسد نے آخری بار بے امیدی سے اندھیرے میں غائب ہوتے ہوئے ان تین آدمیوں پر نظر ڈالی۔ میر حسن اپنے مخصوص انداز میں بازو ہوا میں لہرا کر اپنے ساتھی سے کوئی بات کر رہا تھا۔ پھر اسد جھک کر ریاض کے پیچھے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اندر کھڑے ایک آدمی نے دروازہ بند کر لیا۔ اسد کا دل پھڑپھڑا رہا تھا۔

دین کا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ پہلے کمرے میں سب جمع تھے۔ ایک کونے میں کھاٹ پر سلطان شاہ ایک اور شخص کے ساتھ بیٹھا ہاتھ اٹھا اٹھا کر نیچی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی حرکت اور بات کی روانی توڑے بغیر گہری نظروں سے اسد اور ریاض کی جانب دیکھا۔ وہ دونوں جا کر ایک طرف بیٹھ گئے جہاں پہلے تین آدمی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ کمرہ تمباکو کے دھوئیں سے بھرا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسد نے سونگھ لیا تھا کہ یہ دھواں عام کشمیری تمباکو کا دھواں نہ تھا۔ اس کا بھید چند منٹ کے بعد کھلا جب اس شخص نے، جس سے سلطان باتیں کر رہا تھا، جیب سے ولایتی سگریٹوں کی ایک ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ خود نکال کر دوسرا سلطان کو پیش کیا۔ دونوں نے سگریٹ سلگائے۔ دوبارہ بات شروع کرتے کرتے سلطان نے آواز بہت نیچی کر لی۔ کچھ دیر تک اسی خفیہ لہجے میں باتیں کرنے کے بعد اس نے چاروں طرف ایک اور نظر دوڑائی، پھر اپنا بند کر کے سر کے ایک ہلکے سے اشارے کے ساتھ اپنے مخاطب کو پچھلے کمرے میں چلنے کے لیے کہا۔ اس شخص نے ایک کاغذ، جو اس نے کھاٹ پر پھیلا رکھا تھا، اٹھا کر تہہ کیا، اور وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

انہیں پچھلے کمرے میں گئے چند منٹ ہوئے تھے کہ ریاض کسمسا کر اسد کے قریب سے اٹھا اور پچھلے کمرے کی جانب بڑھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اسد نے پوچھا۔

"پیچھے۔"

اسد اس کی بیہودگی پر حیران رہ گیا۔ ریاض ایک منٹ تک غیر یقینی انداز میں دروازے میں اٹکا کھڑا رہا، پھر قدم بڑھا کر اندر داخل ہو گیا۔ جہاں اسد بیٹھا تھا وہاں سے پچھلے کمرے کی کوئی شے نظر نہ آ رہی تھی۔ خاموشی اتنی تھی جیسے اس کمرے میں کوئی بشر موجود نہ ہو۔ یہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں، اسد نے بے خیالی میں سوچا۔ دین کہاں ہے؟ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اس نے ایک نظر پاس بیٹھے ہوئے تین آدمیوں پر ڈالی۔ وہ دیکھنے میں عام کشمیری مزدور لگ رہے تھے جو دیوار کے ساتھ چپ بیٹھے تھے۔ وہ آدمی جس کی ڈیوٹی دروازے پر تھی اب اگر خالی کھاٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ خاموشی اتنی تھی کہ پچھلے کمرے میں ماچس کی تیلی کے جلنے کی آواز آئی۔ پانچوں آدمیوں نے ادھر دیکھا۔

تیل کی روشنی لمحے بھر کے لیے دروازے میں اُبھری، پھر غائب ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تینوں آدمیوں نے سرگوشیوں میں باتیں شروع کر دیں۔ اُن کی آواز اسد کے کان میں پڑی اور اُس نے سر موڑ کر اُن کی جانب دیکھا۔ مگر اُس کی آنکھوں نے دیکھنا اور کانوں نے سننا بند کر دیا تھا۔ صرف ایک نام ہتھوڑے کی طرح اُس کے دماغ پر پڑ رہا تھا۔ میر حسن! جہاں تک آس پاس کی چیزوں کا تعلق تھا، وہ محض اُن کی حرکات کو دیکھ بھال رہا تھا، اُن کی نوعیت سے بے خبر تھا۔ اُس کے اندر کی نظروں کے سامنے ایک ہی شکل تھی ——— یا اُس شکل کے متعدد رُخ تھے: میر حسن کا نازک ہڈیوں والا پر بند چہرہ، دھیمے قدیم تنجار کی چمک لیے ہوئے تیز آنکھیں، اُس کے بدن کی جھٹکے دار حرکات، ڈری ڈری، مگر تڑی اور پھرتیلی۔ جیسے کہ وہ حکیم کے مطلب میں کھڑا ہے اور دہشت زدہ پُرسکوت آواز میں کہہ رہا ہے، "میں تو آیا ہی ہوں۔" اور پھر، حرکت کا کوئی اشارہ دیے بغیر وہیں کھڑا کھڑا پاؤں سے اُٹھتا ہے اور ایک حیرت انگیز چھلانگ کے ساتھ کمرے کو پار کر کے بھوت کی مانند اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے، نہ پاؤں کی چاپ چھوڑتا ہے نہ نشان! اب یہاں کیسے پہنچ گیا ہے؟ کب سے یہاں پر ہے؟ اُسی وقت سے؟ مجھے اُس کا پتا کیوں نہیں چلا؟ واپس گُم شدہ جا کے آیا ہے یا یہیں پر رہا ہے؟ رُخ بدلتا ہے، اب کیسے اعتماد سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دروازے میں سے نکلتا ہے اور ایک طرف کو چل پڑتا ہے۔ جیسے اُسے پوری خبر ہے کہ کدھر کو جا رہا ہے، مگر اُسی چال سے، اُسی حرکت کے ساتھ، بازو کو جھٹکے سے ہوا میں اُٹھاتا اور گراتا ہوا، باتیں کرتا ہوا، بھوت کی طرح پھر اندھیرے میں غائب ہو جاتا ہے۔ کیا اُسے بھی ذوالفقار نے بھرتی کیا ہوگا؟ ضرور کیا ہوگا۔ پھر ذوالفقار نے کیوں مجھ سے اِس کا ذکر نہیں کیا؟ میں اُس کا نام چھپاتے پھرتا ہوں اور کوئی مجھ کو اُس کی خبر ہی نہیں دیتا۔ یہ کیسا انصاف ہے۔

اُس کے ذہن پر ایک ضرب اور پڑی۔ انصاف! یہ کیا چیز ہے۔ یہ قدیم آفت! شُبہے کے دباؤ کے ساتھ ساتھ اب انصاف کے تاریک عفریت نے اُس کے دل میں کروٹ لینی شروع کر دی تھی۔ اسد کے اندر ایک شدید کرب کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ اِس عفریت کو سر کرنے کے لیے اُس نے جان کی بازی لگا دی تھی ——— اُس نے ایک لمحے کے لیے سر فخر سے اونچا کر کے سوچا ——— مگر یہ بلا وہیں کی وہیں موجود تھی۔ کیا ہر قدم پر، ہر موڑ پر، ہر مرحلے پر جان کی بازی لگانا ضروری ہے؟ کیا یہ قصّہ کبھی طے نہیں ہوتا؟ یہ کیسا انصاف ہے، اُس نے سوال دل میں دہرایا، پھر اپنے سوال کی حماقت پر تلملا اُٹھا۔ اُس کے دل میں شدید مایوسی کی ایک لہر اُٹھی۔ اُس نے سمجھا تھا کہ اگر وہ خاموشی سے حالات کا شکار بنے رہنے کی بجائے اپنے ارادے کا، اپنے عہد کا ایک قدم اُٹھا کر حالات کا شکار کرنے کو نکلے تو اُس کا معاملہ طے ہو جائے گا۔ مگر معاملہ طے کہاں ہوا تھا؟ اُس کی آنکھوں کے سامنے سلاخوں

کے عقب میں خوشی کا بے نقش چہرہ تھا جو اُس کے فہم میں نہیں آتا تھا، جو میر حسن کا چہرہ بھی ہو سکتا تھا اور جو اُس کا اپنا چہرہ بھی تھا۔ انصاف کیا چیز ہے؟ کہاں ملتا ہے؟ حقیقت میں یہ چہرہ کس کا چہرہ ہے جسے وہ ڈھونڈ نہیں سکتا؟ وقت کا دباؤ، جس کو اُس نے پوری قوت سے ایک دھکا دیا تھا، اب پھر اُس کو گھیرے میں لے رہا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے، اُس تنگ ہوتے ہوئے گھیرے میں محبوس بیٹھا تلملاتا رہا، اور آج کئی روز کے بعد اُس کا سینہ بھاری ہونا شروع ہوا۔ اِس کا پتا نکالنا کوئی مشکل بات نہیں، اُس نے سوچا، ریاض کو علم ہے یہ کہاں رہتا ہے، اِس کے ساتھیوں کو بھی ریاض جانتا ہوگا۔ میں اِس تک پہنچ جاؤں گا۔ اِس نے جُرم اگر کیا نہیں تو اسے علم ضرور ہے، ورنہ اِس طرف کیوں آتا۔ اسے کیا ضرورت تھی؟ سانس کی کاوش سے تھک کر اُس نے کمر سیدھی کی اور دیوار کے ساتھ اونچا ہو کر بیٹھ گیا۔

میں اس کا سراغ لگا کے رہوں گا، وہ دل میں گرجا۔

اسد نے آنکھیں اُٹھائیں تو ریاض سامنے کھڑا تھا۔ "چلو۔" ریاض نے کہا۔

وہ دونوں گھر سے باہر نکل آئے۔ قصبے سے نکل کر وہ پہاڑوں کی تاریکی میں داخل ہوئے تو ریاض بولا:

"میں نے کام نکال لیا ہے۔"

"کیا کام؟"

"سپاہیوں کے ساتھ۔"

"جا رہے ہو؟" اسد اشتیاق سے بولا۔

"ہاں۔"

"کب؟"

"کل۔"

"اتنی جلدی کام کیسے بن گیا۔"

"ایک گھنٹے کی بک بک کے بعد مانا ہے سور کا تخم۔"

"ایک گھنٹہ!" اسد حیران رہ گیا۔

"اور کیا۔ تم سو رہے تھے۔"

"کیا کہتا تھا؟"

"کہتا تھا غلام ساتھ چلے۔ یا عُمر۔"

"اور سلطان؟"

"پہلے وہ بھی کہتا تھا عمر چلے۔ جب اُس نے دیکھا کہ میں ہر صورت میں ساتھ چلا ہی جاؤں گا تو میری طرف داری کرنے لگا۔"

"تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا بیس بیس کوس تک میں علاقے کے ایک ایک پتھر کو جانتا ہوں۔ عمر میرا مقابلہ کیا کرے گا۔ اصل میں عمر پہلے جا چکا ہے۔ بس یہی بات ہے۔"

"اس قدر چپ چاپ کیا باتیں کر رہے تھے؟" اسد نے پوچھا۔

"چچا نے کام خراب کیا ہے سارا۔ اُس نے حکم لگا دیا کہ یہاں پاس پاس کے علاقے میں کارروائی نہیں ہو گی۔ بس۔ کہتا ہے پہلے ہی ہمارے بہت سے آدمی چھاپے میں چلے گئے ہیں۔ اگر پھر اتنی جلدی ادھر گڑبڑ ہوئی تو ہمارا کام سارا تباہ ہو جائے گا۔ لوگ مخالف ہو جائیں گے۔ یہی اُس کے ساتھ بحث کر رہا تھا۔"

"یہ اُن کا لیڈر تھا؟" اسد نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ تو سپاہی ہے ہی نہیں۔ کوئی اور آدمی ہے۔ شاید تمہارے جیسا ہے۔ نیا ہے۔"

"پیسے بھی لیا ہے؟"

"ہاں۔"

"سپاہی کہاں پر ہیں؟"

"لنگری سے چار کوس اُدھر۔"

"اتنی دور؟"

"ہاں۔ چچا نے کام خراب کیا ہے۔ وہ علاقہ اچھا نہیں۔"

"کیوں؟"

"بستیاں کم ہیں۔ جو ہیں چھوٹی چھوٹی ہیں جیسے سوکھے ہوئے دریا ہوں۔ سڑک کے اِدھر اُدھر میدان بہت ہے۔ خیر۔" وہ بولا۔ "ایک آدھ جگہ اچھی ہے۔"

"تم اُس علاقے کو جانتے ہو؟"

"ہاں۔" ریاض نے کہا۔ "چلو گے؟"

"میری بات تم نے کی ہے؟"

"نہیں۔ مگر تمہیں کس کا ڈر ہے۔ چلے چلنا۔"

"اگر واپس کر دیا تو؟"

"تو میں کہہ دوں گا تمہارے بغیر میں نہیں جاتا۔"

اسد کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑ رہا تھا اور اُس کے دل میں سنسناہٹ پھر رہی تھی۔ وقت کے دباؤ کو ایک اور دھکا لگا تھا اور اُس کا گھیرا ٹوٹ رہا تھا۔ اب اُس کا بدن ہلکا پھلکا تھا اور اُس کے قدموں میں اُڑان تھی۔

"ماں کو نہ بتانا۔" ریاض نے کہا۔

"اچھا۔"

رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹا اور اُس نے آنکھیں بند کیں تو سلاخوں والے چہرے کہیں دُور پیچھے جا چکے تھے۔ اب اُس کی آنکھوں کے آگے، ہمیشہ کی طرح، یاسمین کا متبسم چہرہ اور نیند کا آرام تھا۔

(۱۰)

سہ پہر کے وقت ریاض اور اسد گھر سے روانہ ہوئے ۔ لنگری کا گاؤں چار کوس سے اُس طرف تھا ۔ وہ دونوں چار کوس کے راستے سے جانے کی بجائے اوپر سے ایک لمبا چکر کاٹ کر لنگری پہنچے ۔ وہاں وہ جبار کے گھر پر رکے ۔ جبار اُس علاقے میں اُن کا اپنا آدمی تھا ۔ اسد کو اُس کی شکل جانی پہچانی لگی ۔ اُس نے خیال کیا تو اُسے یاد آیا کہ جبار اُن تین آدمیوں میں سے ایک تھا جو رات کو دین کے گھر پر دیدار کے ساتھ بیٹھے تھے ۔ جبار نے کڑی مشکوک نظروں سے اسد کو دیکھا ۔

" یہ علی ہے " ریاض نے اُس سے کہا ۔

" عمر نہیں آیا ؟ " جبار نے پوچھا ۔

" میں اور علی جا رہے ہیں "

جبار نے آہستہ آہستہ دو تین بار سر ہلایا ۔

کچھ دیر کے بعد اسد نے ریاض سے پوچھا : " جبار حسن کو جانتا ہے ؟ " ریاض نے جبار سے ذکر کیا تو

اُس نے جواب دیا کہ وہ بیلے کے تقریباً سب آدمیوں کو جانتا ہے ، مگر اِس نام کا اُن میں کوئی نہیں ۔ اسد اُس کا حلیہ بیان کرنے لگا ، پھر خاموش ہو رہا ۔ اِس سؤر کا پتا نہیں کیا نام ہے ، اِدھر اس نے سوچا ۔

جبار کے گھر پہ انہوں نے شام کا وقت گزارا اور کھانے پینے سے فارغ ہوئے ۔ جب اندھیرا پڑ گیا تو وہ وہاں سے چل پڑے ۔ رات اندھیری تھی ۔ اِس علاقے میں اسد پہلے نہیں آیا تھا ۔ لنگری سے نکل کر اُس نے دیکھا کہ پہاڑ کھلنے شروع ہو گئے ہیں اور ستاروں کی روشنی دُور تک جانے لگی ہے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میدانی علاقہ جگہ جگہ نمودار ہو رہا ہے ۔ اسد نے اندازہ لگایا کہ یہ علاقہ پہاڑوں کے بیچ ایک سرسبز وادی کی شکل میں تھا جہاں مکی اور مرچی کی کاشت ہوتی ہوگی ۔ درختوں کی اگاس ایک جیسی دبتی بلکہ جگہ جگہ گھنے جھنڈ تھے جو غالباً اکا دکا کاشت کاروں کے مکان تھے ۔ وہ اُن جھنڈوں اور کھیتوں سے بچتے بچاتے ، پہاڑ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے ۔ ریاض آگے آگے چلا جا رہا تھا ۔

" وہ سامنے والی پہاڑی ہے نا ؟ " ریاض نے کہا ۔

" ہاں "

" ایک چوکی ہے "

" پولیس کی ؟ "

" فوجیوں کی ۔ سڑک کی حفاظت کے لیے بیٹھے ہیں ۔ بتی نہیں جلاتے سؤر ۔ یہ رستہ وہاں سے جاتا ہے جس کو پتا نہ ہو وہ سیدھا چوکی پہنچ جائے "

" اچھا " اسد نے مرعوب ہو کر کہا ۔

" اب کھیتیوں کے اندر سے چکر کاٹنا پڑے گا ۔ پچھلے سال کام خراب کر دیا ۔ ہمارا فس کلاس علاقہ تھا ۔ جہاں چاہو پکڑ کر مار لو "

" آہستہ بولو " اسد نے کہا ۔ " آواز دُور جاتی ہے "

" مجھے آواز کا اندازہ ہے ۔ چوکی تک نہیں جاتی "

" سلطان ٹھیک ہی تو کہتا ہے " اسد نے بات کی ۔ " سب لوگ پکڑے گئے تو پھر ؟ "

" ہُنہہ ! " ریاض حقارت سے بولا ، " سو چھاپے پڑ چکے ہیں ، ابھی تک ہمارے زیادہ آدمی باہر ہیں ۔ ورنا بے سپاہی ہو گیا ہے "

وہ اب ایسے آسمان کے نیچے سے گزر رہے تھے جہاں ہلکے ہلکے بادل تھے ۔ تاریکی میں اضافہ ہو گیا تھا ۔

وہ درختوں سے دُور دُور، کسانوں کے کتّوں سے خبردار، راستہ چھوڑ کر پہاڑی کا چکر کاٹتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے۔ یہاں آسمان پہ بادل نہ تھے اور رات صاف ہوتی جا رہی تھی۔ اس ایک پہاڑی کو طے کرنے میں ایک گھنٹہ صرف ہو گیا تھا۔ اسد نے نظر دوڑائی تو دُور آگے تاریکی کا ایک جھنڈ نظر آیا جو بلند ہوتا ہوا آسمان سے جا ملتا تھا، جیسے پہاڑ پہ بادل اُتر آئے ہوں۔ مگر آسمان صاف تھا۔

"وہ کیا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"ست سرا۔"

"اچھا!" اسد نے کہا۔ "جلدی ہی پہنچ گئے۔"

"ابھی کہاں۔" ریاض بولا۔ "سڑک پار کر کے نیچے اُترنا ہے۔ پھر تین ڈھیریوں کا چکر کاٹنا ہے۔"

"کیوں؟"

"پہلی ڈھیری پہ چوکی ہے۔"

یہ سات پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا جن کے بیچ سے سڑک بل کھاتی ہوئی گزرتی تھی۔ اس کو پہاڑ بھی شمار کیا جاتا تو ایک نہیں بلکہ دو پہاڑ تھے، ایک سڑک کے اِس طرف اور دُوسرا دُوسری طرف۔ مگر یہ لوگ اسے ست سرا پہاڑ کہتے تھے۔ غالباً کسی زمانے میں ایک ہی پہاڑ ہو گا جس کے بیچ سے سڑک کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ تین چوٹیاں سڑک کے اِس طرف تھیں اور چار اُس طرف۔ اسد حیران تھا کہ فوجی چوکی پہلی چوٹی پہ کیوں واقع تھی جبکہ درمیان کی کسی چوٹی سے سڑک کی بہتر نگہداشت ہو سکتی تھی۔ مگر ریاض نے اُسے بتایا کہ پہلی چوٹی کے پاس سڑک سب سے زیادہ تنگ اور بل دار تھی اور گاڑیوں کو بہت دھیمی رفتار سے لے جانا پڑتا تھا۔ حملے کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ آگے جا کر سڑک سیدھی ہو جاتی تھی اور پہاڑ کھل جاتا تھا۔

"یہ جگہ کس نے تجویز کی تھی؟" اسد نے پوچھا۔

"میں نے۔" ریاض فخر سے بولا۔

"کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں پہ چوکی نہ ہو؟"

"آگے دس کوس پہ ایک ہے، مگر اُس کے پاس ایک پورا کیمپ پڑا ہے۔ اس علاقے میں اِس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔"

"چوکی کے قریب حملہ کرنے میں خطرہ نہیں؟"

"خطرہ تو ہر جگہ ہے۔ چوٹی پہ بیٹھے بیٹھے پاؤں پھسل جائے تو تمہارا پتا بھی نہ چلے۔" ریاض ہنس کر بولا۔ "مگر

ہم اُس طرف کی چوتھی ڈھیری سے کریں گے۔ چوکی سے ایک کوس پرے ہے۔"

"آواز نہ آئے گی؟"

"اوہوں۔" ریاض نے نفی میں سر ہلایا۔ "بیچ میں دو اونچی ڈھیریاں پڑتی ہیں۔"

"اور آواز جو پہاڑیوں میں پلٹ پلٹ کر چلتی ہے؟"

"کہیں کہیں چلتی ہے۔ اِن میں نہیں چلتی۔ جہاں ہم ماریں گے اُس کے سامنے کچھ بھی نہیں، نہ کوئی ہے نہ پہاڑ۔ کھیتیاں ہیں۔"

"دھماکے کی آواز بھی نہیں آتی؟"

"اوہوں۔"

"فوجیوں کو اس بات کا علم نہیں؟"

"ہو گا۔ مگر وہ سوچتے ہوں گے وہاں کوئی بیوقوف ہی حملہ کرے گا۔ اُن کا دماغ بھی زیادہ نہیں چلتا، ہتھیار چلتے ہیں۔"

اسد اُس کی ہشیاری سے مرعوب ہو گیا۔ اُس نے اندھیرے میں پیار سے اُس نوجوان لڑکے کی طرف دیکھا جو ایک عام کشمیری کسان تھا مگر اپنی جان سے بے خبر تھا، اور اسد کے دل میں اُس کی خاطر ایک وسوسہ پیدا ہوا۔ ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ اگر یہ شخص وقت کی زد سے بچ رہا تو چند سال میں ایک علاقے کو سنبھالنے کے قابل ہو جائے گا۔

انہوں نے اونچے نیچے کھیتوں میں سے رستہ نکال کر چھوٹے بڑے پتھروں کو پھاندتے ہوئے بے آواز قدموں سے سڑک پار کی اور دوسری طرف اُتر گئے۔ اندھیروں میں سایوں کی مانند مستقل متحرک، وہ پہاڑ کی پھیلی ہوئی جڑوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے۔ آخر دوسری پہاڑی کے عقب میں پہنچ کر ریاض پہلی بار رُکا۔ پہاڑ کی جانب پُشت کر کے وہ ایک منٹ تک تین طرف نظر دوڑاتا رہا۔ کچھ دُور پر درختوں کے چند جھنڈ تھے۔ اُس نے اُن میں سے دائیں طرف والے جھنڈ کی سیدھ لی اور چل پڑا۔

یہ جگہ جو دُور سے گھنا جھنڈ معلوم ہوتی تھی اصل میں درختوں کا ایک کھلا سا ذخیرہ تھی جس میں ایک طرف کو چند جھاڑیاں اُگی تھیں اور روشنی اندر زمین تک پہنچ رہی تھی۔ وہ دونوں چند سیکنڈ تک ذخیرے کے کنارے پہ رُکے چوکس جانوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ پھر ریاض نے مُنہ کھولا اور دھیمی مگر صاف آواز میں بولا:

"فس کلا بیا۔"

اُس کے بولنے کی دیر تھی کہ پودوں میں حرکت شروع ہوئی۔ کلک۔ کلک۔ آہنی ہتھیاروں کی مخصوص آوازیں۔

اسد نے آنکھیں پھیلا کر دیکھا کہ جنہیں وہ جھاڑیاں سمجھا تھا وہ آدمی تھے۔ اسد اور ریاض درختوں میں چلتے ہوئے اس جگہ پہنچے جہاں وہ سب اب کھڑے تھے۔

"ریاض؟" ان میں سے ایک بھاری سرگوشی میں بولا۔

"ہاں"

"فرسٹ کلاس۔ عمر نہیں آیا؟"

"نہیں"

"یہ کون ہے؟"

"علی عمر کی جگہ آیا ہے۔ سارے علاقے کا واقف ہے"

اسد اس کی دیدہ دلیری پر ششدر رہ گیا۔

"ہوں" اس آدمی نے سر ہلاتے ہوئے، اندھیرے میں سخت نظروں سے اسد کو دیکھا "علی"۔ اس نے زیرِ لب دہرایا۔ "مجھے بتایا گیا تھا کہ تم آؤ گے یا عمر۔" وہ ریاض سے بولا، "ہمیں ایک کی ضرورت ہے۔ فالتو آدمی کو ساتھ نہیں لے جا سکتے۔"

"علی فالتو نہیں۔ میرا ساتھی ہے" ریاض جرأت سے بولا، "ہم دونوں ساتھ چلتے ہیں"

"باشے کا ہے؟"

"ہاں" ریاض نے برملا کہا۔

اسد کو اس پر غصہ آنے لگا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اگر بات زیادہ بڑھی تو وہ اپنا آئیڈنٹٹی کارڈ وغیرہ بتائے گا اور یہ لوگ، جو غالباً سپیشل سروسز گروپ سے تعلق رکھتے تھے، اسے سمجھ جائیں گے۔ اس کے بعد بھی اگر وہ اِس مشن پر اسے ساتھ لے جانے پر راضی نہ ہوتے تو خیر ہے، وہ لوٹ آئے گا۔ مگر اب ریاض نے اس کی اصلیت کو چھپا کر کام خراب کر دیا تھا۔ اب اگر وہ کچھ کہتا ہے تو ریاض کا کیا بنے گا، اسد نے سوچا۔ اسد کو اس کام کا تجربہ تو نہ تھا مگر اس کے موٹے موٹے اصولوں سے وہ واقف تھا۔ چھوٹے سے چھوٹا شبہ بھی ہو تو سب کام کینسل اور آگے کی راہ لو، یہ اس کا پہلا اصول تھا۔

اسد یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آدمی جو اس گروپ کا لیڈر معلوم ہوتا تھا، اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم اس علاقے میں رہتے ہو؟"

"ہاں"

"کہاں رہے ہو؟ کیا کرتے رہے ہو؟"

"بارہ سال کی عمر تک لنگری میں رہا ہوں" اسد نے کشمیری لہجے میں جواب دیا۔

وہ شخص ایک منٹ تک اسد کو دیکھتا رہا۔ اسد کو وہ ایک ایسے جانور کی طرح معلوم ہوا جو اچانک کود کر اپنے شکار کو دبوچ لینے کی غرض سے بدن کو سنبھال رہا ہو۔ پھر وہ آدمی مڑا اور چار قدم دور جا کھڑا ہوا۔ وہاں وہ اپنے گروپ کے دو اور آدمیوں سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔ ایک مختصر سی بات کر کے وہ تینوں خاموش ہو جاتے، پھر دوبارہ سرگوشیوں میں بولنے لگتے۔ چند منٹ تک اسی طرح وہ باتیں کرتے رہے۔ پھر ان کا لیڈر ریاض اور اسد کی جانب بڑھا۔

"مجھے بتایا کیوں نہیں گیا" اس نے غصے سے بات کی، "مجھے پہلے اطلاع کیوں نہیں دی گئی؟"

"میں نے رات کو کہا تھا عمر نہیں آ سکتا، میں آؤں گا" ریاض نے ایک احمقانہ دلیل پیش کی۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے" وہ شخص بے صبری سے بولا، "آج کا کام ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر میں اس بات کی انکوائری ضرور کراؤں گا۔ میں تمہیں پہلے وارن کر رہا ہوں۔ مجھے انفارم کیوں نہیں کیا گیا؟ چلو"

وہ شخص غصے میں تھا۔ اب وہ درختوں سے نکل کر واپس پہاڑ کی جانب جا رہے تھے۔ اسد نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب وہ چپ چاپ رہے گا اور جہاں تک ممکن ہو سکا اس گروپ کے اندر اپنی موجودگی کو کم سے کم ظاہر کرنے کی کوشش کرے گا تاکہ یہ لوگ اطمینان سے اس مہم کو سر کر سکیں۔ وہ اب پہاڑ تک پہنچ گئے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ آگے آگے ریاض اور اس کے ساتھ گروپ لیڈر جا رہا تھا۔ کوئی بنا بنایا راستہ نہ تھا، چنانچہ وہ سب ایک لائن میں چلنے کی بجائے بے ترتیبی سے پھیل کر چلتے ہوئے اپنا اپنا راستہ نکالتے جا رہے تھے۔ ریاض اور اسد سمیت وہ تعداد میں کل نو تھے۔ اسد چوتھے نمبر پر چل رہا تھا۔ کچھ دیر سے اسد محسوس کر رہا تھا کہ ایک آدمی جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا، مستقل اس کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اگر کوئی چٹان رستے میں آ جاتی جس کے گرد سے ہو کر آگے جانا پڑتا تو جس طرف سے اسد جاتا اسی طرف سے وہ آدمی بھی جاتا۔ اسد اگر بائیں مڑتا تو وہ شخص بھی بائیں کو مڑ جاتا، اگر دائیں کو جاتا تو وہ بھی دائیں کا رخ کرتا۔ چلتے چلتے جب راستے میں ایک رکاوٹ آئی تو اسد پہلے ایک طرف کو مڑا، پھر جیسے ارادہ بدل کر دوسری طرف کو ہو لیا۔ وہ شخص بھی عین اس کی تقلید میں مڑ گیا، جیسے اس کی نقل کر رہا ہو۔ کچھ دیر کے بعد اسد دل میں اس کھیل سے تنگ ہونے لگا۔ اس نے سوچا کوئی ایسا طریقہ ہو جس سے وہ اس آدمی پر واضح کر سکے کہ اس کو اس بات کا علم ہے کہ وہ اس شخص کی نگرانی میں چل رہا ہے۔ دو ایک بار اسد نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا، مگر تاریکی کی وجہ سے ان کی نظروں کا ٹکراؤ نہ ہو سکا۔ بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔

وہ خاموشی سے چلتے رہے۔

آخر تنگ آ کر ایک جگہ پر اسد اچانک رُکا اور رُخ بدل کر پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ دو تین قدم اُوپر جا کر اُس نے شلوار کھول اور پاؤں کے بل بیٹھ گیا، جیسے پیشاب کر رہا ہو۔ اُس کا نگران گھبرا کر اُس کی طرف دیکھتا رہا، پھر وہ بھی شلوار کھول کر جہاں کھڑا تھا وہیں پر بیٹھ گیا۔ اسد کان لگائے بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ جیسے ہی اُس آدمی کے پیشاب کی آواز اُس کے کان میں پڑی، وہ تیزی سے اٹھا، شلوار باندھتا ہوا بھاگ کر نیچے اُترا، اور تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا، جیسے اپنے ساتھیوں سے جا ملنا چاہتا ہو۔ پیشاب کرتے ہوئے آدمی نے یہ دیکھا تو اُس نے اُٹھنے کے لیے ایڑیاں اُٹھائیں، اُس کے حلق سے ایک بند سی آواز پیدا ہوئی، پھر اُس کی ایڑیاں نیچی ہو گئیں، دوبارہ اُٹھیں، نیچی ہوئیں، اُس نے غصّے اور خجالت کی ملی جلی کیفیت میں مُنہ کھولا مگر آواز روک لی۔ اب وہ اپنی ایڑیوں پہ مستقل اُٹھ اور بیٹھ رہا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ جب تاریکی اور آڑ کی وجہ سے اُسے کچھ نظر نہ آیا تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دانتوں میں کُرتے کا دامن دبائے، دونوں ہاتھوں میں شلوار اور پیشاب کی دھار کو سنبھالے جھکا جھکا ہانپتا ہوا اسد کے پیچھے چل نکلا۔ اسد پیٹ میں ہنسی دبائے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ آدمی پتھروں پہ کودتا پھاندتا اسد کے پاس پہنچا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر مضبوطی سے اسد کا بازو اپنی گرفت میں لیا اور رُک گیا۔

اسد نے سر موڑ کر اُس کی طرف دیکھا۔ کئی لمحوں تک وہ اسد کا بازو اپنے ہاتھ میں سختی سے دبائے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسد کا خیال تھا کہ اب وہ مُنہ کھولے گا، گالی دے گا یا کچھ بولے گا، مگر وہ کھڑا اُس کی طرف بس دیکھتا رہا، جیسے کہہ رہا ہو، خیر ہے بچے، اِس دفعہ چھوڑ دیتا ہوں، مگر اگلی بار یاد رکھو گلا دبا دوں گا۔ پھر اُس نے اچانک اسد کا بازو چھوڑ دیا اور سر کے اشارے سے اُسے چلنے کو کہا۔ اسد اطمینان کا سانس لے کر چل پڑا۔

اسد اور اُس کا نگران اب اُس قافلے کے آخر پہ چل رہے تھے۔ وہ مختصر سا بے آواز قافلہ تیز رَوی سے چلتا ہوا اب آخری سے پہلی پہاڑی کے دامن میں پہنچ چکا تھا۔ اسد ایک چٹان کے عقب سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ ان کا لیڈر اور ریاض چٹان کی آڑ میں رُکے کھڑے تھے۔ اسد اُن کے پاس ٹھہر گیا۔

"علی" لیڈر کرختگی سے بولا۔

اسد نے خاموشی سے اُس کی طرف دیکھا۔

"تم آگے چلو"

"میں؟"

"ہاں، تم"

"کہاں؟" اسد نے بیوقوفوں کی طرح پوچھا۔

"اگلی پہاڑی پر"

اسد نے ایک لمحے کو ریاض کی طرف دیکھا۔ ریاض خاموش کھڑا رہا۔ اسد بے توقف چل پڑا۔ تیزی سے چلتا ہوا وہ گروہ کے دوسرے لوگوں کو ایک ایک کر کے پیچھے چھوڑنے لگا۔ چند ہی سیکنڈ میں وہ سب سے آگے پہنچ چکا تھا۔ گروپ لیڈر اُس کے پیچھے، اور تیسرے نمبر پہ ریاض آ رہا تھا۔ باقی چھ آدمی اُن کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ اسد نے ایک بار پیچھے مُڑ کر دیکھا۔ اُس کے ساتھ لگا ہوا آدمی کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ اُس کی جگہ اب گروپ لیڈر نے لے لی تھی۔ اسد کے دماغ میں خیالات تیزی سے گھوم رہے تھے۔ اُس کی ٹانگوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ اُٹھنے لگی تھی۔ ایک خیال جو دوسرے سب خیالوں پر حاوی ہوتا جا رہا تھا وہ تھا، اب کیا کروں؟ گھبراہٹ ظاہر ہونے دوں یا بے تعلقی سے قدم رکھوں، اعتماد سے چلتا جاؤں۔ ریاض کی باتوں سے وہ اِتنا سمجھ چکا تھا کہ اُن کا کام کیا ہے۔ اِس پہاڑی سلسلے کے بارے میں بھی کچھ تفصیل اُسے مل چکی تھی، مگر اِن پہاڑیوں سے وہ واقف نہ تھا۔ اِس وقت وہ آگے آگے جاتا ہوا محض اپنی حِس کے بھروسے پہ رستہ نکال رہا تھا۔ اُس نے پاتھ فائنڈنگ کی تفصیلات کو یاد کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ساری ٹریننگ اب بیکار ہو چکی تھی۔ اسد کی چال میں تبدیلی آ گئی تھی۔ پہلے وہ لاپرواہی سے گروہ کے ساتھ چلا جا رہا تھا، اب ضرورت سے زیادہ تیزی کے ساتھ، خوفزدہ چوکنے جانور کی مانند جھٹکے دار چال سے چل رہا تھا۔ گروپ لیڈر کی نگاہیں اُس پہ لگی تھیں۔ اُس کے پیچھے چھ اور آدمیوں کی نظریں اُس پہ تھیں جن میں سے ایک ایک منجھا ہوا قاتل تھا اور آنکھیں بند کر کے اُسے موت کے گھاٹ اُتار سکتا تھا۔ اسد کے دل میں ریاض کا خیال آیا۔ ریاض اکیلا کیا کرے گا؟

آخری پہاڑی کے دامن کے وسط میں پہنچ کر وہ رُکا، پھر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بائیں طرف مُڑ کر پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ اُس کی کسی حِس نے اُسے بتایا کہ اِدھر چلو، اِدھر سے چوٹی کو سیدھا رستہ جاتا ہے۔ اُس کا دماغ معطّل ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو جبلّی قوتوں کے اشارے پہ چھوڑ دیا تھا۔ اِس جگہ پہ پہاڑی میں ایک سلوٹ تھی۔ پہاڑوں کا اُس کو اِتنا تجربہ ہو چکا تھا کہ اُس نے یہاں پر چڑھائی کا رستہ پہچان لیا۔ آٹھوں آدمی اُس کے پیچھے پہاڑ پہ چڑھ رہے تھے۔ دل میں اُس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ستاروں کی روشنی تھی جس میں پہاڑ کی شکل نظر آ رہی تھی۔ اب یہ سطح اچھی جا رہی تھی۔ شاید اسی طرح چلتی جائے——

اگر رُک گئی تو؟ ممکن ہے آگے اِتنا بڑا شگاف آ جائے کہ واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ پھر؟ وہیں پول کھل جائے گا۔ پھر وہ کیا کہے گا؟ کہنے کا موقع ہی کہاں ملے گا؟ ریاض تیسرے نمبر پہ تھا۔ اسد کے پیچھے پیچھے کمانڈ لیڈر چلا آ رہا تھا۔ اسد کو علم تھا کہ ایک لغزش ہوئی، اور ایک سیکنڈ نہیں لگے گا، ایک ہاتھ پیچھے سے آ کر اُس کا

منہ بند کر دے گا اور دوسرے ہاتھ کا چھرا اُس کی پشت میں پیوست ہو جائے گا۔ اسد نے اپنی ٹریننگ کو یاد کیا——

"تین سیکنڈ لگتے ہیں۔ ریاض یہاں کیا کرے گا؟"

اسد کا پاؤں ایک پتھر سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ اُس کے کانوں میں اس وقت صرف اپنے قدموں کی اور اپنی سانس کی آواز آ رہی تھی، پیچھے بالکل خاموشی تھی، جیسے آٹھ آدمی نہ ہوں سائے ہوں۔ وہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اِس وقت یہاں پر بالکل اکیلا ہے، اُس کے دائیں بائیں، آگے پیچھے کچھ بھی نہیں، صرف آگے ایک قدم زمین ہے اور پھر ایک بہت بڑا شگاف! اُس کی ٹانگوں میں پسینہ بہہ رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ ایک قدم زمین پہ رکھتا تو پھر آگے ایک قدم زمین نظر آتی۔ خوف کی یہ کیفیت اُس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ جب اُس نے اِن تین سیکنڈ کی ہلاکت کی تربیت لی تھی تو اُس وقت اُسے اِس کی سُرعت کا اندازہ بھی نہ ہوا تھا۔ وہ ایک کھیل تھا۔ اب یہاں وہ موت کے آگے کھڑا تھا۔ مدافعت کی راہیں سوچتے سوچتے اُسے علم ہوا کہ یہ کتنی مہلک تھی۔ وہ مدافعت کے لیے تیار تھا۔ اُسے علم تھا کہ ایک ہاتھ اُس کے منہ پر دائیں طرف سے آئے گا، اور دوسرا چھرے کی نوک والا اُس کے بائیں کندھے کے پیچھے آ کر لگے گا، اور ان دونوں میں آدھے سیکنڈ کا وقفہ ہو گا۔ اِس آدھے سیکنڈ میں اُس نے کیا کرنا ہے؟ اُس نے دایاں کندھا اندر کی طرف موڑ کر، بایاں کندھا باہر کی طرف پھینک کر پاؤں پہ گھوم جانا ہے اور ساتھ ہی دائیں بینی کی ضرب سے دشمن کا چھرے والا ہاتھ ڈیفلیکٹ کرنا ہے۔ اب وہ دشمن کے روبرو ہے۔ اب اُسے سُرعت سے اپنی پیٹھ پر گر کر سیدھا لیٹ جانا ہے اور دونوں پاؤں اُٹھا کر پوری قوت سے دشمن کے پیٹ میں یا سینے پر ضرب لگانی ہے۔
وہ مدافعت کے لیے تیار تھا۔ ہر قدم پر، جیسے ہی اُس کا پاؤں ٹھوس زمین پر پڑتا وہ دائیں آنکھ کے کونے سے دیکھ لیتا کہ اندھیرے میں کوئی اُٹھتا ہوا سایہ تو نہیں۔ اُسے خیال آیا کہ اگر وہ اِس شخص کے پنجے سے بچ کر، اُلٹا اُسے پاؤں کی ضرب سے ہلاک یا مجروح کر دیتا ہے، تو اُس کا اپنا کیا حشر ہو گا؟ یہ آدمی آخر اُس کی اپنی فوج کا ایک افسر تھا! اِس خیال نے اُس کے ذہن کو اور بھی تتر بتر کر دیا۔ کسی ایسے وقت کے لیے ہی اُس نے ایک ہنر سیکھا تھا، اور پہلی بار جب اسے استعمال کرنے کا موقع آیا تھا تو اپنے ہی ایک آدمی پر وار کرنے کے لیے، نہ کہ دشمن پر —— اگر وہ وار کرتا ہے تو مجرم، نہیں کرتا تو مارا جاتا ہے۔ اِس عجیب و غریب صورتِ حال نے اُس کے دماغ کو ماؤف کر دیا۔ پھر اُس کو یہ خیال بھی آیا کہ مجرم بننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ ایک وار بھی کرتا ہے تو پیچھے دوسرے آدمی اُس کو ایک لمحے میں ختم کر دیں گے۔ بچنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ خطرے اور موت کی یہ تیز تر کیفیت بالآخر اسد کے اندر ایک مہیب احساس بن کر پیدا ہوئی —— کہ وہ اِس پہاڑ پر یکہ و تنہا ہے۔ اُس کا کوئی مددگار نہیں۔ ایک مقام پہ پہنچ کر وہ تھکن سے چُور ہو گیا۔

یکبارگی اُس کا دل اُچھلا۔ اُس نے آنکھیں پھیلا کر دیکھا کہ چوٹی کی ٹوٹی پھوٹی لکیر آسمان کے مقابل متحرک تھی۔ ایک وقت میں یہ لکیر اُس کو نظر بھی نہ آ رہی تھی، پھر جب نظر آنے لگی تو اپنی جگہ پہ جم کر کھڑی رہی، جیسے آسمان میں گڑی ہو اور وہ برسوں تک بھی چلتا جائے تو انہیں ہلانے کی سکت نہیں رکھتا۔ اب —— اب ہر قدم پہ وہ چوٹی آسمان پہ پھسلتی جا رہی تھی۔ وہ ایک قدم اوپر اُٹھاتا تو چوٹی نیچے جاتی اور اُسی قدر آسمان سامنے آتا۔ آسمان وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اب یہ پہاڑ اُس کے قبضے میں تھا۔ اسد کا جی چاہا کہ وہ مڑ کر کھڑا ہو جائے اور بازو ہوا میں پھیلا کر پورے زور سے چیخے، یہ لو، میں تمہیں لے آیا ہوں۔ اُس کے بدن میں قوت کا ایک ریلا عود کر آیا اور اُس نے قدم تیز کر دیے۔ لیڈر، ریاض اور اسد ایک ساتھ بھاگتے ہوئے اوپر پہنچے اور چوٹی کی دیوار کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔ سامنے سڑک تھی۔

اسد حیرت زدہ آنکھوں سے اُس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے پاؤں اُس کو عین اُس جگہ پہ لے آئے تھے جہاں اُن سب کو پہنچنا تھا۔ اس مقام سے سڑک تک کا پیدل رستہ مختصر ترین فاصلہ تھا۔ یہاں سے وہ سڑک کو کنٹرول کرتے تھے۔ اُس کے بدن کی سمت صحیح تھی! اسد نے بازو چھاتی پہ باندھ کے دونوں ہاتھوں سے گردن اور کندھوں کو آہستہ آہستہ سہلانا شروع کیا۔ اُس کے بدن نے اُس کا ساتھ دیا تھا۔ اُس کے دماغ میں فتح کا احساس نشے کی طرح چڑھ رہا تھا۔ اُس کی جان یک جا اور معتبر تھی۔ فوجی افسر نے ایک لمحے کو اسد کی طرف دیکھا، پھر پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اسد اور ریاض بھی اُس کے ساتھ پلٹے۔ وہاں پہ اُن تینوں کے علاوہ صرف ایک اور آدمی تھا۔ باقی پانچ اُس راستے کے طول پر، جس سے وہ اوپر چڑھے تھے، فاصلے فاصلے پر کھڑے تھے۔ تین آدمی وہاں سے نظر آ رہے تھے۔ باقی دو تاریکی میں نظروں سے اوجھل تھے۔

"ری ٹریٹ ٹائم کرو۔" افسر نے حکم دیا۔

حکم ملنے پر چوتھے آدمی نے کلائی پہ بندھی ہوئی چمکتے حروف والی گھڑی ننگی کی، اُس کی ایک سوئی کو چابی دبا کر چلایا، پھر ایک لمحے کے لیے اپنے بدن کو سنبھال کر جیسے اُڑنے کی تیاری کر رہا ہو، پوری رفتار سے ڈھلان پہ دوڑ پڑا۔ راستے میں کھڑے جس آدمی کے پاس سے وہ گزرتا، وہ آدمی رستے سے ہٹ جاتا۔ دوڑنے والے کے پیر گویا ہوا پہ پڑ رہے تھے، اُن سے کوئی آواز نہ نکل رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ چوٹی پہ وہ تینوں ساتھ ساتھ کھڑے اندھیرے میں نظریں جمائے رہے۔ کچھ ہی دیر میں وہ شخص واپس آتا ہوا دکھائی دیا۔ اب وہ آرام سے پاؤں جما جما کر چڑھ رہا تھا۔ اُن کے پاس پہنچ کر اُس نے کلائی آگے بڑھائی۔

"چھیانوے سیکنڈ۔" وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔

"گڈ،" افسر نے گھڑی دیکھ کر جواب دیا۔ پھر اُس نے بازو ہوا میں اُٹھا کر رستے پر پھیلے ہوئے آدمیوں کو اُوپر آنے کا اشارہ کیا اور پلٹ کر سڑک کو دیکھنے لگا۔ ابھی تک وہ اسد پر ایک اُڑتی ہوئی نظر ڈالنے کے علاوہ کچھ نہ بولا تھا، چُپ چاپ اپنا کام کرتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں اُس کے دُوسرے پانچ آدمی بھی اُن کے اردگرد آکھڑے ہوئے۔ دو آدمیوں نے بھاری تھیلے، جو انہوں نے اپنے کشمیری کُرتوں کے اندر کندھوں سے لٹکا رکھے تھے، اُتار کر زمین پر رکھ دیے۔

جس مقام پہ وہ کھڑے تھے وہ پہاڑ کی سب سے اُونچی چوٹی نہ تھی بلکہ ایک قدِ آدم قدرتی دیوار کی شکل میں بنی تھی۔ وہاں سے دائیں بازو پر کوئی دو سو فٹ کی بلندی پر پہاڑی کی سب سے اُونچی چوٹی تھی۔ افسر نے ریاض سے مخاطب ہو کر چند لفظوں میں اُسے ہدایات دیں کہ وہ ایک آدمی کو لے جا کر اُوپر والی چوٹی پر چھوڑ دے، پھر واپس آکر دو دُوسرے آدمیوں کو (جن کے نام اُس نے لیے) بائیں بازو پر پتھروں کی اُس دیوار کے پیچھے لے جائے جو ایک نیم دائرے کی شکل میں ذرا پیچھے ہٹ کر سڑک کی جانب واپس جاتی تھی۔ بائیں بازو کی یہ دیوار درحقیقت سڑک سے قریب ترین مقام تھا۔ مگر اس کے آگے راستہ نہیں تھا، دو سو فٹ کی عمودی دیوار کی شکل میں پہاڑ کٹا کھڑا تھا۔

"علی،" ریاض سے فارغ ہو کر افسر بولا، "تم میرے ساتھ آؤ۔"

ایک بھاری تھیلے والے آدمی نے اپنا تھیلا اُٹھایا اور اُن کے ساتھ ہو لیا۔ ایک چوتھا آدمی بھی اُن کے پیچھے چل پڑا۔ چار آدمیوں کا یہ قافلہ اُس پتھر کی دیوار کو پھاند کر دوسری طرف اُتر گیا۔ اسد آگے آگے چل رہا تھا۔ اب اُس کے دل میں خوف کی رمق تک نہ تھی۔ وہ اس پہاڑ سے پہلی بار اُتر رہا تھا مگر اس کے پاؤں کے آگے کوئی خدشہ تھا نہ کوئی ڈر۔ اُس کے قدم بے خوفی سے پتھریلی زمین کو خود بخود تلاش کرتے جا رہے تھے۔ چند منٹ کے اندر وہ سڑک پر کھڑے تھے۔ سڑک پر پہنچ کر افسر نے اس گروہ کی قیادت سنبھال لی۔ اُس نے سڑک کو پار کیا اور اُس کے ساتھ ساتھ اُوپر کو چلنے لگا۔ چند قدم جا کر وہ واپس مُڑا اور سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کئی قدم دُوسری طرف نکل گیا۔ تینوں آدمی اُس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ایک جگہ پہ رُک کر اُس نے سڑک کے پار کی زمین پر نظر دوڑائی۔ اُس طرف دُور تک زمین ہموار تھی۔ آگے جا کر یُوں دکھائی دیتا تھا کہ ایک گھاٹی پڑتی تھی۔ کئی منٹ تک وہ وہاں کھڑا اُس زمین کے ٹکڑے کا اور آس پاس کے علاقے کا معائنہ کرتا رہا۔ پھر وہ مُڑا اور چلتا ہوا آکر اُس مقام پہ رُک گیا جہاں پہ وہ پہاڑ سے اُتر کر سڑک پر چڑھے تھے۔ یہاں سے چوٹی کا وہ مقام، جہاں پہ اُن کا اڈا تھا، قریب قریب سیدھی لائن میں تھا۔ اس جگہ پر کئی بار افسر نے چپل کی ایڑیوں سے دبا دبا کر سڑک کے دونوں طرف کی زمین کا معائنہ کیا۔ "سخت ہے۔" اُس نے اپنے

دونوں آدمیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ پھر وہ زمین کا خیال چھوڑ کر چوٹی کی طرف مُنہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ ہوا میں اُٹھا کر لہرایا۔ اُوپر سے ایک بازو آسمان کے مقابل اُٹھا، اور اُس میں اِس قسم کی حرکت ہوئی جیسے کرکٹ کی گیند پھینکی جاتی ہے۔ چند سیکنڈ کے بعد ایک پاؤ بھر کا پتھر اُن سے کچھ فاصلے پہ آ کر گرا اور لُڑھکتا ہوا سڑک تک چلا گیا۔ افسر نے اب رُخ بدلا اور پہاڑ کی عمودی دیوار کی جانب مُنہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دوبارہ اپنا ہاتھ ہوا میں اُٹھایا۔ اِس بار اُدھر سے ایک بازو اُٹھا اور ایک پتھر اُن کے سروں کے اُوپر سے گزر کر سڑک کے پار زمین پر جا گرا۔ افسر چند منٹ تک اندھیرے میں کان لگائے کھڑا رہا۔ چاروں طرف مکمل خاموشی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی کیڑا بھی زمین پر رینگا تو آواز نکلے گی۔ افسر نے چند بار پھر اپنی ایڑی زمین پہ ماری، اور ذرا ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔

"او کے، سر؟" بھاری تھیلے والے آدمی نے پوچھا۔

"ہاں۔" افسر نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "لگا دو۔" پھر وہ اسد کی طرف دیکھ کر سر کے اشارے سے بولا، "چلو۔"

دونوں پہاڑ پہ چڑھنے لگے۔ اب افسر آگے آگے تھا۔ اُوپر پہنچ کر وہ دیوار پہ چڑھے اور دُوسری طرف چھلانگ گئے۔ افسر نے ہاتھ جوڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں پہ اب اُس کا صرف ایک آدمی کھڑا تھا۔ اُس آدمی نے بتایا کہ نذیر آبزرویشن پہ اُوپر بیٹھا ہے، اور گل محمد اور حق بائیں طرف کو چلے گئے ہیں، ریاض اُن کو لے کر گیا ہے، ابھی واپس نہیں آیا۔ افسر نے اپنے بائیں بازو پر سے آستین اُٹھائی۔ اُس کی کلائی پر ایک بڑی سی گھڑی نما شے بندھی تھی۔ اُس نے دائیں ہاتھ سے اُس کا بٹن دبایا اور اُسے مُنہ کے قریب لا کر بولا: "آبزرویشن کم اِن۔" پھر وہ بٹن چھوڑ کر سُننے لگا۔ چند سیکنڈ کے بعد اُس میں سے خرخراتی ہوئی آواز نکلی: "آبزرویشن ٹُو لیڈر۔ او کے۔ اوور۔" افسر نے دوبارہ بٹن دبایا اور بولا: "او کے آبزرویشن۔ اوور اینڈ آؤٹ۔" پھر اُس نے بٹن کو چھوڑ کر بازو کو آستین سے ڈھک دیا۔

ریاض اُن کے پاس آ کھڑا ہوا۔ افسر نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور جدھر سے ریاض آیا تھا اُس کو دوبارہ اُدھر ہی چلا۔ چلتے چلتے وہ پتھروں کے پیچھے غائب ہو گئے۔ اسد اور دُوسرا آدمی وہاں کھڑے رہ گئے۔ اسد کو خیال ہوا کہ شاید یہ وہ آدمی ہے جو شروع میں اُس کا نگران مقرر ہوا تھا۔ اُس نے غور سے اُسے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کی، مگر اُس آدمی کا لباس اور وضع قطع بالکل دُوسروں کی سی تھی اور اُس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ اسد مُنہ موڑ کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور سڑک کو دیکھنے لگا۔ وہ آدمی سایوں کی طرح کام کر رہے تھے۔ چند منٹ کے بعد ریاض واپس آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ وہ آ کر اسد کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں وہاں دیر تک خاموش کھڑے، پتھر

پہ ٹھوڑیاں رکھے، اُن دو آدمیوں کو نیچے سڑک پر کام کرتے اور چلتے پھرتے ہُوئے دیکھتے رہے۔ رات آدھی سے اُوپر نکل گئی تھی۔ آسمان بہت صاف تھا اور ستاروں کی روشنی تیز ہو گئی تھی۔ تاریکی سے آشنا آنکھیں اب اس بیابان کے ایک ایک پتھر کو دیکھ رہی تھیں۔ اسد نے سر موڑ کر ریاض کی طرف دیکھا۔ ریاض کے چہرے پر شرارت اور تحسین کی مِلی جُلی کیفیت تھی جیسے کہہ رہا ہو، پھنسے تو بُرے تھے، مگر کام نکال ہی لیا تم نے۔ اسد کے دل میں اب کوئی غصّہ نہ تھا۔ اس کے برعکس اُس نے پہلی بار، اتنے لمبے عرصے کی آشنائی کے بعد، ریاض کے لیے حقیقی رفاقت کے جذبات محسوس کیے۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر پیار سے ریاض کی پیٹھ پر ہلکا سا ایک گھونسا جمایا۔ ریاض نے گھوم کر دو اُنگلیاں اُس کے پیٹ میں چبھوئیں۔ اسد دُہرا ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح چپ چاپ چھیڑ چھاڑ کرتے رہے پھر ایک دم رُک کر چوکنے بچّوں کی مانند سڑک پر کام کرتے ہوئے آدمیوں کے سایوں کو دیکھنے لگے۔ اتنے میں افسر بائیں جانب سے واپس آگیا۔ وہ آ کر اُن دونوں کے پاس رُکا اور کئی لمحوں تک سڑک کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا، پھر دائیں اور بائیں، پھر اُس نے اسد کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی اور بولا: "فرسٹ کلاس"

اسد اور ریاض کچھ دُور جا کر ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ افسر اُسی طرح کھڑا سڑک کی جانب دیکھتا رہا۔ اُس کا آدمی اب زمین پر بیٹھ کر اپنے بھاری تھیلے کو ٹٹول رہا تھا۔

"اب کس کا انتظار ہے؟" اسد نے بے صبری سے پُوچھا۔

"روشنی کا۔"

"ابھی کئی گھنٹے ہیں۔"

"ہاں۔" ریاض نے جواب دیا۔

"سڑک کے پار تو سیدھی زمین ہے۔" اسد نے کہا۔

"ہاں!"

"اُدھر بھاگ کر جا سکتے ہیں۔"

"کیوں، مرنے کے لیے؟" ریاض بولا۔ "اُس میدان میں تو گرینیڈ پڑے گا، اور اوپر سے ٹش ٹش ٹش" اُس نے ایک خیالی شین گن دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر کندھے پر جمائی اور لبلبی والی اُنگلی تیز تیز چلانے لگا۔ "ٹش ٹش ٹش ٹش ٹش—" ریاض نے خیالی شین گن ایک طرف رکھی اور سر نفی میں ہلایا۔ "اونہوں۔ وہ تو آڑ تلاش کریں گے۔ اگاڑیوں کے نیچے چھپیں گے یا پتھروں کے پیچھے۔ یا زمین پر لیٹ جائیں گے۔ پھر ٹش ٹش—" اُس نے اپنے ہاتھ دوبارہ پوزیشن میں اُٹھا کر لبلبی دبائی۔ پھر وہ ہاتھوں کو اُسی طرح اُٹھائے اُٹھائے یُوں دائیں سے

بائیں چلانے لگا جیسے گولیوں کی بوچھاڑ مار رہا ہو، "ٹشو ٹشو ٹشو ٹشو ٹشو——"

اسد آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔ ریاض ایک چھوٹے سے بچّے کی مانند دکھائی دے رہا تھا جو خوشی میں کوئی خیالی کھیل کھیل رہا ہو۔ اُس کی لبلبی کی اُنگلی برابر چل رہی تھی، اور اُس کے مُنہ سے آوازیں نکل رہی تھیں:

"ٹشو ٹشو ٹشو——"

"اُنگلی کیوں چلائے جا رہے ہو؟" اسد نے کہا۔

"دو دو گولیاں مار رہا ہوں۔ یا تین تین برسٹ نہیں رہے ہیں؟"

اچانک اسد کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے ریاض کی کمر پہ ہاتھ مارا۔ اُس کا شک صحیح نکلا۔ ریاض اپنی شین گن ساتھ لے کر آیا تھا۔ اسد کو علم تھا کہ اِن لوگوں کو ہتھیار ساتھ لانے کی اجازت نہیں۔ اِس بات پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ اگر فوجیوں میں سے کسی کو، خاص طور پہ افسر کو اس کا علم ہو گیا تو کیا ہو گا؟ اور کچھ نہیں تو گن تو ریاض سے چھن ہی جائے گی، یا چھیننے کی کوشش کی جائے گی اور ریاض تو اپنی گن کو ہاتھ نہیں لگانے دے گا۔ پھر؟ ریاض نے اسد کو تشویش سے اپنی طرف دیکھتے ہُوئے پایا تو مُنہ پہ ہاتھ رکھ کر اُسے چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"تم نے اِن کی گنیں دیکھی ہیں؟" اُس نے سرگوشی میں اسد سے پُوچھا۔

"اُدھر کیمپ میں دیکھ چکا ہوں۔"

"میری تو اِن کے پاسنگ بھی نہیں۔ اتنی سی ہیں۔" ریاض نے کہنی پہ ہاتھ رکھ کر اُن کی لمبائی بتائی، "کاغذ کی طرح ہلکی ہیں۔ مگر بڑی شین گن کا مقابلہ کرتی ہیں، ٹانگوں والی مشین گن کا۔" وہ للچائی ہوئی نظروں سے اُس آدمی کی طرف دیکھنے لگا جو اُن سے ذرا دُور اپنے تھیلے میں سے چیزیں نکال نکال کر باہر رکھ رہا تھا۔

اسد کا دل دہل گیا۔ وہ اِس وقت ریاض کے خیالات صاف طور پہ پڑھ رہا تھا۔

"تمہاری گن ٹھیک ٹھاک ہے۔" اُس نے سرگوشی میں ریاض سے کہا، "تمہارے مطلب کے لیے اچھی ہے۔" چند سیکنڈ کے بعد وہ بولا، "ولایتی ہے۔"

"دُور مار نہیں کرتی۔" ریاض اُس آدمی کی طرف دیکھتا رہا۔ "اصلی گن تو اِن کی ہے۔"

چٹان پہ ایک آدمی کا سر نمودار ہُوا، پھر اُس کا دھڑ دکھائی دیا، اور وہ بے آواز پاؤں پہ اِس طرف کو د آیا۔ ریاض اور اسد اُس کے پاس جا کھڑے ہُوئے۔ اُس نے اُچک کر دیوار کے اُوپر سے دو تاروں کے سرے اپنی طرف کھینچے اور کھینچتا ہوا نیچے تک لے آیا۔ تھیلے والے نے اور اُس آدمی نے مِل کر چابک دستی

سے اندھیرے میں تاروں کے سرے بیٹری میں فٹ کیے۔ افسر اس دوران گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے جھک کر کھڑا انہیں کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"اوکے؟" پھر وہ بولا۔

"اوکے، سر۔" بیٹری والے نے جواب دیا۔

افسر نے ہاتھ لمبا کر کے تاروں کو چھو کر دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسد اور ریاض واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر وہاں کھڑا رہنے کے بعد افسر اور تاروں والا آدمی ایک دوسرے کے پیچھے اُچک کر دیوار پر چڑھے اور دوسری طرف اُتر گئے۔ اسد نے اٹھ کر نظر دوڑائی۔ وہ دونوں تاروں کے ساتھ ساتھ اُنہیں چیک کرتے ہوئے نیچے جا رہے تھے۔ جگہ جگہ پر رُک کر افسر تاروں کی پوزیشن کو درست کرتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اسد کی نظر دھندلا گئی۔ وہ ریاض کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ اُس کے اندر خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات تھے۔ اُس کے خیال میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طور پر کیفیت سنبھالے، اِسے محسوس کرے، اس کی حقیقت کو سمجھے۔ اُس کے اندر ایک گھٹن بند لگی تھی۔ ریاض اور غلام کے ہمراہ وہ ٹرک والا واقعہ اِس قدر ناگہانی طور پہ رُو پذیر ہُوا تھا کہ جذبات آناً فاناً میں، جھٹکے کی سی کیفیت سے آئے تھے اور گزر گئے تھے۔ اُس منظر نے اُس کے ذہن پر شوخ چھاپے کی طرح اپنی شکل بنائی تھی اور پھر جلد ہی مدھم پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ اب اِس واقعے کی حقیقت کچھ اور تھی۔ یہ واقعہ ایسے رونما ہو رہا تھا جیسے کوئی بڑی محنت سے، باریک بینی سے اِس کے نقش اُس کے دل پہ کشید کر رہا ہو۔ ایک طویل اور خُنک اِنتظار کے دوران، جب کہ رات قطرہ قطرہ بھیگ کر رینگتی جا رہی تھی اور اِس رات کی بے تابی اوس کی مانند اسد کی ہڈیوں میں ہلکا ہلکا لذیذ درد پیدا کر چکی تھی، جب کہ فوجی افسر واپس آ کر اسی طرح اپنے پاؤں پہ کھڑا ہاتھ پیچھے باندھے اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہا تھا اور ریاض پتھر سے ٹیک لگائے اونگھنے لگا تھا، اسد نے سوچا کہ یہ واقعہ اب سکیم کے مطابق عمل میں آئے خواہ نہ آئے اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اِس کا نشان اُس کے دل میں گہرا اور مستقل ثبت ہو چکا تھا۔ اِس رات کے اندر، چند منٹ کے عرصے میں اُس نے اپنی دائیں آنکھ کے کونے کے اوپر، سانپ کی زبان کی طرح موت کا سایہ لپکتا ہُوا دیکھا تھا یا اِس کا انتظار کیا تھا، اور اُس کی زد سے بچ کر نکل آیا تھا۔ اور یہ سایہ اُس کے ساتھی کا تھا جو اُس کا دشمن بھی تھا۔ اور اب؟ اب وہ خود، کچھ ان دیکھے لوگوں کی گھات میں، اسی موت کے سائے کی ایک شکل کو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ وہ اِس بات کو کس طرح محسوس کرے اور سمجھے! جب رات میں اُن لوگوں کی حرکت رُک گئی اور انتظار شروع ہوا تو اُس

کا ذہن بٹ گیا تھا اور خیال اس محور کی جانب دوبارہ کھنچا جا رہا تھا جو زندگی کے اسرار کا مسکن ہے۔

کون سی صورت سچی ہے اور کون سی جھوٹی؟ وہ کس پر یقین کرے اور کس پہ نہ کرے؟ یہ علت عمر بھر سے اُس کے ساتھ لگی تھی اور موقع بے موقع اُس کے راستے میں آ کھڑی ہوتی تھی۔ وہ اپنے تردد کے اِس بوجھ سے تھک چکا تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اُس نے اپنے ذہن کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ایک ہی صورت تھی، کہ بہت سے فالتو جھاڑ جھنکاڑ کو اکھاڑ پھینکا جائے۔ اُسے ہمیشہ سے یہ حسرت رہی تھی کہ کبھی ایسا ہو کہ اُس کے دل میں صرف ایک خیال، ایک تصور یا ایک جذبہ رہ جائے، اور کچھ بھی نہ رہے، اُس کی زندگی پاک صاف اور روشن اور بے تردد ہو جائے۔ اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی تھی۔ صرف کبھی کبھی یہ خواہش اپنی شدت سے اُس کے ذہن میں روشنی کا ایک جھپاکا پیدا کرتی، جس کے اندر کوئی خیال، کوئی ایک تصور ایک لمحے کے لیے اُس کے اوپر روشن ہو جاتا، پھر وہی بوجھ، وہی تردد۔

اُس وقت وہاں بیٹھے بیٹھے ایک اُڑتے ہوئے لمحے کو اسد کا ذہن شیشے کی مانند صاف ہو گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس وقت دُنیا بھر میں اُسے صرف ایک بات کا یقین ہے کہ ریاض اُس کا رفیق ہے۔ وہ جو آنے والے واقعات پہ کھلے دل سے خوشی کا اظہار کر کے اب آرام سے ٹیک لگائے اونگھ رہا ہے، وقت پڑنے پر اسی آرام سے اُس کی خاطر جان بھی دے دے گا۔ اس بات کا اسے یقین تھا۔ اِس بوجھل اور متضاد دنیا میں چند چیزیں تھیں جو اٹل تھیں، دوستی اُن میں سے ایک تھی۔ اسد نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر ریاض کے کندھے پر رکھ دیا۔ ریاض نے آنکھیں کھول دیں۔

"کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اسد نے کہا۔

"تمہیں تو نیند نہیں آتی۔ سائنس نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔ کسی اور کو بھی سونے نہیں دیتے۔"

"میری سائنس بالکل ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے کہتے رہتے ہو اور ساری رات خرخراتے رہتے ہو۔ جنّی کے پاس گیا تھا ٹنڈ لینے گئے تھے؟"

"تمہارے بس میں ہو تو اُس سے ٹنڈ بھی لے آؤ۔"

"لے آؤں یا دے آؤں؟" ریاض نے مزا لے کر کہا۔

"بڑے بے حیا ہو۔"

"بے حیائی کی کیا بات ہے۔ دیکھا نہیں کیسے مٹک مٹک کر چلتی ہے؟"

"خواہ مخواہ، سیدھی سادی چلتی ہے۔"

"تمہیں ان عورتوں کی عقل نہیں۔ مجھ سے پوچھو۔ سات آسمانوں کی سیر بھی کرادو تو خوش نہیں ہوتیں۔ ٹنڈا مانگتی ہیں ——"

اس مشکل مقام پر بیٹھے، ایک مہلک رات کا طول کاٹتے ہوئے اسد کو ان ننگی باتوں میں لطف آنے لگا۔ ریاض کی باتیں سننے کے لیے وہ جان بوجھ کر اسے موقع مہیا کرتا رہا اور اس کے نیم سرد اعضا میں حرارت کی لہر دوڑتی گئی —— بجلی اور آگ۔ اس کے دل سے اڑتا ہوا خیال گزرا خوف اور خطرہ اور مسرت افزا باتوں کی لذت ایک تار ہے۔ آخر جب ریاض اپنے عمر بھر کے قصے چند باتوں میں بیان کر کے، بدن کی پوشیدہ جگہوں کے نام لے لے کر اور ان کے رشتے جوڑ کر سیر ہو گیا تو خوشی سے ہار کر خاموش ہو رہا۔ اسد کے جوڑوں سے اوس کی نمی خارج ہو چکی تھی اور اس کا ذہن صاف ہو گیا تھا۔ اب اس کے اندر خوف اور خطرے کی خالص لذت رواں تھی اور ذہن میں تیقن کی ایک اٹل صورت تھی۔

"ریاض" اس نے نرم آواز میں پکارا۔

"ہوں"

"ساری عمر میں میرے دو دوست بنے ہیں"

"اچھا؟"

"دونوں کا نام ریاض ہے"

"ریاض اچھے ہوتے ہیں"

"ہاں" اسد نے جذباتی لہجے میں کہا۔

ریاض ہنس پڑا "دوسرا کون ہے؟"

"میرے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا"

"اب کیا کرتا ہے؟"

"اب بھی پڑھتا ہے"

"اتنے سال سے پڑھ ہی رہا ہے؟"

"ہاں۔ وکیل بنے گا"

"وکیل؟" ریاض نے مرعوب ہو کر پوچھا۔

"پندرہ سولہ سال پڑھنا پڑتا ہے"

"کب بنے گا؟"

"تین چار سال میں"

"تم بھی وکیل بن سکتے ہو؟"

"ہاں۔ اگر پڑھتا جاؤں تو"

"تو کیوں نہیں بنتے؟" ریاض نے پوچھا، "یا اب افسر ہو گے ادھر؟"

"میں تو عارضی ہوں" اسد نے کہا "اپنی ٹوٹی لے کر چلا جاؤں گا"

"کیا کرو گے وہاں؟" ریاض نے پوچھا "ٹوٹی کھاؤ گے؟" وہ ہنسنے لگا۔

"پھر نہ کچھ کروں گا" اسد نے جواب دیا۔

"ادھر کیوں نہیں رہ جاتے؟"

"ادھر نہیں رہ سکتا"

"کیوں؟"

"کیا کروں گا۔ میں عارضی ہوں" اسد نے کہا "ادھر میرا گھر ہے"

"ادھر کیا کرو گے؟" ریاض نے دہرا کر پوچھا۔

"اخبار میں کام کروں گا"

"خبریں لکھنے کا کام؟"

"ہاں"

"کسی بڑے شہر میں ہی کرو گے"

"ہاں" اسد نے کہا "کسی بڑے شہر میں"

ریاض خاموش ہو گیا۔ اسد نے خیال کیا کہ شاید ریاض اپنے تصور میں اسے کسی بڑے شہر کے اندر خبریں لکھتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد ریاض نے جمائی لی اور دوبارہ ٹیک لگا کر اونگھنے لگا۔ اسد نے آسمان پر نظر ڈالی۔ یاسمین کے چہرے آسمان میں گڑے تھے۔ اسد کا انگ انگ جھرجھرا اٹھا۔ یہ اجالا کیسا ہے؟

اُس نے آنکھوں پر زور دے کر دیکھا۔ صبح ہو گئی ہے یا میری آنکھوں کا فتور ہے؟ شاید صبح ہونے والی ہے۔

فوجی افسر جو تھوڑی دیر کے لیے ایک پتھر پہ بیٹھ گیا تھا، اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سڑک کی جانب مُنہ کر کے کھڑا ہو گیا اور نیچے دیکھنے لگا۔ سڑک والے دو آدمیوں میں سے ایک تیزی سے بھاگتا ہوا اُوپر چڑھتا آ رہا تھا۔ اُوپر پہنچ کر وہ کُودا اور اُن کے پاس آ کھڑا ہوا۔ سنبھلتے ہی اُس نے کلائی پہ بندھی گھڑی افسر کے سامنے کر دی۔

"پچاسی سیکنڈ۔" افسر گھڑی دیکھ کر بولا، "گُڈ۔" پھر وہ اس شخص سے مخاطب ہو کر بولا، "ٹھیک ہے۔ شاباش۔"

وہ آدمی اُچک کر دیوار پہ چڑھا اور نیچے اُتر گیا۔ اِس کھٹ پٹ سے ریاض کی آنکھ کُھل گئی۔ اُس نے کمر پہ ہاتھ پھیر کر اپنی گن کو ٹٹولا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ آسمان پہ اُجالا بڑھ رہا تھا۔ ستاروں کی روشنی لحظہ بہ لحظہ ماند پڑ رہی تھی۔ ریاض اُٹھ کھڑا ہوا۔ نیچے اُترتا ہوا آدمی ایک چھوٹی سی چٹان کی آڑ میں پہنچ کر رُک گیا۔ یہ عمودی چٹان سڑک سے کچھ فاصلے پر پہاڑ کے دامن میں واقع تھی۔ دوسرے آدمی کی جگہ ایک اِسی قسم کے بھاری پتھر کی آڑ میں تھی جو پہلے پتھر سے پچاس قدم کے فاصلے پر تھا۔ اِن دونوں پتھروں کی اور افسر کی آپس میں مکمل تکون بنتی تھی۔ سڑک کا وہ مقام جہاں بارود لگانے کی تیاری ہو چکی تھی ان دو پتھروں کے عین وسط میں اور افسر کی سیدھ میں تھا۔ جب پہلا آدمی پتھر کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا تو افسر نے پھر اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ اب دُوسرا آدمی اپنے پتھر کے پیچھے سے نکلا اور سُرعت سے جا کر بارود کا آخری کنکشن لگانے کا عمل دہرانے لگا۔ عمل پُورا کر کے اُس نے ہاتھ اُوپر اُٹھایا۔ جواب میں افسر نے ہاتھ بلند کر کے دُوسرے ہاتھ پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

"نانوے سیکنڈ۔" وہ بڑبڑایا۔

بارود والا آدمی چند سیکنڈ تک مزید وہاں کھٹ پٹ کرنے کے بعد واپس آ کر اپنی جگہ پہ بیٹھ گیا۔ افسر نے جُھک کر بیٹری والے سے کچھ پُوچھا اور پھر بائیں بازو کے آدمیوں کی جانب چلا گیا۔ اسد نے پیچھے گھوم کر دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ مشرق اُن کی پُشت پہ تھا، اور سارے مشرقی آسمان پر اُجالا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ سڑک کی جانب ابھی گھپ اندھیرا تھا، مگر دوسری طرف سفیدی کی ایک پٹی اُبھرتی آ رہی تھی۔ اِس آسمان پر صرف چند بڑے بڑے شوخ ستارے اٹکے رہ گئے تھے۔ بیٹری والا آدمی چوکنا ہو کر پتھر کی دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُس کے پاس جو آلہ تھا وہ دراصل بھاری بیٹری کی شکل کی کوئی چیز نہ تھی بلکہ ایک جدید قسم کا ہلکا سا چوکھٹا تھا جس کا ایک بٹن دبانے سے برقی رَو رواں ہوتی تھی۔ مگر ریاض اسے 'بیٹری' کہتا تھا۔ بارود والی تاروں کے سرے اُس چوکھٹے کی پُشت میں آ کر لگے ہوئے تھے، اور آدمی چوکھٹے کو احتیاط سے اُٹھائے چوکس کھڑا تھا۔ آبزرویشن والا آدمی اب صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ چوٹی پہ کھڑا

بازو کے اشارے سے غالباً افسر سے باتیں کر رہا تھا جو اسد کی نظروں سے اوجھل بائیں بازو کے آدمیوں کے ساتھ تھا۔ دفعتہً رات کے سناٹے کو توڑتی ہوئی دُور سے کسی گاڑی کے انجن کی مدھم سی آواز آتی ہوئی سنائی دی۔ آواز تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ اسد اور ریاض اور بیٹری والا سر دبا کر بیٹھ گئے۔ قریب آنے پر آواز ایک سے زیادہ گاڑیوں کی معلوم ہونے لگی۔ اچانک پہاڑوں میں بتیوں کی روشنی چمک اُٹھی۔ روشنی کی ایک دیوار پتھروں کو چمکاتی، اندھیرے آسمان میں شعاعیں پھینکتی، شور مچاتی ہوئی گزر گئی۔ اسد کا دل بُری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ شور سے اُس کے کان پھٹے جا رہے تھے۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سڑک سے گاڑیاں نہیں ہوائی جہاز گزر رہے ہیں۔ ٹرکوں کے انجنوں کی اتنی مہیب آواز اُس نے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ اُن کے گزر جانے کے بعد افسر جُھک کر چلتا ہوا بائیں طرف سے نمودار ہوا اور اپنی جگہ پہ پہنچ کر پتھر پہ بیٹھ گیا۔

"کون تھے؟" اسد نے بیوقوفوں کی طرح سوال کیا۔

"کوئی ہوں گے۔" ریاض نے سرگوشی میں جواب دیا، "اندھیرا ہے۔ اُوپر سے کلیر بھی نہیں ملا۔"

افسر نے ہاتھ کے دُرشت اشارے سے انہیں چُپ رہنے کو کہا۔ اُس کی نظریں اُوپر چوٹی پر لگی تھیں۔ اُسے نیچے والوں کی فکر نہیں تھی، نہ بیٹری والے کی، نہ اُدھر والوں کی۔ اب سب کام تیار تھا۔ سب تنے بیٹھے تھے، صرف ایک اشارے کی دیر تھی۔ اسد نے وہاں بیٹھے بیٹھے مشرق کی جانب دُور دُور تک اُبھرتی ہوئی شکلوں کے اُوپر ایک طویل نظر دوڑائی۔ درخت اور پہاڑ اور سپاٹ زمین کے ٹکڑے آہستہ آہستہ اُجالے میں آ رہے تھے۔ اِس تیز اور تنے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ حیرت انگیز سُست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ آٹھ گاڑیاں اوپر گزر گئیں۔ اُن میں پانچ کا ایک قافلہ فوجی گاڑیوں کا تھا۔ ان گاڑیوں کے انجن اور رفتار کی آواز سے اسد کو ان کی پہچان ہوئی اور دیکھے بغیر اُسے پتا چل گیا کہ بتیوں کی روشنی پتھروں پہ نہیں پڑی، سڑک اُجالے میں آ گئی ہے، مگر کام رُکا پڑا ہے یا اُوپر سے کلیر نہیں ملا، گاڑیاں نکل گئی ہیں۔ اگر گاڑیاں دو ہوتیں، اسد نے سوچا، یا تین، اور اُوپر سے کلیر کا سگنل مل جاتا، بازو کا ایک قطعی، عمودی اشارہ، تو گاڑیاں اُدھر اُڑ جاتیں۔ چیزوں کی ترکیب اور ترتیب کیا کام کرتی ہے۔ تاہم زندگی اور موت کا فرق محض اتفاق کی بات ہے۔ اُسے علم تھا کہ صرف یہ مختصر سا وقفہ اُن کے ہاتھ میں تھا، رات اور دن کا یکساں اور تیزی سے بدلتا ہوا وقت، جب وہ رات بھر کی تیاری کو عمل میں لا سکتے ہیں۔ یہ نکل گیا تو سڑک کا ٹریفک تیز ہو جائے گا، اور انہیں اپنے منصوبے کو خیرباد کہنا پڑے گا، یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ ٹرک کو اُڑا کر تتر بتر ہو جائیں گے۔ یہ خیال کر کے اُس کے دل میں اِن لوگوں کے لیے، اُن کی محنت اور مہارت اور اُن کی تندہی کے لیے ایک نامعلوم سا افسوس پیدا ہوا — جیسے کوئی رفاقت

رٹ جائے۔ یہ لوگ بھی آخر اُس کی اور ریاض کی طرح اور دُوسرے ہزاروں لوگوں کی طرح عام آدمی تھے جو روزی کما رہے تھے۔ ایک اتفاق کی بات ان کی کاوش کو ملیامیٹ کر سکتی تھی۔ اسد کے بچپن کا ایک سوال اُس کے ذہن میں آیا۔ یہ اتفاق کیا ہوتا ہے؟ اُس کا باپ بھی، جو دُنیا کی سب باتوں کا علم رکھتا تھا، اِس کا جواب دینے سے قاصر رہا تھا۔ اُس کے باپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ تم بڑے ہو جاؤ گے تو خود ہی سمجھ جاؤ گے۔ وہ بڑا ہو گیا تھا، اور لوگوں کے تخیل کی کتنی ہی شکلیں اُس کے دیکھنے میں آئی تھیں، مگر اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا۔ اتفاق کی بات اٹل رہی تھی۔ اُس کے باپ نے اصل بات پہ آ کر کیسی چال دی تھی۔ اِس اتفاق کا ایک عنصر اِس وقت بازو کا ایک مخصوص اشارہ تھا، ہوا میں ایک عمودی خط کھینچتا ہوا، تیز اور مختصر اور تند! وہ اشارہ کب آئے گا؟ کیسے آئے گا، کیوں آئے گا؟ اتفاق کی بات اٹل بھی تھی اور متحرک بھی، کبھی یہاں کبھی وہاں، اِس کی کوئی جگہ نہ تھی، کوئی وقت نہ تھا، کوئی آسان ترکیب نہ تھی۔ ایک گاڑی، دو گزر گئی۔ یہ ایک کار تھی۔ افسر کی نظریں چوٹی پہ لگی تھیں۔

اب اُجالا اتنا ہو چکا تھا کہ اسد کو اُس گندمی مضبوط چہرے پر آنکھوں کی پتلیاں نظر آ رہی تھیں۔ اُن آنکھوں میں کوئی تاثر نہ تھا، نہ خوف نہ جرأت نہ حسرت۔ انتظار کی بیتابی تھی، ایک عنصر اور ایک لمحہ۔ الگ تھلگ۔ اُس کا رنگ زرد تھا۔

درخت اور پہاڑ اور سپاٹ زمین کے ٹکڑے —— اِس علاقے کا عام منظر۔ مگر اُس وقت اسد کو محسوس ہو رہا تھا جیسے آج تک اِن چیزوں کو اُس نے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا۔ اِس صبح کو آن پہ وقت کا اور روشنی کا ایک تیز جال تنا ہوا تھا جو ایک طرف سے آہستہ آہستہ کھینچا جا رہا تھا، اور جو جگہ ننگی ہو جاتی تھی ایک انوکھی شکل میں نمودار ہوتی تھی، جیسے پہلی بار دکھائی دے رہی ہو۔ تندی سے آسمان کو اُٹھتی ہوئی چٹانیں، جنگلوں کے گھنے پیڑ، ان میں ایک ایسی مقناطیسی کشش تھی جو اُس کی نظر کو بار بار اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شیشے کا سا ٹھہراؤ آ گیا تھا اور نظر اِس وسیع و عریض منظر کی ایک ایک چیز پہ اٹک رہی تھی۔ اُس کی نظر میں چاہت اور حسرت تھی، جیسے وہ اِس سرزمین کو آخری بار دیکھ رہا ہو۔

جب چوٹی پہ آبزرویشن والے کا بازو ہوا میں اُٹھا اور گرا تو اسد کو پتا بھی نہ چلا۔ صرف آنکھ کے کونے سے اُسے نظر آیا کہ افسر اپنی جگہ سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اُس کے ساتھ ہی ریاض، اسد اور بیٹری والا آدمی بھی اُچھل پڑے، جیسے دبے ہوئے سپرنگ ایک ساتھ چھوٹ جائیں۔ افسر نے اپنا بازو ہوا میں بلند کیا۔ بارود والا آدمی پتھر کی آڑ سے نکل کر بھاگا اور سڑک کے کنارے پہنچ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ دُور سے اب موٹر کے انجن کی آواز آنی شروع ہو گئی تھی۔ ایک دو تین چار —— اسد دل میں گن رہا تھا۔ موٹر کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ لمحے تیزی سے گزر رہے تھے۔ چھ سات آٹھ نو —— اسد نے افسر کی طرف دیکھا۔ اُس فوجی افسر کی ساری جان گویا

اُس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ اُس نے اپنی مشین گن پہ ایک مکا جمایا اور دانت پیس کر بولا، "ہری اپ، مین!" دس۔ گیارہ۔ بارود والا آدمی اپنا کام ختم کر کے اب واپس بھاگ رہا تھا۔ افسر کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ وہ تیزی سے اسد اور ریاض کی طرف مڑ کر چیخا: "بیٹھ جاؤ!" وہ دونوں دبک کر بیٹھ گئے۔ افسر پھر اپنی جگہ پہ کھڑا ہو کر سڑک کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ اُٹھا کر کندھے کے برابر لایا اور وہاں روکے کھڑا رہا۔ گاڑیوں کی آواز اب بہت قریب آ گئی تھی۔ بیٹری والا آدمی تاروں والا چوکھٹا گھٹنوں پہ رکھے، بٹن دبانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ افسر نے تیزی سے ایک نظر اُس پہ ڈالی اور پھر سڑک کو دیکھنے لگا۔ ریاض اور اسد افسر کے چہرے پہ نظریں جمائے بیٹھے تھے، جیسے نیچے ہونے والے واقعات کا عکس اُس کے چہرے پہ نظر آئے گا۔ گاڑیاں دو ہیں یا تین ہیں، اسد نے اندازہ کیا۔ ایک سے زیادہ ہیں۔ اب سامنے آ گئی ہیں۔ آواز بالکل سامنے سے آ رہی ہے۔

افسر کا ہاتھ نیچے گرا تو بیٹری والے نے اپنے ہاتھ کا انگوٹھا بٹن پہ رکھ کر سارا وزن اُس پہ ڈال دیا۔ ریاض اور اسد اُچک کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے ٹرک کے اگلے ماڈگارڈ کے عین نیچے دھماکہ ہوا۔ دھواں، گرد اور بڑے چھوٹے پتھر پھوٹ کر سڑک سے نکلے۔ ایک لمحے کے لیے اسد کے اندر ہلکی سی مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ ٹرک اُس کے تخیل کے مطابق نہ پلٹ کر گرا، نہ ہی اُس کے پرخچے دُور تک ہوا میں اُڑتے ہوئے گئے۔ اِس کے برعکس، بھاری ٹرک کے اگلے پہیے ہوا میں ایک فٹ کے قریب اُٹھ گئے اور وہ نیچے آ رہے تھے کہ دھماکے کی زد سے پچھلے پہیے بھی چند انچ اُچھل پڑے، جیسے کوئی چوپایہ اپنی جگہ پر کھڑا کھڑا ہوا میں کود جاتا ہے۔ بظاہر ٹرک کو کوئی اور نقصان نہ پہنچا تھا مگر اُس کا انجن بند ہو گیا، اور وہ لڑھکتا ہوا چند گز کے فاصلے پر سڑک سے اُتر کر رک گیا۔ ٹرک کی باڈی میں بیٹھے ہوئے چار فوجی اور آگے ڈرائیور اور اُس کے ساتھ بیٹھا ہوا ایک فوجی چلا چلا کر آوازیں نکالتے ہوئے کودے اور ٹرک کے پیچھے دبک گئے۔ پچھلے ٹرک کے ڈرائیور نے ایک دم بریک لگائی، پھر اُس نے سٹیئرنگ گھمایا اور سڑک سے اُتر کر پرلی طرف سے نکل جانے کی کوشش کی جہاں سڑک کے تازہ تازہ شگاف کے ساتھ کچھ ہموار جگہ تھی۔ ٹرک کا ایک پہیہ ایک گڑھے میں جا گرا، مگر ڈرائیور نے زور لگایا اور تین چار سیکنڈ کے اندر موڑ توڑ کر اُس نے ٹرک کو کامیابی کے ساتھ وہاں سے نکال لیا۔ آگے رستہ صاف تھا۔ ٹرک کے انجن سے ایک پھنکار بلند ہوئی، اور وہ ایک دھچکے کے ساتھ سڑک پر چڑھا ہی تھا کہ مشین گن کی ایک بوچھاڑ نے اُس کی ونڈسکرین کے ٹکڑے اُڑا دیے۔ ٹرک گھوما اور سڑک کے کنارے پڑے ہوئے ایک بھاری پتھر سے ٹکرا کر جامد ہو گیا۔ اُس کے دروازوں میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ یہ کھلا ٹرک تھا جس کے پیچھے کوئی سوار نہ تھا۔ اگلی سیٹ پہ ڈرائیور کے ساتھ ایک اور فوجی تھا۔ اُن دونوں کے جسم سیٹ پہ اوندھے پڑے تھے۔

پہلے ٹرک کے عقب سے رائفل کے چند فائر ہوئے۔ ایک گولی پہاڑ کے پہلو میں پتھروں کو آ کر لگی۔ اوپر سے

ایک گرینیڈ ٹرک سے چند قدم اِدھر جا کر گرا اور لڑھکتا ہوا ٹرک تلے چلا گیا۔ دوسرا گرینیڈ عین ٹرک کی باڈی پہ پڑا اور اُچھل کر دوسری طرف لُڑھک گیا۔ دونوں گرینیڈ یکے بعد دیگرے پھُوٹے۔ دھُول اور دھماکوں کے ساتھ ہی فضا میں ٹوٹی پھوٹی چیخوں کی آواز بلند ہوئی اور ٹرک کے پیچھے سے چار آدمی بھاگتے ہوئے نکلے۔ ایک فوجی انجن کی طرف سے نکل کر آگے کو بھاگا اور تین ٹرک کے عقب سے پیچھے کو دوڑے۔ آگے کو بھاگنے والا ایک ٹانگ پہ دوڑ رہا تھا۔ پیچھے کو بھاگنے والے اپنی رائفلوں کو سنبھالے جھُک کر دوڑتے ہوئے دو بڑے پتھروں کی پناہ لینے جا رہے تھے جو ان سے بیس قدم کے فاصلے پر تھے۔ اُن چاروں کے سروں پہ آہنی خود تھے۔ چاروں طرف سے اشرسیت پانچ مشین گنیں اُن پر چل رہی تھیں۔ بیٹری والا آدمی کھڑا اطمینان اور سُرعت کے ساتھ بجلی کی دو تاریں کھینچ کھینچ کر انہیں گولے کی شکل میں لپیٹتا جا رہا تھا۔ اچانک اسد کی نظر ریاض پہ پڑی۔ ریاض کی پیٹھ اُس کی طرف تھی اور دونوں پاؤں اُس چٹان پر تھے جس سے ٹیک لگائے وہ اونگھتا رہا تھا۔ اب وہ اُچک کر اُوپر دو چھوٹے چھوٹے اُبھرے ہوئے پتھروں کے درمیان پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اور اپنی چھوٹی سی سٹین گن کو کندھے سے لگائے گولیاں چلا رہا تھا۔ اسد دم بخود کھڑا اُسے دیکھتا رہا، جیسے اُس کے ہاتھ اور پاؤں ایک دم مفلوج ہو گئے ہوں۔ ایک خیال، جو اُس کے ذہن میں آیا وہ تھا، مٹرک تو اُس کی رینج سے باہر ہے!

تین بھاگتے ہوئے فوجیوں میں سے ایک کو گولیوں کی باڑنے آ لیا تھا۔ اُس فوجی نے رائفل ہاتھ سے گرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کو دبوچ لیا، جیسے اپنی سانس بند کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ ایک قدم وہ اسی طرح دوڑتا گیا، پھر گھٹنوں پر گر پڑا اور اپنا گلا دباتے دباتے دُہرا ہو گیا۔ اُس کا خود گر پڑا اور اُس کا سر زمین پر لگ گیا۔ اِس سجدے کی حالت میں اُسے کئی اور گولیاں لگیں۔ اُس کے جسم نے ہلکے ہلکے چند تیز جھٹکے کھائے اور پھر اُلٹا ہو کر پُشت پر گر پڑا۔ اُس کے ہاتھ گردن سے الگ ہو گئے اور وہ سیدھا لیٹا لیٹا چاروں ہاتھ پاؤں تیزی سے اِدھر اُدھر مارنے لگا، جیسے کوئی باریک ٹانگوں والا بھاری کیڑا اُلٹا ہو کر بے بضاعتی سے ٹانگیں ہوا میں چلاتا ہے۔ اُس نے اگلا فوجی گولیوں کی بوچھاڑ کے آگے بے بس ہو کر وہیں پہ گر پڑا اور ایک چھوٹے سے پتھر کے ساتھ چپک کر لیٹ گیا۔ وہاں اُس نے اندھا دھند اپنا سر پتھر کے نیچے زمین میں دھنسنے کی کوشش کی، پھر گولیوں کی زد سے پناہ نہ پا کر اُچھل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی وہ ایک قدم بھی دوڑنے نہ پایا تھا کہ بازو پھیلا کر کسی بھاری کپڑے کی طرح اوندھے مُنہ زمین پر گر پڑا اور بے حرکت ہو گیا۔ تیسرا فوجی ہمت کر کے دوڑتا گیا اور آخر بھاری پتھر تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف کو بھاگنے والا اکلا فوجی لنگڑاتا ہوا، حیرت انگیز طور پر گولیوں کی مار سے بچتا ہوا اُس پتھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس کے ساتھ دوسرا ٹرک جا کر ٹکرایا تھا۔ وہ ٹرک اور پتھر کی آڑ میں پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد ان فوجیوں نے دونوں

جانب سے اپنی رائفلوں کے اِکا دُکا جوابی فائر کرنے شروع کر دیے۔

پھر ایک دم خاموشی ہو گئی۔ چاروں پانچوں مشین گنیں ایک ساتھ رُک گئیں۔ جوابی فائر بھی ختم ہو گیا۔ افسر نے ریاض کی طرف دیکھا اور چیخ کر بولا، "گیٹ ڈاؤن یُو فُول!"

ریاض وہیں لیٹا لیٹا خاموشی سے دانت نکال کر ہنسا۔ افسر نے اپنے ہاتھوں کو کچھ ایسے حرکت دی جیسے مشین گن کا رُخ اُس کی طرف پھیر رہا ہو اور دانت پیس کر بولا، "نیچے اُتر بھین.........."

ریاض پیٹ پر کھسک کر چٹان کے زینے پر آ رہا۔ نیچے سے دو فائر آئے۔ مشین گنوں کی بوچھاڑ پھر شروع ہو گئی۔ اُن کی آہنی، تھکی ہوئی مسلسل آواز، ٹھکاٹھک ٹھکاٹھک چاروں طرف سے گونج رہی تھی۔ بیچ بیچ میں نیچے سے پرانی طرز کی ایک ایک گولی والی رائفل کی تیز پٹاخے دار آواز آتی۔ ریاض سُرعت کے ساتھ اپنی گن میں نئی گولیاں ڈال کر پھر اُوپر جا لیٹا تھا۔ اُس وقت اسد جیسے ایک سکتے کی حالت سے جاگ اُٹھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ریاض کی پُشت پر اُس کا کُرتہ نوچ کر اُسے نیچے کھینچنے لگا۔ ریاض کا جسم گوہ کی مانند پتھر سے چپٹا ہوا تھا۔ دفعتہً اسد کو محسوس ہوا کہ ریاض کی طرف سے مدافعت ختم ہو گئی ہے۔ وہ اُس کے ہاتھوں میں کھسکتا آ رہا تھا، اور اسد اُسے کھینچنے کی بجائے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ریاض اُسی پتھر کے ساتھ بیٹھا تھا جس کے ساتھ وہ ٹیک لگائے رات بھر اونگھتا رہا تھا۔ وہ اسی طرح ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا ہوا تھا اور اُس کی آنکھیں بے نور تھیں۔ اسد اُس کے سامنے کھڑا بے یقینی سے اُسے دیکھ رہا تھا، جیسے ریاض جھوٹ موٹ وہاں بیٹھا اُس سے مذاق کر رہا ہو۔ اُس کی سوچ بند ہو چکی تھی۔ اُس کا دل بار بار ایک ہی بات دُہرائے جا رہا تھا: یہ کیا ہوا؟ گولی کان میں داخل ہو کر سر کے پچھلے حصّے کو پاش پاش کرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ مگر اُس کے چہرے کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا۔ اُس کے نقش اُسی طرح صاف سُتھرے، اکھڑے اکھڑے اور جاندار تھے۔ اسد نے ہاتھ بڑھا کر پیار سے اُس کے چہرے کو چھُوا۔ اس کی جلد ابھی گرم اور ملائم تھی۔ وہ پہلی بار ریاض کے چہرے کو چھُو رہا تھا، اور اُس لمس نے ایک لمحے میں اسد کو اُس مُردہ جسم کی حقیقت سے آشنا کر دیا۔ دفعتہً اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

آزمودہ پوزیشن والے آدمی کی مشین گن نے دائیں طرف کے پتھر کی آڑ لینے والے آدمی کو خاموش کر دیا تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد ٹرک کے پتھر والے آدمی نے اپنی رائفل اُچھال کر دُور پھینک دی۔ اب وہ ہاتھ سر سے اُوپر کیے لنگڑاتا ہوا باہر چلا آ رہا تھا۔ جس وقت اسد ریاض کی سٹین گن اُٹھائے اُچک کر اُوپر چڑھا، وہ فوجی ہاتھ اوپر اٹھائے پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر رُک گیا تھا اور ایک ٹانگ ٹیڑھی کیے، مُنہ اُوپر اُٹھائے دیکھ رہا تھا۔ اب ہر

طرف سے فائر بند ہو چکا تھا۔ چند لمحوں تک وہ شخص اسی طرح کھڑا پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھتا رہا، پھر آہستہ آہستہ سر کو نفی کے انداز میں ہلانے لگا۔ کئی سیکنڈ تک وہ منہ سے کچھ بولے بغیر سر کو آہستہ آہستہ ہلاتا رہا، جیسے کسی بات سے منع کر رہا ہو، پھر روتی ہوئی آواز میں چلّا اٹھا: "نہ مارو۔ پرماتما کے لیے مجھے نہ مارو، میری ٹانگ"، وہ بلکنے لگا، "ٹوٹ گئی ہے۔ مجھے جان سے نہ مارو۔"

ایک لمحے کے لیے اسد نے صبح کی روشنی میں اس کا سانولے رنگ کا ڈھلکی ہوئی مونچھوں والا دہقان چہرہ صاف طور پر دیکھا، اور گن کندھے پر رکھ کر پورے زور سے لبلبی دبا دی۔ اسی لمحے دوسری طرف سے ایک اور مشین گن کی، ذرا بھاری آواز والی، دو مختصر سی باڑھیں آئیں۔ وہ آدمی اسی طرح ہاتھ اٹھائے، حیرانی سے آسمان کو دیکھتا ہوا پلٹ کر گرا اور آہستہ آہستہ لوٹنے لگا۔ اسد نے اس وقت تک لبلبی دبائے رکھی جب تک کہ اس کی گولیاں ختم نہ ہو گئیں۔

پھر عقب سے کسی نے اس کے سر پر کسی آہنی شے سے زوردار ضرب لگائی۔ اس کی آنکھوں کے اندر روشنی کا ایک پٹاخا چھوٹا اور وہ پلٹ کر گر پڑا۔

وہ چت لیٹا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو آسمان نظر آیا۔ آسمان پر دھوپ تھی۔ وہ بے حرکت لیٹا آسمان کو دیکھتا رہا۔ اسے کچھ یاد نہ تھا۔ پھر دور سے سائیں سائیں کرتی ہوئی اس کی یادداشت لوٹنے لگی۔ اس کے کانوں میں گھوں گھوں کرتی ہوئی انجن کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر دو آدمیوں کی خوفزدہ، اونچی آوازیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ پتھر کی دیوار کے نیچے پڑا تھا۔ اس کے سر میں درد کی ٹیس اٹھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ سر کا پچھلا حصہ چھوٹے سے گیند کی شکل میں ابھر آیا تھا اور کچھ مقدار میں خون رس کر بالوں میں جمتا جا رہا تھا۔ نیچے سے گیئر لگنے کی آواز آئی اور گاڑی پیچھے کی طرف چلی، گیئر بدلا اور گاڑی آگے آئی، پھر پیچھے، پھر آگے۔ یہ ایک سویلین ٹرک تھا، اسد نے آواز سے پہچانا۔ ٹرک گھوم کر جدھر سے آیا تھا ادھر واپس چلا گیا۔ اب اس کے چاروں طرف سناٹا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ نہ وہ لوگ، نہ ریاض کا جسم، نہ کسی شے کا نام و نشان، جیسے کچھ دیر پہلے کے واقعات ایک خواب تھے۔ اس کے چاروں طرف اب پتھر کی بے جنبش چٹانیں گڑی تھیں، جیسے آج تک کسی نے یہاں قدم نہ

دھرا ہو۔ اسے ابکائیاں آنے لگیں۔ اس نے پاؤں کے بل بیٹھ کر قے کی۔ کچھ دیر تک وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے وہاں بیٹھا رہا۔ اس کے کانوں میں دوبارہ دور سے گاڑیوں کے انجنوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ پہاڑ سے اترنے لگا۔

(۱۱)

"آج کچھ لے کر آئی ہوں، کچھ کل لے آؤں گی۔" جنت نے کہا۔

"بہت ہے۔" اسد نے گٹھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا، "اور نہیں چاہیے۔"

"سوکھ کر تھوڑی رہ جاتی ہے۔"

"میرے لیے بہت ہے۔ زیادہ کی کیا ضرورت ہے؟"

"تمہاری سانس اب اچھی ہے؟"

"ہاں۔" اسد نے کہا، "اب اچھی ہے۔"

اس کی سانس کا تواتر قائم تھا۔ دن بھر درختوں میں چھپے رہنے کے بعد وہ رات کو اِدھر آیا تھا۔ جنت نے اُسے تازہ روٹی پکا کر دی تھی۔ اب وہ بیٹھا ایک قسم کے ساگ کے سالن کے ساتھ روٹی کھا رہا تھا۔ بچہ ایک طرف زمین پر بچھی ہوئی گدڑی کے اوپر لیٹا ٹانگیں اٹھائے اپنے پیروں سے کھیل رہا تھا۔

"ریاض نہیں آیا۔" جنت نے ذکر کیا۔

"کام پر ہے۔" اسد نے کہا، "میں آج رات کو چلا جاؤں گا۔"

"کل چلے جانا۔" جنت بولی، "کہتے ہیں آج پلس پھر رہی ہے۔ آرپہ لنگری کے پار لڑائی ہوئی ہے۔ فوجی مارے گئے ہیں۔"

"تم نے پلس دیکھی ہے؟"

"نہیں۔ کہتے ہیں علاقے میں پھر رہی ہے۔ رات کو چلنا ٹھیک نہیں۔ کئی بے گناہ پکڑے جاتے ہیں۔"

"مجھے کام ہے۔" اسد نے کہا، "میں نکل جاؤں گا۔"

"تمہاری مرضی۔"

کھانے سے فارغ ہو کر جنت نے اس کے برتن دھوئے۔ "تمہارے پاس کپڑا نہیں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

جنت نے کھاٹ پر سے ایک گدڑی اور کھیس لا کر اسد کو دیے۔ "یہ لو۔ تھوڑی دیر آرام کر لو۔ پچھلے پہر نکل جانا۔"

اسد نے خاموشی سے گدڑی پکڑ کر ایک طرف زمین پر بچھائی اور کھیس اوڑھ کر لیٹ گیا۔ عورت کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کھٹ پٹ کرتی رہی۔ پھر اس نے لالٹین کی بتی نیچی کی، مگر پھونک مار کر بجھائی نہیں۔ کھاٹ سے اس نے ایک چوڑا سا لحاف اٹھایا اور آ کر بچے کے پاس لیٹ گئی۔ لحاف نے ان دونوں کو ڈھک لیا۔ لالٹین کی بتی بہت نیچی تھی۔ اسد نے لیٹے لیٹے کمرے میں نظر دوڑائی۔ اس نیم اندھیرے میں بھی کمرے کے اندر صفائی کا احساس ہوتا تھا۔ دو چار چیزیں تھیں مگر کم معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ ایسی ترتیب اس نے حکیم کے کمرے کے بعد اس کمرے میں دیکھی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے اس کی آنکھ لگ گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے کواڑ کھول کر آسمان پر نظر ڈالی۔ رات ابھی آدھی سے زیادہ نہیں گذری تھی۔ اس نے کواڑ بند کر دیا۔ اس نے ارادہ کیا کہ اب اسے چل دینا چاہیے۔ کیا پتا کب اس کا کھرا یہاں آ نکلے۔ گھر کے باہر وہ زیادہ محفوظ رہے گا۔ اس نے جا کر اپنی لاٹھی کی ہلکی سی گٹھڑی اٹھائی۔ اسے ہاتھ میں لٹکائے وہ کئی لمحوں تک کھڑا جنت کے سوئے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے وہ پاؤں کے بل اس کے پاس بیٹھ گیا۔ آہستہ سے اس نے لحاف کا ایک کونا اٹھایا۔ سفید کرتے کے اندر بے معلوم سانس سے جنت کا سینہ چل رہا تھا۔ اسد نے آہستگی سے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا، جیسے ہوا پر اپنا ہاتھ چلا رہا ہو۔ سر ہلائے بغیر عورت نے ہولے سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں نیند کے ٹوٹنے کا کوئی استعجاب نہ تھا۔ اس نے چھوٹی سی یکساں آواز میں اتنا کہا:

"علی۔"

اسد نے گٹھڑی زمین پر رکھی اور اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ لحاف کے اندر اس کے خراب آلود جسم سے ایک مانوس سی بُو آ رہی تھی، جیسے تازہ کھدی ہوئی زمین ہو۔

"میرا نام اسد ہے۔" اسد نے کہا۔

"اسد علی؟" وہ بولی۔

"ہاں۔" کچھ دیر بعد اسد نے کہا۔

رات کے پچھلے پہر وہ جانے کے لیے اٹھا تو جنت نے ڈرے ڈرے ہاتھ سے اس کے کندھے کو چھوا۔ "نکل چلے جانا۔" وہ بولی۔

اسد نے جھک کر اپنی گٹھڑی اٹھائی اور جنت پر ایک نظر ڈال کر باہر نکل آیا۔

"خیال سے جانا۔" دروازے پر اٹکی ہوئی جنت نے کہا۔

"اچھا۔" وہ بولا۔

گاؤں سے باہر نکل کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ اس نے پیچھے مڑ کر اس مکان پر ایک آخری نظر ڈالی تو اسے خوشی محمد کا خیال آیا۔ خوشی محمد اب کہاں ہوگا؟ خوشی محمد نے اپنی زندگی سے نکلنے کی خاطر یہاں آ کر ایک عورت کے لیے اپنے ہاتھوں سے یہ عبرت ناک مکان تعمیر کیا تھا، اسد نے سوچا۔ مگر زندگی کی زد سے بچ کر نکلنا کوئی آسان ہے۔

پھر وہ اندھیری رات میں چل پڑا۔

★ ★ ★ ★ ★

سب سے اوّل مسئلہ خوراک کا تھا۔ اس نے بے آباد علاقوں سے خوراک حاصل کر کے زندہ رہنے کی تربیت حاصل کی تھی۔ مگر اب مسئلہ محض خوراک حاصل کرنے کا نہ تھا، بلکہ گمنامی میں خوراک حاصل کرنے کا تھا۔ جب وہ ادھر آیا تھا تو اس کے آگے ٹھکانے تھے، اور اس کے پاس ایک نام تھا اور ایک کوڈ تھا جس سے اس کی شناخت ہوتی

تھی۔ اب نہ اس کے پاس نام تھا نہ آگے کوئی ٹھکانا تھا۔ اس پہلی رات کو کئی بار اس نے ارادہ کیا کہ ریاض کی ماں کے پاس جائے، اس سے اِدھر اُدھر کی کوئی بات کرے، اپنا ایک آدھ کپڑا وہاں سے اٹھائے، اور نکل جائے۔ مگر اِدھر اُدھر کی کیا بات کرے؟ اس کبڑے بدن اور قدیم چہرے والی بڑھیا کا، جس نے ماں کی طرح اتنی دیر تک اسے اپنے پاس رکھا تھا، سامنا کرنے کی اس کو ہمت نہ ہوئی۔ پھر اس نے خیال کیا کہ سلطان کے پاس چلا جائے۔ مگر سلطان کو خبر پہنچ چکی ہوگی۔ کاش ان لوگوں نے بہر صورت ٹھکانے لگا دی ہوگی اور اب سلطان اس کا انتظار کر رہا ہوگا جو بے اجازت ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ کمانڈو گروپ کو بھی اس کی اصلیت کا پتا چل چکا ہوگا، رات کی رات میں وہ لوگ دوسری طرف نکل جائیں گے۔ کل تک بات اوپر پہنچ جائے گی۔ اس نے احکام کی خلاف ورزی کی تھی۔ اسے ان کے طور طریقوں کا اچھی طرح سے علم تھا — وہ رات بھر اس علاقے کے اندر بے راہ روی سے چکر لگاتا رہا، آخر صبح ہوتے ہوتے باہر ہی باہر سے چل پڑا۔

چنانچہ اب وہ اس عجیب و غریب صورتِ حال سے دوچار تھا، جہاں پہلے اس کو شناخت کروانے کے لیے پیش قدمی کرنا پڑتی تھی، اب اسی شناخت کو صیغۂ راز میں رکھنے کا مسئلہ تھا۔ اس نیم واقف دنیا میں سفر کرنے کا جو ایک پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں تھا، چھن گیا تھا۔ اب وہ یہاں پہلے دن سے زیادہ اجنبی تھا۔ اس کا ذہن اس خطرناک صورت کو بھانپ کر جاگ اٹھا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اب اسے صرف اپنی عقل اور ہشیاری کے بل پر سفر کرنا ہے۔ اس کی منزل مقصود صرف ایک تھی۔ گنگشہ۔ وہاں تک اسے کسی نہ کسی صورت پہنچنا تھا۔

غصے میں بگڑ کر اس کا دماغ صاف ہو گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی سوچ میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی چاہیے، کوئی ادُھرا ادُھیرا سوال نہ جواب۔ اس کے دشمن محاذ اب ایک نہیں دو ہو گئے، ایک پہلے، ایک پرلے۔ اور اسے ان دونوں کے اندر سے نکل کر جانا تھا۔ وہ نہ ایک کے راستے کو کاٹ سکتا تھا نہ دوسرے کے راستے کو۔ اسے اپنا ایک راستہ نکالنا تھا، اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس میں اسے عقل اور حس دونوں سے کام لینا پڑے گا۔

خوش قسمتی سے ان حالات نے اس کی سانس پر کوئی بُرا اثر نہ ڈالا تھا۔ کافی عرصے سے اس کا سینہ متوازن چل رہا تھا، اور جوں جوں خطرہ بڑھتا جاتا تھا اس کا ذہن ابتر ہونے کی بجائے صاف اور تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے چوبیس گھنٹے سے سوائے جَو کی پرانی فصل کی چند گری پڑی بالیاں چبانے اور ایک چشمے سے منہ لگا کر پانی پینے کے اور کچھ کھایا نہ پیا تھا۔ اس کے پیٹ میں بھوک کے پیچ پڑ رہے تھے، مگر اس کی قوت برقرار تھی۔ دن بھر میں اس نے بہت کم سفر کیا تھا۔ بیشتر وقت اس نے حالات کو جانچنے اور فرار کی سکیم بنانے میں صرف کیا تھا۔ حالات بہت سے تھے اور صورتیں کم تھیں، اور انہیں آپس میں فٹ کرنے کا سوال تھا۔ وہ دن بھر ایک چھوٹے سے جنگل

میں چھپا رہا۔ اس نے اپنے چاقو سے، جو اس کا واحد ہتھیار تھا، ایک مضبوط سی شاخ کاٹی اور اسے چھیل چھیل کر ہموار کرتا رہا، حتیٰ کہ وہ ایک لاٹھی کی شکل میں تیار ہو گئی۔ اخروٹ کی ٹھوس لکڑی کو کاٹتے کاٹتے اس کے چاقو کا پھل اپنی دھار گنوا بیٹھا، مگر اس مضبوط لاٹھی کو تیار کر کے اسد کو عجیب سی خوشی اور کفالت کا احساس ہوا۔ چاقو میں وہ چیز نہیں تھی جو اس لاٹھی میں تھی۔ اس لمبی اور گول لکڑی کے ٹکڑے کا اپنا ایک تازہ تازہ وجود تھا، جیسے ایک ساتھی ہو۔ لاٹھی تیار کر کے اس نے چاقو کو پتھر پر رگڑ کر تیز کیا۔ جیسے جیسے اس چوڑے اور نوکدار پھل کی چمک اور کاٹ واپس آتی گئی، اسد کے لہو میں سرخوشی کی لہر اٹھتی گئی۔ آخر اس نے چاقو کے دستے کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیا اور ایک بھرپور وار کے ساتھ اس کے پھل کو ایک پیڑ کے تنے میں گھونپ دیا۔ پیڑ کی نرم لکڑی کی کئی تہوں کو چیر کر چاقو کا پھل دو اپنچ تک اس کے اندر اتر گیا۔ اسد نے دستہ ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ چاقو تنے میں تیر کی طرح گھبا رہا۔ اس کے دستے میں بے معلوم سا ارتعاش تھا، جیسے زمین کانپ رہی ہو۔ جب اسد نے اسے نکالنے کی کوشش کی تو اسے معلوم ہوا کہ چاقو جس آسانی سے تنے کے اندر اترا تھا اتنی آسانی سے باہر نہیں نکلے گا۔ ایسے لگتا تھا کہ لکڑی نے اسے اپنے جبڑوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے، اور اگر اس نے الٹا سیدھا زور لگایا تو پھل ٹوٹ جائے گا۔ آخر کافی دیر کی تگ و دو کے بعد وہ مہارت سے چاقو کو تنے سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس تنے کی نرم ہموار جلد پر کچھ لکھے، کوئی شکل بنائے، کوئی نشان چھوڑے۔ مگر اس درخت نے اسے ایک سبق سکھایا تھا، کہ اگر وہ اپنی چند چیزوں کو اور ان کی متاع کو بے دھیانی سے صرف کرے گا تو اس زمین کے چنگل سے نکلنا اس کے لیے محال ہو جائے گا۔ اس نے احتیاط سے چاقو کا پھل سمیٹ کر کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔

راستہ طے کرنے کی ایک بڑی مشکل تھی۔ کون سا راستہ اختیار کیا جائے؟ دو راستے اس کے علم میں تھے۔ ایک راستہ سڑکوں اور دوسرے رستوں کا تھا جو عام استعمال میں آتا تھا۔ دوسرا راستہ ان سے ہٹ کے پیدل آدمیوں کا تھا جو سرحد کے قریب قریب کاروباری سرنگوں کے باعث بدلتا رہتا تھا، مگر آگے نکل کر سڑکوں کے آس پاس چلتا تھا۔ یہ دونوں رستے اس پہ بند تھے۔ تیسرا راستہ اس کے علم میں نہیں تھا۔ اور یہی نامعلوم راستہ اسے اختیار کرنا تھا۔ وہ راستہ کون سا تھا؟ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ جہاں تک وہ ان دونوں راستوں سے دور دور رہ کر چلتا جائے گا، وہی تیسرا راستہ ہوگا۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ پہاڑی علاقوں میں میدانی سفر کا حساب نہیں چلتا۔ میدانوں میں اگر آپ کسی ایک راستے سے احتراز کرتے ہوئے چلنا چاہیں تو دو چار میل کا چکر کاٹ کر نکل سکتے ہیں۔ میدان کسی کا رستہ نہیں روکتے۔ پہاڑوں کی بات دوسری ہے۔ پہاڑوں کے رستے محدود ہوتے ہیں، اور ان سے اگر آپ ہٹ کر چلنا چاہیں تو سفر کی سمت غائب ہو جاتی ہے، جس کا مطلب ہے کہ سڑک سے اگر دو دن میں اور خفیہ راستے سے چار دن میں سفر کٹتا ہے،

تو نامعلوم رستے سے ہو سکتا ہے چھ دن میں کٹے، ہو سکتا ہے چھ ہفتے میں۔ اس پہلے روز جنگل میں چھپ کر بیٹھے بیٹھے اسد نے ان چیزوں کا حساب لگانا چاہا تو ممکنات کے اس بے انت سلسلے کو پہنچا۔ ہار کر وہ دوسری باتوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

نام کون سا اختیار کرے؟ دونوں پہلے راستوں کی مانند، اس کے دونوں ناموں میں خطرہ پوشیدہ تھا۔ ایک تیسرا نام چاہیے تھا۔ سب سے پہلا نام جو اس کے ذہن میں آیا امیر تھا۔ امیر اچھا نام ہے، اس نے سوچا، آسان ہے اور اس علاقے کا عام نام ہے۔ اس نام سے وہ بے خطر سفر کر سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی طے کیا کہ بیشتر سفر رات کے وقت کرنا بہتر رہے گا۔ گو ایک آدھ رات اندھیری آئے گی مگر خطرہ کم ہو جائے گا۔ اس کی آنکھیں اندھیرے میں سفر کرنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ تین راتوں کے بعد، اس نے حساب لگایا، چاند کی روشنی اتنی نکل آئے گی کہ آدمی چل سکے۔ اب سب سے اول مسئلہ خوراک کا رہ گیا تھا۔ کئی طریقے اس کے ذہن میں آئے، مگر آخر کار سب کو اس نے وقت کے اوپر چھوڑ دیا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو وقت سے پہلے طے کیا جا سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ راستے کا تعین ہو یا خوراک کا حصول، صرف موقع محل ہی اس کی راہ نکالے گا۔ اس کا کام اتنا تھا کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور چوک سے بچا رہے۔ پہلے روز جب وہ چلا تو رات کے تیسرے پہر تک تھک کر رک گیا۔ ایک مختصر سے گاؤں کے باہر ایک مہیب درخت کے تنے سے لگ کر اونگھتے ہوئے اس نے باقی رات گزاری۔ اس سے اسے دو باتوں کا سبق ملا۔ ایک یہ کہ پہاڑوں کو کاٹتے ہوئے چلنا، جب کہ پیٹ بھی خالی ہو، نہایت تھکا دینے والا سفر ہے۔ دوسرے یہ کہ رات کے ساتھ ہی سفر شروع کر دینے کا مطلب ہے پچھلے پہر کو کہیں بیٹھ کر ٹھٹھرتے رہو۔ کوئی بھاری کپڑا ساتھ نہیں، چنانچہ ہر رات کو سفر کی ابتدا میں جتنی تاخیر ہو سکے بہتر ہے۔ اس پہلے گاؤں میں وہ سردی کا مارا ہوا ایک کسان کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اندر سے ایک عورت متوجہ ہوئی تو وہ بولا کہ مسافر ہوں، کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ عورت نے مڑ کر مرد سے بات کی۔ مرد دروازے پر آ کر مشکوک نظروں سے اسے گھورنے لگا۔

"سویرے سویرے آرام کرنا چاہتے ہو؟"

"رات کو سفر کرتا ہوں۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"چار کوس سے۔"

عورت کے کان کھڑے ہوئے۔ "تم ننگے شاہ کے فقیر تو نہیں؟" وہ بولی۔

"میری کیا مجال" اسد نے کہا "کہ شاہ کا فقیر ہوں۔ اللہ کا بندہ ہوں۔"

اس پر عورت کو یقین ہو گیا کہ وہ ناگے شاہ کا فقیر ہے۔ اُس نے مرد کو بتایا کہ فقیروں کو رات کے وقت سفر کرنے کا حکم ہوتا ہے اور اُس کو مزید سوال جواب کرنے سے منع کر کے اسد کو اندر مدعو کیا۔ بے کواڑ کے دروازے میں قدم رکھ کر وہ ایک چھوٹی سی چار دیواری میں داخل ہوا جو مکان کا احاطہ تھا۔ احاطے میں ایک طرف ایک گائے اور ایک بکری بندھی تھی۔ وہ دُوسری طرف جا کر دیوار کے ساتھ دھوپ میں بیٹھ گیا۔ عورت اُس سے پُوچھے بغیر تھوڑی دیر میں تازہ روٹی پکا کر لے آئی۔ اسد نے ایک مدت کے بعد انڈے کی شکل دیکھی تھی۔ "میں دربار پہ حاضری دینے جاتی رہتی ہوں۔" عورت بکری کی طرف دیکھ کر بولی "یہ جانور میں نے رکھا ہوا ہے۔ میری مشکل حل ہو تو اسے میں سرکار میں جا کر چھوڑ آؤں۔ آپ بزرگ میرے لیے دُعا کریں۔ آپ کی دُعا قبول ہو گی۔"

"اللہ مدد کرے گا۔" اسد نے کہا۔ عورت نے ایک گدڑی لا کر زمین پر بچھا دی تھی۔ دن بھر وہ اُس گدڑی پہ دھوپ میں سویا رہا۔ کئی روز کے بعد اُسے اتنی زور کی نیند آئی تھی۔ شام کے وقت دوبارہ اُس نے گرم گرم کھانا کھایا۔ گو ہر قسم کی پوچھ گچھ بند ہو چکی تھی، مگر کسان، جو شام کے وقت گھر لَوٹا تھا، بار بار اسد کو شکی نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے اُس کا یقین اُٹھتا جا رہا ہو۔ کھانے سے فارغ ہو کر اسد نے گدڑی زمین سے اُٹھائی اور اسے اوڑھ کر وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بات چیت سے بچنے کے لیے اُس نے آنکھیں میچ لیں اور آہستہ آہستہ ہلنے لگا، جیسے مراقبے میں جا رہا ہو۔ یہ سارے اطوار اُس پہ خود بخود وارد ہوتے جا رہے تھے۔ نہ دروازے پہ جا کر مانگنے میں نہ فقیر کا رُوپ دھارنے میں اُسے کوئی اچنبھا محسوس ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ کنبہ سونے کی تیاری کرنے لگا تو عورت نے اُسے رات بسر کرنے کے لیے اندر مدعو کیا۔ اسد نے نہ آنکھیں کھولیں نہ کوئی جواب دیا۔ اُسے کچھ کھسر پھسر کی آواز آئی۔ عورت اپنے مرد سے کہہ رہی تھی کہ فقیر کو چھیڑنا ٹھیک نہیں۔ جہاں بیٹھا ہے وہیں بیٹھا رہنے دو، قسمت اچھی ہوئی تو یہیں ڈیرا لگا لے گا۔ اسد نے دل میں شکر ادا کیا کہ قدرت اُس کی مدد کر رہی ہے، اُس نے ایسا انداز اختیار کیا تھا کہ اُس کے سفر کے بارے میں کوئی مزید بات چیت نہ ہوئی تھی۔ کسان اور اُس کی بیوی واپس چلے گئے۔ اسد نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ گائے، اُس کے بچھڑے اور بکری کو چھپر کے نیچے لے جا کر باندھ دیا گیا تھا۔ گھر غالباً دو کمروں پر مشتمل تھا۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا تھا، مگر ایک درز میں سے بتی کی روشنی آ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد روشنی ختم ہو گئی۔ رات پڑ گئی تھی۔ آدھی رات کے قریب اسد اُٹھا۔ اُس نے گدڑی اٹھا کر اپنے بدن پر لپیٹا، بُڑی کی گٹھڑی کو لاٹھی کے سرے پر باندھا اور وہاں سے چل پڑا۔ وہ صحن پار کر رہا تھا کہ بکری ایک بار منمنائی۔

اسد اس آواز پر بھاگ اُٹھا۔ اُس نے ایک چھلانگ سے دروازہ عبور کیا اور تیز تیز قدموں سے گاؤں سے نکل گیا۔

اب ایک گدڑی کم از کم اُس کے پاس تھی۔ اُسے پہلی دفعہ اِس بات کا تجربہ ہوا کہ بے سروسامانی کی حالت میں ایک گدڑی کا ہونا کس قدر گہرے اطمینان کا باعث ہو سکتا ہے۔ چادر یا کھیس میں وہ بات نہیں تھی، شاید اس لیے کہ پتلے کپڑے اوڑھے لپیٹے جانے سے بدن کا لباس بن جاتے تھے و کونوں کناروں سے لپٹ کر بدن کی شکل اختیار کر لیتے اور جسم اُسی طرح ننگا اور غیر محفوظ رہ جاتا تھا۔ گدڑی کی عجیب بات تھی۔ اِس کو شکن نہیں آتی تھی اور اوڑھی جائے تو لپیٹے کی بجائے جسم کے گرد ایک کھڑا کھڑا احصار بنا دیتی تھی جس کے اندر بدن آزاد بھی رہتا تھا اور پناہ گزین بھی، اور جسم کی گرمی محفوظ رہتی تھی۔ اِس وقت گو وہ سفر کاٹتا چلا جا رہا تھا مگر اُس کے دل میں اب پچھلی رات والا ڈر جاگزیں نہیں تھا۔ اب وہ گویا شوق سے اُس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب وہ تھک کر، رات کو یا دن چڑھے، کسی درخت کے ساتھ یا دیوار سے ٹیک لگا کر، آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے گا یا سکڑ کر لیٹ جائے گا اور اپنے آپ کو گدڑی میں محفوظ کر لے گا، جیسے ایک گھروندے میں پڑا ہو۔ لاٹھی بنانے کے بعد اُس کو سب سے بڑی تسلی گدڑی حاصل کر کے ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اُسے ایک کار آمد گُر بھی ہاتھ آ گیا تھا جس کو اُس نے اگلے دو روز تک کامیابی سے استعمال کیا۔ وہ بے خوفی سے کسی کھاتے پیتے کسان کے گھر پہ جا پہنچتا اور اپنے آپ کو کسی مزار کا فقیر ظاہر کر کے کھاتا اور جائے آرام طلب کرتا۔ پیٹ بھر کھانا کھا کر وہ اپنی گدڑی میں لپٹ کر سو جاتا۔ جب اُٹھتا تو آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا، اور سوائے بیچ بیچ میں اللہ کا نام پکارنے کے کسی بات کا جواب نہ دیتا۔ بدقسمتی سے یہ گُر زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ اِس کی دو وجہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اب تیزی سے ناگے شاہ کے علاقۂ اثر سے نکلتا جا رہا تھا، اور نئے علاقے میں اثر رکھنے والے مزاروں سے اُس کی واقفیت نہ تھی۔ گرچہ یہ گُر کتنا ہی سکہ بند کیوں نہ ہو، اُسے کامیابی سے استعمال میں لانے کے لیے چند شرطیں لازم تھیں، مثلاً پہلے چند الفاظ میں، ہشیاری سے، اپنے حلقۂ ارادت کا نام لینا اشد ضروری تھا، ورنہ دہقانوں کی سخت شکی طبیعت آسانی سے پھسلائی نہیں جاتی ‌‌‌ اس بات کا اُسے علم ہوا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مختلف آبادیوں کی پیر پرستی کی کیفیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ تیسرے روز وہ ایک ایسے گاؤں میں پہنچا جو شدید قسم کا پیر پرست گاؤں تھا۔ چنانچہ تیسرے پہر جب وہ نیند پوری کرنے کے بعد جاگا تو اُس نے دیکھا کہ آدھا گاؤں اُس کے گرد بیٹھا ہے۔ یہاں سے وہ بدک گیا۔ آنکھیں بند کیے بیٹھے بیٹھے اُس نے سوچا کہ یہ تو اُلٹا اپنے اُوپر توجہ مرکوز کرنے کا ایک آسان طریقہ ہے۔ اگر وہ اسی پہ کاربند رہا تو شناخت رازمیں رہنے کی بجائے کہیں نہ کہیں مشکل آئے گی۔ چنانچہ وہ جگہ چھوڑنے سے پیشتر ہی اسد

نے اِس طریقۂ کار کو ترک کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ اب وہ کیا کرے ؟

پھر اُوپر سے راستہ اُس کو چکر دے رہا تھا۔ پہلے دو دن راستوں سے مُتوازی دُور رہنے کی کوشش میں وہ کہیں کا کہیں نکل گیا تھا۔ اپنی تربیت کے دوران اُس نے پہاڑوں میں اکیلے سفر کرنے کے چند اصول سیکھے تھے، جن کو وہ ممکن حد تک استعمال کر رہا تھا۔ مگر یہ اُصول بھی چند باتوں سے مشروط تھے۔ مثلاً یہ کہ جس علاقے میں وہ جا نکلے کسی نہ کسی طریقے سے اپنے آدمیوں کا پتا لگانے کی کوشش کرے۔ اس کی بھی چند شناختیں تھیں۔ وہاں سے پھر وہ مزید اطلاعات حاصل کرے اور ضرورت ہو تو اپنی سمت سیدھی کر لے۔ مگر اب وہ اِن اصولوں کی بنیادی شرائط پوری کرنے سے قاصر تھا۔ جس مکمل بے سر و سامانی کی مسافری سے وہ دوچار تھا اُس کے لیے کوئی اُصول وضع نہ کیے گئے تھے۔ اس کے لیے گُر اُسے اپنے پاس سے ایجاد کرنا پڑ رہے تھے۔ رات کے وقت آسمان پہ نظر ڈال کر اُسے صرف اِتنا پتا چل جاتا تھا کہ وہ بالکل اُلٹی سمت میں نہیں چلا جا رہا۔ مگر یہ کہ وہ سرحد کی جانب بڑھ رہا ہے یا اُس کے متوازی چلا جا رہا ہے، اِس بات کا پتا چلانا دُشوار ہوتا جا رہا تھا۔ چوتھے روز پہلی بار ایک پہاڑ کی چوٹی سے اُسے دو ایک گاڑی کی بتیاں حرکت کرتی ہوئی نظر آئیں، مگر ہزار کوشش کے باوجود وہ رات کے اندھیرے میں یہ نہ جان سکا کہ سڑک کا یہ کون سا مقام تھا۔ اُس نے سوچا کہ چار راتیں ہو گئی ہیں، کم از کم یہ تو پتا چلنا چاہیے کہ میں نے کتنا فاصلہ طے کیا ہے۔ سفر کاٹنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ اُس نے باقی رات وہیں پہ بسر کرنے کا ارادہ کر لیا، تاکہ دن چڑھے دیکھ کر معلوم کر سکے۔ اِس چوٹی پہ درخت نہ تھے، چٹانیں تھیں۔ اسد نے لاٹھی راتوں میں بنائی گٹھڑی پاس رکھی اور گردن کا گھروندا سا بنا کر ایک چٹان کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے سوچا، یہ راستہ بھی کیسا عجیب ہے۔ جب تک چلتے جاؤ راستہ ہے، جب بیٹھ جاؤ تو راستہ ختم۔ ایک ایک قدم سے رستہ بنتا ہے اور اُسی کے ساتھ ختم بھی ہو جاتا ہے۔ اِس قطعی غیر یقینی صورتِ حال سے، جو ساتھ ہی ساتھ ظلم قدرتی بھی معلوم ہونے لگی تھی، اُس کا واسطہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ اُس نے سوچنے کی کوشش کی۔ اُسے اپنی گزشتہ زندگی میں کوئی ایسا موقع یاد نہ آیا جس کا سامنا کرنے کی کوئی نہ کوئی تدبیر، اُس کے اپنے عناصر کے اندر یا باہر پہلے سے موجود نہ رہی ہو۔ یہاں تک کہ جب وہ جیل میں تھا تو اُس وقت کے تاریک ترین دنوں میں بھی آگے کی ایک نہ ایک راہ، ایک نہ ایک تدبیر ہمیشہ اُس کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اب یہ ایک ایسا موقع آیا تھا جو بے تدبیر تھا۔ وہاں لیٹے لیٹے اُس نے سوچنے کی کوشش میں خیال کیا کہ قدرت کی چیزیں بھی اسی نوعیت کی ہوتی ہیں، جیسے پہاڑ کا موڑ مُڑو تو سامنے ایک چیل دار پیڑ ہو یا ایک مہیب چٹان ایک ذرا سے لنگرے پہ کھڑی ہو۔ اِس بات سے قطعی بے نیاز کہ کوئی اُنہیں دیکھے اور حیرت زدہ ہو یا کہ ہمیشہ کے لیے ہر آنکھ اُن سے اوجھل رہے، اگرچہ سیکڑوں برس وہ وہاں پہ موجود رہیں۔

اسد کا ذہن بھٹکنے لگا تھا۔ اُلٹی سیدھی باتوں سے گھبرا کر آخر اس کا خیال ایک صاف سُتھری سمت کی تلاش میں نکل پڑا۔ اُس جگہ پہ ڈھلی ہوئی دھوپ کی فضا میں ہر چیز شیشے کی سی شفاف اور ٹھوس اپنی جگہ پر موجود تھی اور اُس میں طویل چوکڑیاں بھرتے ہوئے ایک دھاری دار جانور کی شبیہ تیزی سے حرکت کرتی تھی۔ پہلی بار شیر اُس کو ایک جانور کے روپ میں نظر آیا۔ وہ اونگھ گیا۔

صبح کے وقت اُسے دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ جس مقام پہ وہ کھڑا تھا، سڑک کے راستے وہ جگہ چار کوس سے صرف چھ گھنٹے کے سفر پہ تھی۔ یعنی چھ گھنٹے کا سفر اُس نے چار دن میں ختم کیا تھا۔ اُس نے دوپہر تک سفر جاری رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ چلتا چلتا سڑک کے قریب آ نکلا تھا۔ اب اُسے پھر سڑک سے دُور جانا تھا۔ مگر اس کا ایک فائدہ ہوا تھا کہ سڑک کو دیکھ کر اُسے اندازہ ہو گیا تھا وہ کہاں پر ہے۔ نیز یہ کہ اب اُسے کن کن جگہوں سے بچ کر نکلنا ہے۔ اُس کے دل سے سفر کا خوف بھی کچھ کچھ اُترتا جا رہا تھا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ صرف رات کو ہی چلنے کی مصلحت غیر ضروری ہے۔ موقع دیکھ کر دن کو بھی سفر کیا جا سکتا ہے۔ دُوسری طرف سے قدرت اُس کی مدد کر رہی تھی۔ چلتے چلتے دُور سے اُسے ایک پہاڑی کے دامن میں چند جھونپڑیاں نظر آئیں۔ وہ راستہ بدل کر اُن کے قریب سے گزرا تو اُس نے دیکھا کہ وہ بے دخلوں کے گھر تھے۔

بے دخل! اسد کے ہاتھ گویا ایک خزانہ آ گیا۔ اُس نے خوشی سے اپنے دل میں اِس لفظ کو دہرایا۔ یہ ایک ایسا لفظ تھا جو سو ڈیڑھ سو سال پہلے وجود میں آیا تھا۔ یہ ایسے لوگ تھے جو پہلی جنگ کے موقعے پہ اپنے گھروں سے اُکھڑ گئے تھے۔ اس نتیجے میں کچھ اِدھر سے اُدھر چلے گئے، کچھ اُدھر سے اِدھر آ گئے۔ کئی سال تک کسی طرف کی حکومت نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ ہر نئی انتظامیہ نے اِس مسئلے کو حل کرنے کی اپنی سی کوشش کی، مگر بات تھوڑی بہت کاغذی کارروائی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ہوتے ہوتے "گھر" واپس جانے کے خواب اُن لوگوں کے دلوں سے اُتر گئے اور وہ ایک مُستقل خانہ بدوش قبیلے کی صورت اور حیثیت اختیار کر گئے۔ "گھر" ایک خیالی جگہ کا نام بن گیا جس کی باتیں یہ لوگ اب بھی کیا کرتے تھے، مگر محض وقت کٹی کی خاطر۔ اب یہ لوگ اُسی طرح جیسے ہمیشہ سے کرتے آئے تھے، مزدوری یا جنگلات کی نوکریاں کرنے لگے تھے، مگر رہتے عارضی جھونپڑیوں میں تھے اور کہیں ٹکتے نہ تھے، چند بھیڑیں اور بکریاں پال لیتے تھے اور کنبوں کی شکل میں، یا اکیلے دُکیلے، ایک جگہ سے دوسری جگہ کو سفر کرتے رہتے تھے۔ مگر بات قدرتی طور پہ یہ لوگ آہستہ آہستہ خانہ بدوشوں کی طبیعتیں اختیار کرتے جا رہے تھے، ایسی طبیعتیں جن کی اپنی اندرونی زندگی اور اس کی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اسد کو علم تھا کہ اِس علاقے میں ایک آدھ جگہ پہ حکومت نے کچھ کارروائی کرنے کی خاطر اِن لوگوں کے لیے کیمپ بھی لگا رکھے تھے، جہاں لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ اِن کیمپوں میں کھانا

مل جایا کرتا تھا، اور چند شرائط پوری کرنے پر کبھی کبھار حکومت کی طرف سے پیسے وغیرہ ملنے کی صورت بھی نکل آتی تھی۔ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان میں انہیں ڈی۔ پی یعنی "ڈسپلیسڈ پرسن" کہا جاتا تھا، عام لوگ ان کو محض "بے دخل" کے نام سے پکارتے تھے۔ اسد کو حیرت ہوئی کہ پہلے اُسے اس کا خیال کیوں نہیں آیا، حالانکہ ان لوگوں کی حالت اُس کی اپنی صورت حال سے قریب ترین تھی۔ ان کی وفاداری کسی ایک طرف سے نہیں تھی، صرف اپنے ساتھ تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کے اُوپر واضح ہو چکا تھا کہ وہ دونوں طرف سے نکالے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایجنٹ، ڈبل ایجنٹ، سمگلر وغیرہ اس قبیلے میں کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ وہ ان کے کیمپ کے نزدیک نہیں جا پاتا تھا، کیمپ اپنے آدمیوں سے بھرا ہوگا، اور یقیناً کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اُس کی شناخت کر لیں گے۔ مگر اُس کے لیے "بے دخل" بن جانا ایک عین قدرتی بات تھی۔ چنانچہ فقیر کا روپ اُتار کر وہ بے دخل بن گیا۔

لوکل کشمیری لوگ اُنہیں کام چوری کا طعنہ دیتے تھے، اور عام رائے تھی کہ یہ لوگ اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اُن کی مفلوک الحالی کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اسد نے دیکھا کہ بے دخل کہہ کر اپنے آپ کو متعارف کرانے سے لوگ، بے دلی سے سہی، مگر کھانا دینے سے انکار نہیں کرتے تھے۔ زیادہ سوال جواب نہیں کیے جاتے تھے، اور دن کے وقت دھوپ میں یا شام کو کھلے آسمان کے نیچے لوگ اپنے صحنوں یا احاطوں میں اُسے پڑا رہنے دیتے تھے، مگر اُس پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ یہ واضح کر دیا جاتا تھا کہ ایک وقت سے زیادہ کا کھانا اُسے نہیں ملے گا، اور عموماً گھر باہر کے کام کاج پر اُسے لگا لیا جاتا تھا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ وہ ایک عام سوال "کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟" کا جواب گھڑنے سے بچ گیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" عموماً کسان اُس سے یوں گویا ہوتا۔

"کیمپ کو۔" وہ کہتا۔

"مفت خوری کی زندگی اچھی نہیں ہوتی۔ محنت کر کے روٹی کمانا ہر آدمی کا فرض ہے۔ ادھر رہ جاؤ، کھیتوں پہ کام کرو، دو وقت کی روٹی مل جائے گی، کپڑا لتّا سب کچھ ملے گا ...."

"کیمپ میں اپنے رشتہ دار ہیں۔ اُن کی خبر ملی ہے۔" اسد جواب دیتا۔ "اُن سے مل کر آ جاؤں گا۔"

سوال کرنے والے کو یقین ہو جاتا کہ بھٹرو، کام چور ہے۔ کیمپ میں جا کر بیٹھا رہے گا یا اسی طرح مانگ تانگ کر گزارا کرتا رہے گا۔ وہ روٹی تو دے دیتا مگر اُس کا مزاج سخت ہو جاتا، جس وجہ سے اسد کے لیے وہاں دن بھر کا وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا۔ چنانچہ دو تین روز کے بعد اُسے اپنی سکیم میں تبدیلی کرنا پڑی۔ کھاتے پیتے کسانوں اور دکانداروں کے گھروں کی بجائے اُس نے اب غریب غربا کے گھروں میں جانا شروع کر دیا، وہ لوگ جو عموماً جنگلوں کی لکڑیاں یا کھیت

مزدوری کرتے تھے۔ روکھی سوکھی کھانے کو اُسے مل جاتی اور یہ لوگ اُسے دن بھر یا رات کا کچھ حصہ وہاں پڑا رہنے پر زیادہ ناک بھوں نہ چڑھاتے اور نہ زیادہ دِق کرتے۔ اسد نے ان لوگوں کو نسبتاً زیادہ خدا ترس بھی پایا۔ اُس نے دیکھا کہ یہ لوگ اُس کی مخصوص حیثیت کو زیادہ آسانی اور سادگی سے قبول کر لیتے تھے۔ اگر باتیں کرتے تو ہمدردی کی کرتے اور غریب لوگوں کے انداز میں اُسے تسلی بھی دیتے تھے۔ اُس کے سفر کا یہ آسان ترین دَور تھا۔ اُس نے تقریباً آدھا راستہ طے کر لیا تھا۔ اُس وقت اُس نے سوچا کہ اگر وہ کسی نہ کسی طریقے سے ہر دو تین روز کے بعد سڑک کا معائنہ کرتا رہے تو پانچ سات دن میں وہ سرحد پار کر لے گا۔

مگر اُس کی اُمید ایک بار پھر اپنی انتہا کو پہنچ کر ٹوٹ گئی۔ یہ واقعہ ایک روز ایک جنگل مزدور کے گھر غیر متوقع طور پر پیش آیا۔ وہ دوپہر کے وقت وہاں پہنچا تھا۔ ان غریب گھروں کے صحن یا احاطے نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ پیٹ بھرنے کے بعد دروازے کے ساتھ ہی جو اکثر گلی میں کھلتا تھا، بیٹھ رہتا تھا۔ اُس روز اسد نے روٹی مانگ کر کھائی اور نیند پوری کرنے کی غرض سے بیٹھا ہی تھا کہ گھر کا مالک پھرتا پھراتا آ نکلا اور کابلی سے دروازے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ اسد بے خیالی سے اُس کی باتوں کا جواب دیتے دیتے اونگھ گیا۔ اچانک کسی نے اُسے پکارا:

"اسد!"

"ہُوں؟" اُس نے آنکھیں کھول کر جواب دیا۔ جواب دیتے ہی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اسد اُس کو اپنا نام امیر بتا چکا تھا۔ ظاہراً اُس مزدور نے اپنے بچے کو آواز دی تھی۔ اسد بات ٹالنے کی خاطر جھک کر گھر کے اندر بچے کی طرف دیکھنے لگا۔ مگر اُس شخص کو شک پڑ چکا تھا۔

"تیرا نام اسد ہے؟" اُس نے شکی لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔" اسد نے جواب دیا۔ "غلطی لگی ہے۔"

"نام کی غلطی لگی ہے؟"

"اپنا بھائی یاد آ رہا تھا۔ اُس کا نام اسد ہے۔"

کشمیری عجیب نظروں سے اُسے گھورتا رہا۔ اسد کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ کشمیری کی بیوی اور بچے باہر نکل آئے تھے اور کھڑے تجسس سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" کشمیری گٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"دوائی بوٹی ہے۔ مجھے سانس کا مرض ہے۔"

"تیرے پاس کاغذ ہے؟"

"نہیں۔ کیمپ سے بنواؤں گا۔"

"کوئی پیسا ہے؟"

"نہیں۔"

کشمیری کا شک رفع ہونے کی بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔

"تُو ہے کون؟ ہنہہ؟ تیرا اصل نام کیا ہے؟"

اسد گھبرا گیا: "میں بے دخل ہوں۔" وہ بولا "نام سے کیا ہوتا ہے۔ میرا نام امیر ہے۔ میرے بھائی کا نام اسد ہے۔"

"بے دخلوں کے پاس شناختی کاغذ ہوتا ہے۔ تیرے پاس نہ کاغذ ہے، نہ پیسا ہے، نہ کوئی چیز ہے۔ تُو کیسا بے دخل ہے؟"

"میرے پاس کاغذ تھا۔ گم ہو گیا ہے۔ کیمپ سے نیا بنواؤں گا۔ اسی لیے جا رہا ہوں۔"

"تُو تو کہتا تھا رشتے داروں کو دیکھنے جا رہا ہے؟"

"وہ کام بھی ہے۔" اسد نے کہا۔

اس وقت تک کشمیری کے بیوی بچوں کے علاوہ دو چار اور اِدھر اُدھر کے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ سب وہاں کھڑے شبہے والی نظروں سے اُسے گھور رہے تھے۔ "بیچ بیچ میں "کون ہے؟ کون ہے؟" کے سوال اُٹھ رہے تھے۔ "بے چارا بے دخل ہے۔" ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ مگر اُس کی بات پر کسی نے دھیان نہ دیا، جیسے کہہ رہے ہوں، وہ تو ہے، مگر ہے کون؟ بے دخلوں سے ان لوگوں کی پوشیدہ نفرت کے آثار اب ظاہر ہونے لگے تھے۔

"کہاں کا ہے؟" ایک نوجوان بولا۔ "کوئی جاسوس تو نہیں؟"

فضا میں تشدد کا رنگ اُچھلا تھا۔ اسد خطرے کو بھانپ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ اور لوگ گلی میں چلے آ رہے تھے۔ اسد نے محسوس کیا کہ ایک لمحہ بھی اگر ضائع ہوا تو بات ہاتھ سے نکل جائے گی۔ ایک غلط قدم، اور یہ لوگ اندھوں کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اُس نے لاٹھی اور گدڑی سنبھالی، اور مصنوعی غصے سے بولا: "غریب بے دخل ہوں، خدا کا خوف کرو، مصیبت کا مارا ہوں، ایک گھڑی آرام کرنے کو بھی جگہ نہیں ملتی۔" اور جواب کا انتظار کیے بغیر تیز تیز قدموں سے چل نکلا۔ مڑ مڑ کر اُس نے دو ایک بار پیچھے دیکھا تو اُس کو تسلی ہو گئی کہ کوئی اُس کا پیچھا نہیں کر رہا۔ وہ چلتا گیا حتیٰ کہ گاؤں سے نکل کر جنگلوں میں پہنچ گیا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کا لبادہ

اُتر گیا ہے اور وہ ننگا ہو کر چلا جا رہا ہے، جیسے کبھی کبھی خواب کی حالت میں وہ اپنے آپ کو ننگے بدن لوگوں کے بیچ دیکھا کرتا تھا۔ اُس پہ وہی سہم طاری تھا جو خواب میں اُس کے اوپر چھایا ہوتا تھا۔ اُس کے سب اوڑھنے بچھونے اور پردے ایک ایک کر کے اُتر گئے تھے۔ وہ جنگل کی چھوٹی سے چھوٹی آواز پہ چونک رہا تھا۔ بعد میں جب کبھی ان واقعات کے اوپر دماغ دوڑانے کا موقع اُسے ملا تو اُس نے یاد کیا کہ اُس کے فراری سفر میں شاید یہ وہ مقام تھا جہاں سے قسمت نے اُس کا ساتھ دینا چھوڑ دیا تھا۔ کئی سال کے بعد ان باتوں پہ غور کرتے ہوئے ایک بار اُس نے سوچا کہ قسمت ایک طرح کی ہمت ہوتی ہے۔ ہمت ٹوٹ جائے تو قسمت ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ اس جگہ پہ پہنچ کر اُس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

ساتھ ساتھ اُسے ان باتوں کا برابر علم بھی تھا۔ اُس کا ہر دم جیتا جاگتا دماغ سب چیزوں سے باخبر تھا۔ اُس کے اندر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی جنگ ابھی جاری تھی۔ مگر اس باخبری نے اُس کی حالت میں کوئی خاص فرق نہ ڈالا۔ اُس نے دوبارہ اپنا تمام تصرفات کے وقت کرنا شروع کر دیا تھا۔ دن کے وقت وہ آبادیوں کے قریب جانے سے ڈرنے لگا۔ اُس پچھلے گاؤں میں اگر کوئی اپنا آدمی تھا، اُس نے سوچا، تو خبر کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہوگی۔ آرام کا سارا وقت وہ اب کسی پہاڑ کی کھوہ میں یا جنگلوں میں بسر کرتا۔ خوراک وہ زیادہ تر درختوں سے اور کھیتوں میں کھڑی یا گری پڑی فصلوں سے حاصل کرنے لگا تھا۔ کبھی کبھار وہ بھوک سے مجبور ہو کر شام کے وقت کسی گاؤں کے باہر کسی کھلے دروازے پر جا کھڑا ہوتا اور اُسے ایک وقت کی روٹی مل جاتی۔ مگر وہ وہاں ٹھہرتا نہیں، کھانا کھاتے ہی وہاں سے چل نکلتا۔ اب کبھی کبھی کمزوری کی لہریں اُسے کمر کے پچھلے حصے میں اور پنڈلیوں میں اُترتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ اُس کی ٹانگوں میں درد اُٹھنے لگتا۔ چڑھائی کا راستہ طے کرنے کے دوران اُسے سانس برابر کرنے کے لیے سستانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اُس کی ایک چپلی ٹوٹ گئی تھی اور چلنے میں تکلیف دینے لگی تھی۔ اُس نے وہ چپلی اُتار کر لاٹھی کے ساتھ لٹکا لی۔ اب اُس کے ایک پاؤں میں جوتا تھا اور دوسرا پاؤں ننگا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اُس کا ننگا پاؤں دُکھنے لگا۔ اُس نے بائیں سے چپلی اُتار کر دائیں پاؤں میں پہن لی۔ چپلی گو دُوسرے پاؤں کی تھی مگر چلایا جا سکتا تھا۔ تاہم تھوڑی ہی دیر میں اُس کا بایاں پاؤں درد کرنے لگا۔ اُس نے دوسرے پاؤں سے چپلی اُتار کر پھر اس پاؤں میں پہن لی۔ اسی طرح وہ وقفے وقفے پہ ایک چپلی کو دونوں پاؤں میں بدلتا ہوا چلتا گیا۔ اِس سے صرف اتنا ہو سکا کہ وہ رات بھر چلتا رہا، مگر اب ایک کی بجائے دونوں پاؤں زخمی ہو گئے۔ صبح ہوتے ہوتے دُوسری چپلی بھی اُکھڑنے لگی۔ دن کے کسی وقت اُس نے دونوں ٹوٹی ہوئی چپلیاں ایک جگہ پر چھوڑ دیں۔ ننگے پاؤں چلنے سے اُس کے سفر کی رفتار کم پڑ گئی تھی۔ ایک اور مجبوری اس سے یہ پیدا ہوئی کہ اب اُسے دیکھ بھال کر چلنا پڑتا تھا مبادا جس میں تیز پتھر اور خاردار جھاڑیاں نظر نہ

آتی تھیں جو اس کے پاؤں کو کاٹ دیتی تھیں۔ چنانچہ اب وہ اپنا سفر پَو پھٹنے پہ شروع کرتا اور دوپہر تک چلتا رہتا، پھر سورج ڈھلنے پہ چل پڑتا اور شام ہونے پر کسی جگہ جا رکتا۔ سفر چونکہ اب اُجالے کا پڑ رہا تھا، چنانچہ آبادیوں میں اس کا پھیرا کم سے کم ہوتا گیا۔ رات کو وہ کسی جنگل میں یا چٹان کے ساتھ لگ کر پڑ رہتا۔ جب سے اس کا نیا روپ اترا تھا اس کی نیند خراب ہو گئی تھی۔ اوپر سے سوتے جاگتے خواب اُسے تنگ کرنے لگے تھے۔ عجیب پرانی پرانی انجانی چیزوں کے اور جگہوں کے خواب مسلسل آتے رہتے۔ سارا دن اُسے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کر کے پچھلی رات کے خواب یاد آتے رہتے تھے۔ اُسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک لمحہ بھی ایسی نیند نہیں سویا جب اس نے خواب نہ دیکھا ہو۔ جیسے جیسے اس کے خواب بڑھتے جا رہے تھے، ویسے ویسے اس کا جاگتا ہوا ذہن یاسمین اور گمشدہ شہر کے اوپر تکیہ کرتا جا رہا تھا، جیسے کہ یہ دو صورتیں کوئی ایسے اوزار ہوں جن سے اس کے اندر کی ادھڑی ہوئی جگہیں ساتھ ساتھ رفو ہوتی چلی جاتی تھیں۔ وہ جس چیز کے بارے میں بھی سوچ رہا ہوتا یہ دو مستقل شکلیں اس کے ذہن کے پس منظر میں منڈلاتی پھرتیں۔ اس انوکھی صورتِ حال میں، جس سے اس کا سابقہ تھا، کم از کم یہ دو شکلیں اس کے ہاتھ میں ایسی آتی تھیں جو ایک مستقل راستے کی تدبیر تھیں۔ ان سے اسد کو ایک سمت کا اشارہ ملتا، آرام حاصل ہوتا۔ آرام کی ضرورت اب اُسے بھوک سے بھی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ درد اس کے پاؤں کی ہڈیوں میں بیٹھ گیا تھا۔ ایڑیوں کے کنارے پھٹ گئے تھے اور یہیں خار پڑ لے ہو کر اندر ہی اندر گوشت کی تہوں میں چل رہے تھے۔ وہ جہاں بھی رکتا گھنٹہ گھنٹہ بھر پاؤں کسی اونچے پتھر کے ساتھ آسمان کی طرف اُٹھائے پڑا رہتا، تاکہ خون کا دباؤ ان پر کم ہو۔ اس سے درد کو آرام ملتا اور ان کی سوجن میں کمی ہو جاتی، مگر جیسے ہی وہ چلنے کو ایک قدم رکھتا، ان کا سارا درد لوٹ آتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ سفری آدمی کے لیے شاید پاؤں کا زخم سب زخموں سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہر بیماری کی کاٹ اس کے اپنے اندر پنہاں ہوتی ہے۔ اس سے پیشتر کہ اسد کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہو جاتی، درد خود بخود گھٹنے لگا۔ مٹی اور ہوا نے مل کر زخموں کے منہ بند کر دیے۔ اس کے تلووں کی جلد سخت اور بے حس ہو گئی۔ وزن پڑنے پر ہڈی کے درد کی جو ٹیس اُٹھتی تھی وہ رک گئی اور گوشت کے اندر زخموں کے چھوٹے بڑے گڑھوں میں لذیذ سے درد کی حد بندی ہو گئی۔ اس کا درد اب اس کا بوجھ اُٹھانے لگا تھا۔ اس بگڑے چھوٹ کر اسد کے اندر ایک نیا جوش اور عزم پیدا ہوا۔ اب چاند اپنے عروج پر تھا۔ چنانچہ وہ دن یا رات کے کسی وقت کو بھی اٹھ کر مسلسل چلتا رہ سکتا تھا۔ ایک مقام سے سڑک کو دیکھ کر اس نے اندازہ کیا کہ اب وہ سرحد سے ایک آدھ روز کی مسافت پر ہو گا۔ اس نے کئی روز سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا تھا، مگر منزل کو قریب دیکھ کر اس کے بدن میں نئی قوت پیدا ہوئی۔

سرحد کا علاقہ خطرناک تھا۔ خاص طور پر سڑک سے دور اور دور رہ کر اُسے سرحد پار کرنی تھی۔ اس نے اپنا رخ ذرا سا تبدیل کر لیا۔ یہ ایک ایسا زاویہ تھا جو اسد کے اندازے کے مطابق اُسے ایک دو روز میں بالآخر سڑک سے دور لے جائے گا۔ تاہم یہ ایک فاش غلطی تھی۔ وہ راستے سے بھٹک گیا۔

دو روز سے وہ اپنے تازہ عزم کے ساتھ ایک سمت میں بڑھتا جا رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اس کی حس نے اُسے خبردار کرنا شروع کیا۔ جنگل میں سفر کرتے کرتے اس کی حس اتنی تیز ہو چکی تھی کہ اب وہ اپنے اندازے کی نسبت حس پہ زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ اس کا اندازہ کئی بار غلط ہو چکا تھا، مگر اس کی حس سچی رہی تھی۔ وہ رک گیا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کس مقام سے وہ بھٹکا تھا۔ آخری گاؤں جو اس کے راستے میں آیا تھا کوئی ڈیڑھ رات کی مسافت پہ تھا۔ اب وہ کیا کرے؟ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک قطعی غیر آباد، پتھریلی پہاڑیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ وہ ایک مہینے تک بھی چلتا گیا تو آبادی تک نہ پہنچ سکے گا۔ اُسے یاد آیا کہ تقریباً دو گھنٹے سے اس نے کوئی درخت بھی نہ دیکھا تھا، کسی نہ کسی مقام پہ۔ اس نے خیال کیا، درخت پتلے ہونے شروع ہو گئے ہوں گے، پھر دیکھے بھالے بغیر یہ پتھریلا علاقہ شروع ہو گیا اور جنگل ختم ہو گئے۔ مجھے یہ سب کچھ نظر کیوں نہیں آیا؟ میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے؟ اسد نے دور دور تک نظر دوڑائی۔ آسمان کی طرف دیکھا۔ چاروں طرف چاندنی روشنی میں جہاں تک نظر جاتی تھی پتھروں کی سیاہ اور سفید چوٹیوں کے خیمے تھے اور وہ اکیلا ذی روح ان کے درمیان گمشدہ کھڑا تھا۔ وہ کھڑا کھڑا لرزنے لگا۔ سمت کا اندازہ کھو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک پتھر کا سہارا لیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے پیٹ میں بھوک کی ایک تیز لہر اُٹھی۔ اس نے سوچے بغیر گٹھڑی میں ہاتھ ڈال کر چند پتے نکالے اور اُنہیں منہ میں بھر لیا۔ پتے نیم خشک ہو چکے تھے، مگر ان کا مزا بُرا نہ تھا۔ ان میں ہلکی کھٹائی اور ہلکی ہلکی تلخی تھی۔ اس مخصوص ذائقے نے اس کے منہ میں اُبلتا ہوا لعاب پیدا کیا جس سے اس کا حلق تر ہو گیا۔ ان کو آہستہ آہستہ چبا کر نگلتے ہوئے اس کے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ دہشت کا لمحہ گزر گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے سیدھی طرح سوچنا شروع کیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ بجائے ادھر اُدھر کے اندازے لگانے کے اُسے سب سے پہلے پچھلے پاؤں درختوں تک پہنچنا چاہیے تاکہ کچھ خوراک کا آسرا ہو۔ یہاں تو ایک دانہ منہ میں ڈالنے کو دستیاب نہ ہو گا، اور پانی کا تو یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے حیرانی سے اپنے اردگرد دیکھا اور اُٹھ کر اُلٹے پاؤں چل پڑا۔ پہلی سرسبز پہاڑی تک پہنچتے پہنچتے اُسے تین گھنٹے کے قریب لگے۔ صبح ہو رہی تھی۔ اسد نے درختوں کے پتے اور چند خود رَو جھاڑیوں کے پھل، جو اس کے علم میں تھے، کھا کر پیٹ بھرا۔ پانی کی تلاش میں وہ دوپہر تک چلتا رہا۔ آخر اُسے دور سے ایک سیاہ عمودی لکیر پہاڑ میں کھنچی ہوئی نظر آئی۔ یہ پانی کی نشانی تھی۔

وہاں پہ پہنچ کر وہ قطرہ قطرہ گرتے ہوئے پانی کے نیچے منہ رکھ کر دیر تک پیتا رہا۔ پھر وہ سو گیا۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی۔ پہلے اُس نے خیال کیا کہ وہ اُلٹے پاؤں چلتا جائے اور واپس اُس مقام تک پہنچے جہاں سے اُسے آخری بار سڑک نظر آئی تھی۔ مگر یہ دو روز کا معاملہ تھا۔ پھر یہ بات بھی پکی نہیں تھی کہ وہ اس مقام تک پہنچتا ہے یا کہیں اور نکل جاتا ہے۔ چنانچہ اُس نے سوچا کہ یہ سفر کو ضایع کرنے والی بات ہے۔ اس کی بجائے اُسے کم و بیش اُسی سمت میں آگے بڑھنا چاہیے جس سمت میں وہ جا رہا تھا۔ صرف اتنی احتیاط رہے کہ اب وہ جنگل کے ساتھ ساتھ چلے اور اُس بے آب و گیاہ خطّے میں نہ بھٹکنے پائے جہاں پہلے جا نکلا تھا۔ وہ اُٹھ کر چل پڑا۔ آدھی رات کے وقت وہ تھک کر ایک جگہ پر سو گیا۔ جب وہ جاگا تو پَو پھٹنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ آبادی کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔ اُس نے گٹھڑی میں سے مٹھی بھر پتے نکال کر منہ میں ڈالے اور اُنہیں چبانے لگا۔ اُس نے محسوس کیا کہ جنگل کی جھاڑیوں کی نسبت یہ پتے کہیں زیادہ قوت بخش تھے۔ یہ پتے سانس کو ٹھیک کرتے تھے یا نہیں، مگر بدن میں گرمی ضرور پیدا کرتے تھے۔ اُس نے تین چار مٹھی بھر پتے کھائے۔ ہر مٹھی کے بعد وہ گٹھڑی کو ٹٹول کر دیکھ لیتا جو تیزی سے گھٹتی جا رہی تھی، مگر مزید ایک مٹھی بھرنے سے باز رہتا۔ جب وہ اُٹھا تو اپنے آپ کو پہلے سے کہیں زیادہ توانا محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی بھوک اور پیاس بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ ان کی خاصیت اچھی ہے، اُس نے سوچا، مگر ساتھ ہی اُسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ انہیں غلط مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اُس نے ارادہ کیا کہ وہ انہیں کم سے کم استعمال کرے گا اور کسی صورت بھی ایک وقت میں چند پتوں سے زیادہ نہیں کھائے گا۔ مگر اس وقت تک وہ گٹھڑی جو پہلے ہی کاغذ کی سی ہلکی تھی، اور اب اپنی نمی ضایع کرنے کے باعث اور بھی مختصر ہو گئی تھی، تقریباً آدھی خالی ہو چکی تھی۔ اسد نے اس پوٹلی کو کھول کر دوبارہ اُس کی گانٹھ لگائی تاکہ لاٹھی کے سرے پر کسی رہے۔ اُس نے دوپہر تک سفر جاری رکھا اور اس دوران تین چار پتے نکال کر کھائے۔ ان پتوں کے تسکین بخش اثرات کے علاوہ ان کا ذائقہ اسد کے منہ کو لگ گیا تھا۔ ان کے ہلکے کھٹے اور ہلکے ہلکے تلخ ذائقے کی لذت گو ایسی نہ تھی کہ ایک دم مزا دیتی، مگر اندر ہی اندر منہ کو لگ جانے والی تھی۔ بھوک اور پیاس کی تسکین کے لیے یہ بُوٹی اکسیر تھی، چنانچہ کسی دوسرے جھاڑ جھنکاڑ کو چکھنے پر اُس کا دل نہ چاہتا۔ جب اُسے احساس ہوا کہ پتے تیزی سے کم ہو رہے ہیں تو اُس نے دیر تک انہیں منہ میں رکھنا شروع کر دیا تاکہ دیر تک چلتے رہیں۔ اگلے روز وہ محض انہیں چوسنے پر آ گیا۔ وہ ایک ایک پتے کو منہ میں ڈالتا اور اسے تالو اور زبان میں داب کر چوسنے لگتا۔ وہ زبان بھی ہلانے سے گریز کرتا تاکہ پتے کو زیادہ گزند نہ پہنچے، حتیٰ کہ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد پتا وہیں پڑا پڑا گھل کر ایک جھلّی کی شکل اختیار کر لیتا اور تالو سے چپک جاتا۔ اس وقت تک اس کا تمام تر ذائقہ اُس میں سے خارج ہو چکا ہوتا، چنانچہ وہ زبان اس پر سے ہٹا کر جلدی سے اُسے نگل لیتا۔ پھر دوسرا پتا منہ میں ڈال کر زبان اُس کے

اُوپر دبا دیتا۔ اسی طرح خوشی اور غم، سُود و زیاں کے ملے جلے جذبات کے ساتھ، اُن پتوں سے خوراک حاصل کرتا ہوا وہ چلتا رہا، اور کوئی ڈیڑھ دن میں اُس نے کافی فاصلہ طے کر لیا۔ اب اس علاقے کی صورت کچھ بدلتی آ رہی تھی۔ جنگل کی شادابی بڑھ گئی تھی، اور اسد کے تجربے نے اُسے بتایا کہ جلد ہی اُس کا راستہ کسی وادی میں نکلنے والا ہے۔ آخر اگلے روز رات کے وقت وہ ڈھے پڑا۔

ظاہر ہے کہ پتوں کا اثر جزوی اور وقتی تھا۔ پتے کتنا ہی ظاہری اثر کیوں نہ رکھتے ہوں آخر پتے ہی ہوتے ہیں، خوراک نہیں ہوتے۔ عارضی طور پر اُن پتوں نے اسد کے بدن میں ایک طرح کی حدت پیدا کی تھی جس کے فریب میں آ کر وہ چلتا گیا اور اِس طرح اپنی رہی سہی طاقت بھی صرف کر بیٹھا۔ چنانچہ کوئی تیس گھنٹے کے مسلسل بے خوراک سفر کے بعد اُس کی انتڑیوں کے عروق سُکڑ گئے اور اُس کی ٹانگیں اُس کے بوجھ کے نیچے جھول گئیں۔ وہ تیورا کر گر پڑا۔ اُس نے دو ایک بار اُٹھنے کی کوشش کی، پھر گٹھڑی لپیٹ کر ڈھلوان زمین پر نیم دراز ہو گیا۔ گھبراہٹ کے عالم میں اُس نے مٹھی بھر بھر کر پتے منہ میں ڈالنے شروع کر دیے۔ اس تازہ حادثے نے اُن کی بچا رکھنے کی سکیم کو تباہ کر دیا تھا، مگر کافی تعداد میں پتے چبا کر نگلنے سے اُس کے بدن میں کچھ کچھ گرمی پیدا ہونے لگی۔ دھوپ بھی نکل آئی تھی۔ سورج کی حدت سے کچھ دیر میں اُس کا لرزہ اُتر گیا اور وہ جلد ہی غنودگی کی حالت میں پہنچ گیا۔ نیم خواب کی حالت میں وہ گٹھڑی میں سر چھپائے، پہلو کے بل سکڑ کر ایک پہر تک پڑا رہا۔ کئی سوتے جاگتے ہوئے خواب اُس کی آنکھوں سے گزرے۔ ان خوابوں کی شکل بھی نئی تھی۔ ان میں جنگلی جانوروں کی بھرمار تھی۔ عجیب و غریب شکلوں کے درندے مختلف چٹانوں اور درختوں کے عقب سے نکل نکل کر اُسے ڈرا دھمکا رہے تھے۔ ان میں سے کئی انسانوں کی آواز میں باتیں کرتے تھے اور بعض کے چہرے عجیب الخلقت تھے۔ وہ بار بار خواب میں چونک اٹھتا۔ بیچ بیچ میں وہ جاگ کر آنکھیں کھولتا تو ایک لمحے میں منظر صاف ہو جاتا اور اُس کے ذہن کے پردے پر وہی دو مستقل صورتیں، مشعلوں کی مانند گڑی ہوئی، نظر آتیں جس سے سب بلائیں غایب ہو جاتیں۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وقت پھر آزاد روی سے اُس کے اندر اور باہر جاری و ساری ہو گیا ہے جس پر سے اُس کا اختیار اُٹھتا جا رہا ہے۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی گٹھڑی کے گرم گھروندے میں اسی طرح پڑا رہے اور کبھی وہاں سے نہ ہلے حتیٰ کہ وقت کا یہ لشکر ختم ہو جائے۔ اُس کے جسم کو آرام مل رہا تھا۔

اسی حالت میں لیٹے ہوئے اُسے خیال ہوا کہ ایک مانوس آواز اُس کے کان میں پڑ [illegible] یہ میر حسن کی آواز تھی۔ پہلے اسد نے سوچا کہ وہ حسبِ معمول کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ خواب کی کیفیت سے نکل آیا۔ اُس نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا کہ وہ خود، منہ گٹھڑی سے نکالے، آنکھیں کھولے بیٹھا ہے اور میر حسن اُس کے سامنے کھڑا اُس سے مخاطب ہو رہا ہے۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" میر حسن اُس سے پوچھ رہا تھا۔ اُس کا لہجہ نرم مگر پختہ تھا۔

"کچھ نہیں۔" اسد نے جواب دیا۔

میر حسن کے ہمراہ دو اور کشمیری تھے جو ذرا دُور ایک درخت کے ساتھ بیٹھے روٹی کھا رہے تھے۔ میر حسن کو اپنے سامنے پا کر اسد کے دل میں خوشی کے غیر متوقع جذبات اُٹھ رہے تھے، جیسے اُس کو کوئی انجانا سہارا مل گیا ہو۔ میر حسن نے چند لمحے تک گہری نظروں سے اُسے دیکھنے کے بعد جھک کر گدڑی کا پلّو اٹھایا اور اسد کے جسم پر ایک نظر ڈالی۔

"تمہارے پاؤں ناکارہ ہو گئے ہیں۔" وہ تشویش سے سر ہلا کر بولا۔

اسد نے گدڑی اُس کے ہاتھ سے کھینچ کر اپنے گرد لپیٹ لی۔ "پہلے بہت خراب ہو گئے تھے۔" اُس نے کہا، "اب ٹھیک ہیں۔"

"اِس دھوکے میں نہ آنا۔" میر حسن بولا، "پیر کا زخم بُرا ہوتا ہے۔ اندر ہی اندر پھیلتا جاتا ہے۔" اُس نے لاٹھی کے سرے پر بندھی ہوئی پوٹلی کو ٹٹول کر دیکھا۔ "تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟"

اسد نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کب سے بھوکے ہو؟"

"تین چار دن سے۔"

میر حسن نے اپنی جیب سے ایک پوٹلی نکال کر کھولی۔ اُس میں چار موٹی موٹی روٹیاں بندھی تھیں۔ اُس نے دو روٹیاں نکال کر اسد کے ہاتھ میں تھما دیں۔

"یہ لو۔" وہ بولا، "اُس ڈھیری کے پیچھے گاؤں ہے۔ اُدھر تمہیں کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ کوئی پیسا ہے؟"

اسد نے روٹی توڑ کر مُنہ میں بھر لی تھی اور نفی میں سر ہلا دیا۔ میر حسن نے جیب سے ایک ایک روپے کے تین چار نوٹ اور کچھ سکّے نکال کر اسد کو دیے۔ "جو بچ گئے اُدھر جا کر پھینک دینا۔" میر حسن نے کہا۔ اسد نے نوٹ اور سکّے لے کر جیب میں ڈال لیے۔ روٹی چبانے سے اُس کے جبڑوں میں درد شروع ہو گئی تھی۔ بہت آہستہ آہستہ اُس کا خشک حلق نوالہ نیچے اُتار رہا تھا اور اُس کی نوجوان رگوں میں خون کی حدّت آنے لگی تھی۔ میر حسن اُس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اسد نے نوالہ نگل کر پوچھا۔

"اُدھر سے آ رہا ہوں۔"

"اِس راستے سے؟"

"میرا یہی رستہ ہے۔"

"کب گئے تھے؟"

"پرسوں۔"

"گمشدہ گئے تھے؟"

میر حسن نے نفی میں سر ہلایا، "وقت نہیں تھا۔"

"ذوالفقار سے ملاقات ہوئی؟"

"نہیں۔" میر حسن نے دوبارہ سر ہلا کر کہا، "مگر سب تمہارے انتظار میں ہیں۔" اسد کو علم ہو گیا کہ میر حسن سب حالات سے باخبر ہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھا روٹی توڑ توڑ کر کھاتا رہا۔ "بارڈر کدھر ہے؟" کچھ دیر کے بعد اُس نے پوچھا۔ "وہ سُرخ ڈھیری بارڈر ہے۔" میر حسن نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پتلی سی شاخ کی چھڑی اُٹھا کر چوتھی پہاڑی کی جانب اشارہ کیا۔ "اِدھر کوئی خطرہ نہیں۔ اچھا کیا اِدھر آ گئے۔ آنکھیں بند کر کے بھی جاؤ تو نکل جاؤ گے۔ تین کوس پر سڑک مل جائے گی۔ سیدھے ہاتھ پر ہو جانا۔ گمشدہ ـــــ" وہ بازو لمبا کیے چھڑی کو نصف دائرے میں دُور تک گھماتا گیا، "وہاں پر ہے۔" اُس نے جنوب مغرب میں اُفق پر چھڑی کو ٹھہرا کر کہا، "تین دن کا سفر ہے۔ تمہاری حالت اچھی نہیں، چار پانچ دن لگ جائیں گے۔ سڑک پر کوئی سواری مل گئی تو ایک ہی دن میں چلے جاؤ گے۔ مگر اچھا ہے سواری سے دُور ہی رہو۔"

"کیوں؟"

میر حسن جواب دینے کی بجائے گہری نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اسد نے پھر روٹی توڑ توڑ کر کھانی شروع کر دی۔ میر حسن کا چہرہ، اُس کا جسم، اُس کی شکل وُہی تھی، تیز اور نازک، مگر اُس کا انداز پختہ ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں رنگین کی جھلک نہ رہی تھی؛ اُس کے لہجے میں مہلک تجربے کی جھلک تھی، جیسے اُس نے آدمیوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے، اور دُنیا اُس کے آگے کھل بھی گئی ہے اور بند بھی ہو گئی ہے۔

"تم بتائے بغیر کیوں بھاگ آئے تھے؟" اُس نے پوچھا۔

"میرا کام ختم ہو گیا تھا۔" اسد نے جواب دیا۔

"بتا کر آتے تو کیا حرج تھا۔ وہ تمہارا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔"

اسد نے روٹی کا آخری نوالہ مُنہ میں ڈالا اور دُوسری روٹی کو تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ میر حسن کی آنکھیں

مسلسل اسد کے چہرے پہ لگی تھیں، جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر وہ تاسف سے سر ہلا کر بولا "تم بھی کس مصیبت میں پھنس گئے ہو۔ نہ ادھر ٹھکانہ نہ اُدھر" وہ اُٹھ کھڑا ہوا "اب یہاں سے اٹھ جاؤ۔ یہ جگہ ایسی خیر آباد نہیں جیسی نظر آتی ہے۔ آج رات کو نکل جانا" وہ چل پڑا۔

تھوڑی دُور جا کر میر حسن نے اچانک مُڑ کر اسد کی طرف دیکھا "دیکھ بھال کر جانا" وہ فکر سے بولا۔

اسد نے میر حسن کو اُن دو آدمیوں کے درمیان متوازن چال سے دُور جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اعتماد سے چل رہا تھا۔ اسد کو وہ میر حسن یاد آیا جو ابھی چند ماہ پہلے ایک نوعمر دیہاتی لڑکے کی صورت مطب کے صحن میں بیٹھا اپنی جھکی ہوئی آنکھوں سے اُس کی طرف ایسے دیکھا کرتا تھا جیسے اُس کی پرستش کر رہا ہو۔ ان چند مہینوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ اسد کے دل پر اچانک ایک گہرے افسوس کا سایہ اُتر آیا، جیسے پہلی بار اُس پہ اپنی اصل حیثیت کا انکشاف ہوا ہو۔ وہ ایک جانب سے دُوسری جانب کو جا رہا تھا، مگر یوں جیسے باہر سے باہر کو چلا جا رہا ہو۔ میں کسی ایک طرف سے بھی وابستہ نہیں ہوں، اُس نے سوچا۔ یہ کیسا کٹھن کام ہے۔

اُسی رات کو اُس نے سرحد پار کی۔ سڑک نظر آنے پر وہ دہنے ہاتھ کو مڑ گیا اور فاصلہ رکھ کر سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ سکھانا حاصل کرنے کی دقت اب بڑی حد تک ختم ہو گئی تھی، مگر اُس کے پاؤں پھر اُسے تکلیف دینے لگے تھے۔ اُن میں سوجن پیدا ہو رہی تھی۔ اُس کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور سر کے بال گندگی کے باعث چپک کر لٹوں کی صورت میں لٹک رہے تھے۔ تاہم منزلِ مقصود کی جھلک نے اُس کی کھوئی ہوئی طاقت گویا واپس لوٹا دی تھی۔ وہ اپنی لاٹھی، جس کے سرے پہ بندھی ہوئی پوٹلی کا حجم اب مٹھی برابر رہ گیا تھا، کندھے پہ رکھے، گٹھڑی سنبھالے، بچتا بچاتا ہوا اپنی منزل کی جانب بڑھتا رہا۔ جگہ جگہ پر وہ اپنے پیروں کو آرام دینے کی غرض سے بیٹھ جاتا، پھر اُٹھ کر چلنے لگتا۔ غرضیکہ اسی طرح، انتہائی افلاس کی حالت میں سفر کرتا ہوا وہ اپنے فرار کے اُنیسویں دن گُمشدہ پہنچا۔

(۱۲)

"اُس وقت بھی،" اسد نے یاسمین سے کہا، "جب میرے دل میں اندھیرا ہو چکا تھا، تمہاری شکل نے مجھے سہارا دیا۔"

یاسمین فرش پہ بیٹھی تھی۔ "کب؟" وہ بولی۔

"جب ایک ایک کر کے ساری امیدیں میرا ساتھ چھوڑ گئیں۔" کرسی پہ بیٹھے بیٹھے اسد نے دھیمے لہجے میں بات کی۔ "جب میں اُدھر سے اِدھر آ گیا اور معلوم ہُوا کہ کوئی فرق نہیں پڑا، میں باہر کا باہر رہ گیا ہوں۔" اُس نے گرم پانی کی چلمچی میں رکھے ہوئے اپنے پاؤں کو اور ان کے ساتھ یاسمین کے اُن ڈوبے سفید ہاتھوں کو دیکھا۔ "اُس وقت میرے دل میں اندھیرا ہو گیا۔"

یاسمین نظر باندھے اُسے دیکھے جا رہی تھی، جیسے اُس کو صرف دیکھنے سے مطلب ہو۔

"اُس وقت ایک تمہاری شکل تھی جس نے میری جان کو سہارا دیے رکھا۔" اسد نے کہا۔

"تمہیں میری شکل یاد تھی؟"

"ہاں۔"

"مجھے تو تمہاری شکل یاد ہی نہیں آتی۔"

"تمہاری یادداشت خراب ہے۔" وہ ہنسا، "یا تم بے وفا ہو۔"

"نہیں، اسدی، یہ سچ ہے۔" وہ بولی، "تم جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوتے ہو، میں لاکھ کوشش کروں مگر تمہاری شکل یاد نہیں آتی۔ یہ کیا بات ہے؟"

"میرے اور تمہارے اندر یہی ایک فرق ہے۔"

"کیا فرق ہے؟"

"تم مجھے اپنے سامنے رکھنا چاہتی ہو۔ میں جہاں جاؤں تم میرے ساتھ رہتی ہو۔"

"پھر کس کی بات سچی ہے؟" یاسمین نے بچوں کی طرح سوال کیا۔

"دونوں کی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں؟"

"ایک کی بات سچی ہو گی، ایک کی جھوٹی۔"

"اونہوں۔" اسد نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "دونوں کی سچی ہے۔"

"کیسے؟"

"ہم دو ہیں، مگر ایک ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"پھر تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا؟" یاسمین نے پوچھا۔ "چاہے میرے پاس رہو، چاہے چلے جاؤ؟"

اسد کی دیل اُسے ایسے مقام پہ لے آئی تھی جہاں وہ یاسمین کو جواب دینے سے قاصر تھا۔ مگر اپنے دل کے اندر اُسے احساس تھا کہ اُن کا ایک ہونا جاوبے جا کا معاملہ نہیں، ایک خیال کی بات ہے۔ یا صرف دل کی زد میں ہونے کا سوال ہے۔ اسد نے محسوس کیا کہ یہ احساس نو پید بھی نہ تھا، بلکہ ایسا تھا کہ جیسے تادیر موجود رہا ہو۔

یاسمین کے گالوں پہ آنسوؤں کے دھبے ابھی موجود تھے۔ اُس کا بھرا بھرا بدن زمین پہ ایک ایسی چٹان کی مانند تھا جو اپنے تیز اور نازک کونوں پہ جم کر کھڑی ہو مگر دیکھنے میں بے توازن معلوم ہوتی ہو۔ اُس کے سفید کُرتے کے اندر بدن کی سلوٹیں دبیز ہو چلی تھیں۔ اسد نے جھک کر ہاتھ سے اُس کے بدن کو چھوا۔ یاسمین

کے چہرے پہ رنگ گہرا ہو گیا۔

"تمہیں کب پتا چلا تھا؟" اسد نے پوچھا۔

"تمہارے جانے کے بیس دن کے بعد۔"

"تمہیں خوف نہیں آیا؟"

"کس بات کا خوف؟"

"اپنا۔" اسد نے کہا، "لوگوں کا۔"

"لوگوں کا مجھ سے کیا تعلق؟" وہ بولی، "مجھے صرف تمہارا خوف تھا۔"

"میرا خوف تھا؟"

"ہاں۔"

"کس بات کا؟"

یاسمین دیر تک نظر باندھے سوچتی رہی۔ "میں نے شام کے اندھیرے میں تمہیں دور سے صرف چند لمحوں کے لیے دیکھا تھا۔" وہ بولی، "تم میری طرف پشت کیے کھڑے تھے۔ بس، صرف یہی ایک واقعہ ہوا تھا۔"

اسد حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ "یہ تو پہلے پہل کی بات ہے۔"

"ہاں۔ مگر اتنی سی بات ہوئی تھی۔ مجھے اعتبار نہیں آتا۔ مجھے خوف رہتا ہے تم اوجھل ہو جاؤ گے۔ تمہاری شکل یاد نہیں آتی۔"

"تم تو بیوقوف ہو۔" اسد نے جھک کر اُس کے پیٹ پہ آہستہ سے ہاتھ پھیلا کر رکھ دیا۔ "تمہیں اس پہ اعتبار ہے؟"

یاسمین نے اپنا ایک ہاتھ پانی سے نکالا اور اُسے اسد کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ "ہاں۔" وہ بولی۔

اسد نے محسوس کیا کہ اس رات کے عرصے میں پہلی بار یاسمین کے منہ سے ایک یقین کی بات نکلی تھی۔ شام کے وقت جب یاسمین نے دروازہ کھول کر اُسے بازوؤں میں تھام لیا تھا، اُس تھکے ہارے ہوئے جسم کو کرسی پہ بٹھلا کر اُس کے بال دھوئے تھے اور اُن میں تیل ڈال کر کنگھی کی تھی، پھر گیلے تولیے سے اُس کے بدن کو مل مل کر صاف کیا تھا اور خشک ہونے پر چیم کے کپڑوں کا سفید جوڑا پہنایا تھا۔ اُس کے بعد فرش پہ بیٹھ کر چلمچی کے اندر نمک اور تیل ملے گرم پانی میں اُس کے پاؤں ڈبو کر انہیں ہولے ہولے ملنے لگی تھی تو اس دوران میں اُس نے رونے اور ہنسنے

ہوئے سینکڑوں باتیں کی تھیں، کچھ اپنے آپ سے، کچھ اس کے ساتھ، کچھ بات چیت کے انداز میں، مگر تمام تر بے خود بہاؤ کی حالت میں، جیسے ایک شوخ اور ہنٹ خراب میں مصروف ہو۔ اسی بہاؤ کے بیچ اُس نے اپنے پیٹ کا ذکر بھی کیا تھا، مگر اس طرح کہ جیسے اُس کی حقیقت غیر معروف ہو، یا کہ اتنی ہی اہم ہو جتنی دوسری باتوں کی حقیقت۔ مگر اب، جب کہ اسد یخنی کے دو پیالے پینے کے بعد اور نیم غنودگی کی حالت میں یاسمین کی باتیں سُننے کے بعد بیدار ہو کر اپنی کہانی بیان کرنے لگا تھا تو یاسمین نے اس سوال پہ اس طرح ہاں کہا تھا کہ جیسے اُس کے دل میں صرف اس ایک بات کا اعتبار ہو، اور کچھ بھی نہ ہو۔

"زمین کا سودا ہو گیا ہے۔" کچھ دیر کے بعد وہ بولی۔

"کس سے؟"

"زمان گل سے۔" وہ بولی، "قیمت کچھ کم دے رہا ہے۔ مگر نقد دینے کا وعدہ کر رہا ہے۔ مکان اور مطلب والی زمین کا بھی سودا ہو جائے تو فیصلہ ہو۔"

باتیں کرتے کرتے یاسمین نے ہاتھوں سے ہولے ہولے رگڑ کر اُس کے پَیر صاف کر لیے تو گرم پانی کی چلمچی اُٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور موٹی ململ کے ایک دوپٹے سے لمبی لمبی پٹیاں پھاڑ کر انہیں پیروں کے گرد لپیٹنے لگی۔

"جلدی کی کیا ضرورت ہے۔" اسد نے کہا، "بیچنا ہی ہے تو مناسب قیمت نے لو بیچو۔"

"اب میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔" یاسمین نے اُٹھ کر اسد کی کرسی کا رُخ موڑا اور اس کے پَیر اُٹھا کر آہستہ سے چارپائی پر رکھ دیے۔ پھر وہ اُن کے پاس چارپائی پہ بیٹھ گئی اور پٹیوں کو دوبارہ کھول کر ٹھیک سے باندھنے لگی۔

اسد نے پڑھ اور سُن رکھا تھا کہ اولاد کی خبر دل میں ایک عجیب سرمستی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ یاسمین کو انہماک سے پٹیاں کھولتے اور باندھتے ہوئے دیکھ کر اسد نے سوچا، وہ بات کیا غلط تھی؟ غلط نہیں تھی تو وہ جذبہ کہاں تھا؟ اپنے اندر جگہ جگہ پہ اُس نے جھانک کر دیکھا، جیسے کسی ناقص مشین کے اندر نظر ڈال رہا ہو، مگر ولدیت کی سرخوشی کہیں دکھائی نہ دی۔ اُس وسیع و عریض سرزمین پہ اب صرف ایک احساس چھایا تھا ــــــ کہ بہت سی باتیں غلط نکل آئی ہیں، بہت سی دل کی زد سے باہر جا چکی ہیں۔ اب وقت نہیں۔

"یہ شور کیسا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"بتایا تو ہے۔ ہانکے کو جا رہے ہیں۔"

"اچھا؟"

اسد نے اُٹھنے کی کوشش کی تو یاسمین نے اس کے پاؤں پہ ہاتھ رکھ کر روک دیا۔ "بیٹھے رہو۔ پَیر پھٹ جائیں گے۔ باہر تم نے دیکھا نہیں؟"

"نہیں۔ ایک طرف سے آوازیں آ رہی تھیں، مگر کوئی دکھائی نہیں دیا۔"

"چار پانچ دن سے تیاری ہو رہی ہے۔ پشاور کی طرف سے ایک شکاری آیا ہے۔ کہتے ہیں شیر کا پرانا شکاری ہے۔ جنگلات کے افسروں نے انتظام کیا ہے۔"

"شاہ رُخ بھی ساتھ ہے؟"

"اسد، تم نے میری کوئی بات نہیں سُنی۔" یاسمین نے کہا، "شاہ رُخ کی تبدیلی ہو گئی ہے۔"

"کب؟"

"ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ تمہیں آتے ہوئے باہر کوئی نہیں ملا؟"

"اوہوں۔ دو تین آدمی گزرے تھے، مگر کسی نے پہچانا نہیں۔"

"کون تھے؟"

"پتا نہیں۔ اندھیرا تھا۔"

باہر اب آوازوں کا شور یوں سُنائی دے رہا تھا جیسے جلوس اُن کی دیوار کے پاس سے گزر رہا ہو۔ اسد نے اپنے پاؤں یاسمین کے ہاتھوں سے چھڑائے اور انہیں زمین پہ رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بوجھ پڑنے پہ پیروں میں پھر ایک مدھم سا، گہرا سا درد اُٹھا جس کی تیز دھار عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی۔ یاسمین چارپائی پہ بیٹھی فکرمند نظروں سے اُسے فرش پر آہستہ آہستہ چل کر کھڑکی تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اسد نے کھڑکی کھولی تو آوازیں کمرے میں آ داخل ہوئیں۔

"آدھے آدمی جا چکے ہیں۔ شکاری اُن کے ساتھ ہے۔" یاسمین بولی، "باقی کے اب جا رہے ہیں۔ رات کو ہانک لگائیں گے۔ پہلے دو دن تک اُدھر بکرا باندھ کر گھات میں بیٹھے رہے ہیں، مگر باگھ پھٹکا تک نہیں۔ شکاری کا کہنا ہے جانور چالاک ہے، مشکل سے قابو میں آئے گا۔ آج افسروں نے شکاری کو صرف ایک دن کی اور مہلت دی ہے۔"

"کیوں؟"

"افواہ ہے جنگ شروع ہونے والی ہے۔"

اُن کے ہاتھوں میں چیڑ کی مشعلیں تھیں اور وہ ایک ایک کر کے نیچے بستی کو جانے والے رستے پہ اترتے جا رہے تھے۔ مشعلوں کی روشنی گاؤں کی دیواروں پر پڑ رہی تھی۔ جب وہ قافلہ اُترائی میں غائب ہو گیا تو فضا میں ایک

روشن غبار اُن کے سروں کے اوپر اوپر دُور تک چھتا رہا۔ اب اُن کی آوازیں دُور سے آ رہی تھیں۔ اسد کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ اُس نے کہنیاں کھڑکی میں رکھیں اور اُن پہ بدن کو سہار کر کھڑا ہو گیا۔ پاؤں پہ بوجھ کم ہُوا تو پنڈلیوں کو کچھ آرام آیا۔

"جنگ شروع ہونے والی ہے" اُس نے بے خیالی میں دُہرایا۔

"ہاں۔ افواہ ہے ایک دو دن میں شروع ہونے والی ہے۔ ہر وقت جہاز پھرتے رہتے ہیں۔ تم نے بھی دیکھے ہوں گے۔"

"ہاں۔"

"کل دو جہاز ہمارے گھر کے اوپر سے گزرے تھے۔ اتنے نیچے کہ آواز سے کان پھٹ گئے۔ سارا گاؤں نکل آیا تھا۔ فوج کی ناکہ بندی ہر طرف ہو رہی ہے۔ بمشکل سے سرکار نے ایک دن کی اور مہلت دی ہے۔ اسی لیے رات کو ہانکا لگوا رہے ہیں۔ اسدی، کھڑکی بند کر دو۔ سردی لگ جائے گی۔"

دفعتہً اسد کو احساس ہُوا کہ وہ آنکھیں کہیں کھو گئی ہیں۔ اُس نے اندھیرے میں دُور دُور تک نظر دوڑائی۔ جنگل خالی تھا۔ پھر اُس نے اپنی آنکھیں بھینچ کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نہ شیشوں کا عکس نہ وہ شبیہہ۔ اُس کا دل خالی پڑا تھا۔ وہ انگارہ سی جلتی ہُوئی آنکھیں ہوا ہو گئی تھیں۔ وہ حیران رہ گیا۔ اس کے دل میں یہ خدشہ ہمیشہ سے تھا کہ ایک نہ ایک دن اُس کی نظر رُک جائے گی۔ اُس نے بار بار اپنی آنکھیں بند کر کے دیکھا۔ خیال کی قوّت سے اسے برآمد کرنے کی کوشش کی۔ آخر پلکیں گرا کر دیر تک سُن کھڑا رہا۔ مگر وہ شبیہہ اب غائب ہو چکی تھی، جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئی ہو، یا ایک جست بھر کر کسی طرف کو نکل گئی ہو۔ اس پہ اُس کا ایمان رہا تھا، جیسے ہر ایک کا کسی نہ کسی پہ ایمان ہوتا ہے۔ اب وہ کیسے ڈھونڈے گا؟ کس شے پہ اپنا یقین رکھے گا؟ وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر گویا اُسی مقام پہ آ پہنچا تھا جہاں گھر کے اندر ایک ایک کر کے کواڑوں کے بند ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں، اور وہ بچہ اپنی دو چار چیزیں تھیلے میں ڈال کر باہر گلی میں نکل آیا تھا۔ اس کی نظر بے اختیار آسمان کی طرف اُٹھی۔ شروع ستمبر کی رات تھی اور خنک ہوا اُس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ دُور نیچے اُس بل کھاتے ہوئے پہاڑی رستے پر اب وہ جلتی ہُوئی لکیر پھر اُس کی نظروں کے سامنے آ گئی تھی جہاں وہ مشعلیں اٹھائے جنگل کو جا رہے تھے۔ "حرامی" اُس نے زیرِ لب کہا، "بزدل!"

وہ کھڑکی بند کر کے لوٹ آیا۔ چارپائی پہ بیٹھ کر اُس نے پوچھا: "ذوالفقار کے آدمی کب آئے تھے؟"

"پچھلی اتوار کو" یاسمین نے کہا، "بعد میں بھی آئے ہیں، مگر باہر سے ہی پوچھ کر چلے جاتے رہے ہیں۔ اسدی؟"

"ہوں۔"

"تمہارے اُوپر کوئی پابندی تو نہیں تھی؟"

"اونہوں۔"

"پھر وہ آدمی کیوں آئے تھے؟"

"خیر خبر پوچھنے آئے ہوں گے۔" اسد نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ وہ تکیے پہ سر رکھ کر لیٹ گیا۔ "یاس!" وہ بولا، "تم تو کہتی تھیں تم اپنا گھر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتیں۔"

"یہ میں اُس وقت سوچتی تھی جب تم میرے پاس تھے۔" وہ بولی، "جب تم چلے گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ تمہارے اُوپر ہی میری جان کا انحصار ہے۔ اور کسی بات کی حقیقت نہیں۔ اسد؟"

"ہاں۔"

"تم کیا چاہتے ہو۔ میں یہاں رہوں یا چلی جاؤں؟"

"تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔ میں تو چاہتا ہوں جہاں رہو میرے ساتھ رہو۔"

"تم بھی تو کہتے تھے۔" یاسمین نے اچانک پوچھا، "کہ اپنے عمل سے ایک قدم اٹھانا چاہتے ہو۔ اب مطمئن ہو گئے ہو؟"

اسد دیر تک اُس کے چہرے پر نظر جمائے دیکھتا رہا، جیسے کسی بات کا خیال کر رہا ہو۔ میں اسے کیا بتاؤں، اُس نے سوچا، کہ بے عملی سے ہم شکار بنتے ہیں اور عمل سے قاتل؟

"ہاں۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

یاسمین اُس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

جب دروازے پر دستک ہُوئی تو اسد اُٹھ بیٹھا، جیسے وہ پہلے سے ان کا منتظر ہو۔ اُس کے بدن پہ گو تھکن کے آثار تھے، مگر اُس کے چہرے پہ اطمینان تھا۔ اُس نے پائنتی کی جانب سے حکیم کا جوتا اٹھا کر پہننے کی کوشش کی، مگر پٹیوں میں بندھے ہوئے پیر جوتوں میں داخل نہ ہو سکے۔ چند سیکنڈ کے بعد وہ اس کوشش کو ترک کر کے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ بدن کے بوجھ کو پاؤں پر استوار کرنے کے بعد اُس نے اپنا لباس درست کیا اور آہستہ سے فرش پہ ایک قدم اٹھایا۔ اسد کا قدم اُٹھتے ہی یاسمین، جو پاؤں کے پنجوں پہ اپنا جسم سنبھالے گم سُم بیٹھی تھی، لپک کر اسد کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"ذوالفقار کے آدمی آئے ہوں گے۔" اسد نے اطمینان سے کہا۔

"تمہیں کیسے پتا ہے؟"

"میرا خیال ہے وہی ہوں گے۔ اس وقت اور کون ہو سکتا ہے۔"

"کیوں؟ کیوں نہیں ہو سکتا؟" وہ بولی۔ "اس وقت کیا کرنے آئے ہیں؟"

"کوئی پیغام وغیرہ لے کر آئے ہوں گے۔" اسد نے کہا۔ "فکر کی کیا بات ہے؟"

"میں جاتی ہوں۔" یاسمین اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "تم نہ جاؤ۔"

"تم ان سے کیا کہو گی؟ یہی کہ میں اندر بیٹھا ہوں۔"

"میں ان سے کہوں گی صبح کے وقت آئیں۔"

"کیا فائدہ؟ ایک بار تو مجھے ذوالفقار سے ملنا ہی ہے۔" اسد صبر سے بولا۔

دستک دوبارہ ہوئی۔ رات کے سناٹے میں لکڑی کے دروازے پر دستک والا ہاتھ بھاری پڑتا ہوا سنائی دیا۔ یاسمین کے چہرے پر ہراس پھیل گیا۔

"اسد،" وہ بولی، "میرا دل ڈر رہا ہے۔ مت جاؤ۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔" اسد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ "ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ابھی ان سے بات کر کے آجاتا ہوں۔"

جب اسد نے تاریک صحن میں قدم رکھا تو وہ بولی، "جلدی آجانا، اسدی۔"

"ابھی آتا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔"

مگر وہ اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک چلی آئی۔ "ان سے کہنا ابھی تمہارے پیر خراب ہیں۔" وہ چپکی رہی، "ایک دو دن کے بعد آؤ گے۔"

"ہاں ہاں۔ ایک دو دن کے بعد۔" اسد نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔

"ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"ہاں۔"

مگر وہ کنڈی اتارنے لگا تو یاسمین پھر اس کے سامنے آگئی۔ "تھوڑی دیر اور دیکھ لو، اسدی۔ شاید چلے جائیں۔"

"نہیں جائیں گے۔" اسد آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"کیوں؟"

"اس طرح نہیں جائیں گے۔" وہ بولا، "ابھی نہیں فارغ کرتا ہوں۔ تم اندر چلو۔"

"جلدی کرنا۔"

"ایک منٹ میں۔" وہ بولا، "تم اندر چلو۔ میں آتا ہوں۔"

جب اسد نے دروازہ کھولا تو باہر تاروں کی روشنی میں جس چیز پر سب سے پہلے اس کی نظر پڑی وہ دو خچر تھے۔ خچروں پر زین کسی تھی اور وہ سر جھکائے کھڑے تھے۔ پہلی نظر میں اسد کو کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ پھر یاسمین نے لالٹین اٹھائی تو نیم تاریکی میں دو آدمیوں کی شکلیں نظر آئیں۔ صاف طور پہ دکھائی نہ دیتا تھا کہ ان آدمیوں نے وردیاں پہن رکھی تھیں یا سادے لباس میں تھے، مگر ان میں سے ایک دروازے کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف دروازے سے لگ کر کھڑے تھے، جیسے پہرے دار ہوں۔ جب اسد نے دہلیز پہ قدم رکھا تو وہ آدمی اپنی جگہ پر ٹکے رہے، مگر اسد نے محسوس کیا ان دونوں میں خفیف سی حرکت ہوئی ہے، جیسے آگے بڑھنے سے پہلے بدن کو سنبھال رہے ہوں۔ اسد دہلیز پہ ایک پاؤں رکھے رکا رہا۔ اچانک پیچھے سے یاسمین کی بے دم آواز آئی: "دروازہ بند کر لو، اسدی۔" ابھی الفاظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ دو آدمیوں نے جھپٹ کر اسد کو ہوا میں اٹھا لیا۔ وہ اپنے بازو اسد کی کمر اور ٹانگوں میں ڈالے، اٹھائے اٹھائے اسے ایک خچر کے پاس لے گئے۔ وہاں پر انہوں نے اسے اوپر اٹھا کر آہستہ سے خچر کی پشت پر بٹھا دیا۔ اسد کے بدن سے مزاحمت خارج ہو چکی تھی۔ وہ اپنا بوجھ ان کے بازوؤں کی پالکی پہ ڈالے آرام سے خچر کے اوپر جا بیٹھا۔ کاٹھی پہ بیٹھ چکنے کے بعد اس نے نیچے کودنے کی کوشش نہ کی، بلکہ اپنے جسم کو دائیں اور بائیں کھسکا کر زین کی مضبوطی کو جانچا اور پھر ایک جگہ پہ جم کر بیٹھ گیا۔ ایک آدمی چھلانگ لگا کر اس کے پیچھے سوار ہوا۔ اس آدمی نے اسد کی بغلوں کے بیچ سے ہاتھ آگے نکال کر باگ سنبھال لی۔ خچر نے سر اٹھایا اور لمبے لمبے کان گول چکروں میں پھرانے لگا۔ اسد سیدھا بیٹھا خچر کے گھومتے ہوئے کانوں کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے کان میں ایک آواز آئی: "چھوڑ دو — مجھے چھوڑ دو۔"

اس آواز کی یاسمین کی آواز سے، یا کسی انسان یا حیوان کی آواز سے مشابہت نہ تھی، بلکہ ایک بادل کے پھٹنے کی سی آواز تھی۔ صرف اسد کو علم تھا کہ یہ آواز یاسمین کی ہے، اور اپنے نیم خواب ذہن کے اندر وہ اس آواز کا منتظر تھا۔ مگر اس پھٹی ہوئی گرج دار آواز کا وہ متوقع نہ تھا۔ وہ چونک پڑا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بوڑھی حشمین بی بی عقب سے یاسمین کی کمر میں بانہیں ڈالے پورے زور سے اسے اندر کی طرف کھینچے ہوئے تھی۔ یاسمین آدھی دروازے کے اندر اور آدھی باہر، دونوں بازو اپنے آگے ہوا میں پھیلائے رات کی تاریکی

میں اُن فراری سایوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی جو غائب ہوتے جا رہے تھے۔

"مجھے جانے دو" وہ گرج رہی تھی "مجھے جانے دو — اسدی" اُس نے ایک لمبی کوک لگائی،

"اسدی ی ی —"

پھر اُس کی آواز کا زور ٹوٹنے لگا۔ "مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ" وہ ایڑ لگاتے ہوئے خچروں کے پیچھے اُسی ہیبت ناک آواز میں پکار کر بولی "مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ ——"

دیکھتے دیکھتے خچر تاریکی میں غایب ہو گئے۔ گاؤں میں اُس وقت صرف اِکّا دُکّا مرد موجود تھے۔ اِس شور پر گھروں کے دروازے کھلنے لگے۔ کہیں کہیں سے عورتیں اور مرد اور بچے نکل کر اکٹھے ہونے شروع ہوئے۔ جب یاسمین ہار کر دروازے کے اندر زمین پر ڈھیر ہو گئی تو حسین بی بی نے اُسے بازوؤں میں بھر کر اُٹھانے کی کوشش کی، پھر وہ بھی ہار کر اُس کے پاس بیٹھ رہی۔ یاسمین کی شلوار پر خون کا ایک دھبا نمودار ہو کر پھیلتا جا رہا تھا۔ رات آدھی نکل چکی تھی۔

(۳)

Ah, but a man's reach should exceed his grasp or what's a heaven for

R. Browning

اندھیری رات میں جیپ بتیاں بجھائے سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ پچھروں والے جیپ کچی سڑک پہ آ کر چپتے
ٹرجیپ میں سے تین آدمیوں نے نکل کر خاموشی سے قیدی کو وصول کیا۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ جب وہ
سب جیپ کے اندر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ چکے ٹرجیپ وہاں سے روانہ ہوئی۔ بے در اندھیرے میں روشنی کی لکیریں
اچھل کر پھیلیں اور انجن کی آواز نے فضا میں شور برپا کر دیا۔ اسد کو یوں محسوس ہوا جیسے سوئی ہوئی رات اٹھ کر چل
پڑی ہو۔ سڑک، جو دن کی روشنی میں گہرے نیلے رنگ کی تھی، اب سیاہ نظر آ رہی تھی۔ بتیوں کی روشنی ایک
کٹے پھٹے ہوئے عجیب پنکھے کی شکل میں سڑک پر اور پہاڑوں کی دیواروں پر آتی چلی جا رہی تھی۔ مگر اندر اسد کی
آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔ یہ کیسی جیپ ہے، اس نے سوچا، جس کی اگلی اور پچھلی سیٹ کے بیچ
پردہ پڑا ہے۔ ایسی جیپ میں نے پہلے نہیں دیکھی۔ وہ پچھلی سیٹ پہ دو آدمیوں کے
درمیان پھنس کر بیٹھا سامنے لٹکتے ہوئے سیاہ پردے کو دیکھے جا رہا تھا جیسے وہاں کسی کھڑکی کے کھلنے کا منتظر ہو۔
یہ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں، اس نے سوچا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ جان کر اسے حیرت بھی ہوئی کہ اس کے اس سوال میں
نہ خوف تھا نہ ہراس، بس معمولی جستجو تھی جیسے وہ کوئی عام سا سوال کسی سے پوچھ رہا ہو۔ اس کے بدن میں اس
وقت ایک ساتھ کئی باتوں کے ہونے اور نہ ہونے کا ٹمٹماتا ہوا علم موجود تھا۔ اس نے خیال کیا کہ وہ اپنے جسم سے
نکل چکا ہے اور اب ہر اس کیفیت کی جانچ کر سکتا ہے جو اس پر گزر رہی ہے۔ ایک گڈمڈ کیفیت آرام کی تھی۔
اس نے محسوس کیا کہ جیسے بال کی سی باریک بے شمار تاروں نے اس کے محور کو چاروں سمت سے اپنی اپنی طرف کھینچ
رکھا ہے اور ان کی تان پر اس کا بدن مکمل توازن کی حالت میں ہلکا پھلکا اور آسان پڑا ہے۔ مگر ساتھ ہی اسے اس
بات کا خدشہ تھا کہ اگر اس نے ذرہ بھر مزاحمت بھی کی تو ان آسانی کا یہ طلسم ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اس کیفیت کی
ایک شکل مدت ہوئی ایک بار پہلے لڑکپن کے زمانے میں اسد نے دیکھی تھی۔ اس وقت وہ باقاعدگی سے مسجد میں نماز
پڑھنے جایا کرتا تھا اور یہ کیفیت وضو کرنے کے بعد اس پہ طاری ہوتی تھی اور اس وقت تک رہتی تھی جب تک وضو
قائم رہتا تھا۔ بہترین دروازہ مسجد کا تھا، اس نے اپنے آپ سے کہا۔ دونوں بازوؤں پہ بیٹھے ہوئے آدمیوں
نے سختی سے سر موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بے جنبش سامنے دیکھتا ہوا بیٹھا رہا۔ کسی وقت میں جا کر پھر یہ کیفیت اس
کے ہاتھ سے نکل گئی تھی، اس نے سوچا۔ اب اتنی عمر کے بعد ایک بار پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کی جلد کے نیچے
نیچے ایک انوکھی آشنائی کی لہر چل رہی ہے جس نے اس کے جسم کو بے وزن مگر دل کو توانا کر دیا ہے۔ اس کے دل
میں ایک لمبی اور اونچی اڑان تھی، جیسے کوئی بلند پرواز پرندہ جس کے شہپروں میں اتنی قوت ہو کہ فضا میں تیرتے
پھرتا ہوا یکلخت کسی مقام پہ ٹھہر کر ہوا میں معلق ہو جائے، گویا آسمان کے بیچ کوئی دروازہ نکل آیا ہو اور وہ تا دیر

وہاں پہ رُکا اُس کے اندر دیکھتا رہے ۔ سب سے بہتر دروازہ مسجد کا تھا، اُس نے سوچا۔ گلی کے موڑ کی گولائی میں جڑا ہُوا دروازہ ایسے دُہرے رُخ کا تھا کہ دونوں گلیوں میں جس مقام سے دیکھیں پُورے کا پُورا سامنے نظر آتا تھا۔ دروازے کے اردگرد سفید پتھر کی بیلوں پہ رنگین پچی کاری کا کام تھا۔ رنگ کیسے تھے ؟ ہرا اور نیلا اور قرمزی رنگ تھے جن کی شوخ بیلیں ہاروں کی مانند دروازے کے گرد لٹکی تھیں۔ مگر بات یہ نہ تھی کہ پتھر کے اندر شوخ بیلیں تھیں اس وجہ سے دروازہ بہترین تھا۔ بات یہ تھی کہ دروازہ کبھی بند نہ ہوتا تھا۔ رات کے وقت جب سارے گھروں اور دکانوں کے دروازے بند ہو جاتے تو اُس وقت بھی یہ دروازہ چوپٹ رہتا تھا۔ اندر بلب کی تیز روشنی مسجد کی سفید دیواروں پہ پڑتی تھی۔ اور رات چاہے کتنی ہو جائے کوئی نہ کوئی اندر چل پھر رہا ہوتا تھا۔ صبح دوپہر شام ہر وقت کوئی نہ کوئی ننگے پاؤں دھوتی اڑسے کنوئیں سے پانی کے بوکے نکال نکال کر ٹنکی میں ڈال رہا ہوتا تھا اور ہر کوئی اندر جا کر غسل خانے میں نہا سکتا تھا۔ نماز پڑھنے کی پابندی نہ تھی ۔

زیادہ تر لوگ خاص طور پہ گرمیوں میں صرف نہانے کے لیے وہاں جاتے تھے اور نہا کر بھیگے بدن چپلی پہنے سیڑھیاں اُتر کر گھر چلے جاتے تھے ۔ سوائے جمعے کے دن کے جب محلے کے چھوٹے بڑے اپنے اپنے گھروں سے صاف کپڑے پہن کر مسجد میں جاتے تھے اور کئی ایک وہاں پر دوبارہ وضو کرتے تھے ۔ پھر سردی ہو تو صحن کے بیچ دھوپ میں اور گرمیوں کے دنوں میں برآمدے کے تلے سائے میں گھس کر بیٹھنے کی کوشش کرتے اور منہ اٹھا کر خطبہ سنتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آشنائی کی لہر اب گہرے پانیوں کی جانب سفر کر رہی تھی اور اپنی رَو میں چھوٹی بڑی مدفون اشیاء کو پلٹتی جاتی تھی، گویا کسی نادر اور قیمتی شے کی تلاش میں ہو۔ اسد اپنے آپ کو اس لہر کی زد پہ چھوڑے ہر چھوٹی چھوٹی شے کو اُٹھاتا، اُسے اُلٹتا پلٹتا اور دیکھتا بھالتا ہوا چلا جا رہا تھا، جیسے کوئی خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ یہ لہر اب زندگی کی جڑوں کی جانب رواں تھی۔ اسد نے خیال کیا کہ جیسے ایک مہیب اور منہ زور مچھلی ہے جو غوطہ لگائے اپنے پروں کے زور پہ اندر ہی اندر اُتری چلی جاتی ہے اور وہ اس مچھلی کی پُشت پہ چڑھ کر بیٹھا اس نئے راستے کے نشان اُٹھاتا چلا جا رہا ہے۔ جمعے والے دن، اُس نے خوشی سے سوچا، دروازے کے اندر چھوٹے بڑے بے شمار جوتوں کا جمگھٹ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی یہ پھیل کر دروازے سے باہر سیڑھیوں تک چلا آتا تھا۔ وہ جن کی ہلکی ہلکی سستی چپلیاں ہوتی تھیں ان کو سیڑھیوں کے آس پاس لاپرواہی سے اُتار کر اندر چلے جاتے تھے مگر جن کے پیروں میں مہنگے بوٹ ہوتے تھے وہ انہیں اُتار کر ان کے تلے ایک دُوسرے سے ملا کر ہاتھ میں پکڑ لیتے تھے اور مسجد کے اندر لے جا کر ایک طرف دیوار کے پاس رکھ دیتے تھے تاکہ محفوظ رہیں۔ جمعے کو مسجد کی دیواروں کے ساتھ ساتھ ایسے بوٹوں کی قطار لگی

ہوتی تھی جو پہلو کے بل پڑے ہوتے تھے اور میرے دل میں ہر وقت خیال آتا تھا کہ نہ دھویا ہے نہ کلمہ پڑھ کر پاک کیا ہے بس تلے سے تلا جوڑ دینے سے یہ پاک کیسے ہو گئے۔ مولوی سردار شاہ کی ڈاڑھی کے بال سفید تھے اور سر پہ بڑی سی سفید بل دار پگڑی ہوتی تھی جس کو وہ کبھی کبھی اُتار کر گود میں رکھتے تھے اور چھوٹے چھوٹے کھچڑی بالوں میں انگلیاں ڈال کر سر کھجاتے تھے۔ مگر پگڑی ڈھیلی ڈھالی ہونے کے باوجود خراب نہ ہوتی تھی بلکہ اُسی طرح دوبارہ سر پہ جم جاتی تھی۔ اللہ میاں کی شکل اُس وقت مولوی جی کی شکل کی سی تھی۔ بڑی سی ڈھیلے بلوں والی سفید پگڑی اور سفید ڈاڑھی اور پستہ قد، گندھا ہوا بھاری جثہ اور نیلا کرتہ نیلا تہمد اور اللہ میاں کا ایک ڈنڈا تھا۔ میں اور ماڑو اور سادو اور کریا اور بھی تندور والی کی لڑکی اور تنجو اُن دِنوں ظہر کی نماز کے بعد مولوی جی سے قرآن شریف پڑھنے جایا کرتے تھے اور کئی اور بچے دُوسری گلیوں سے بھی آتے تھے۔ پہلے کوئی درویش کچھ درس دیتا تھا جب تک کہ سارے بچے ایک ایک کر کے آ نہ جاتے تھے۔ پھر مولوی جی حجرے کے دروازے پہ آ کر اندر آنے کا اشارہ کرتے تو ہم سب اُٹھ کر حجرے کے اندر چٹائی پہ جا بیٹھتے تھے۔ چٹائی پہ ایک چوکور گدا مولوی جی کے بیٹھنے کے لیے تھا اور پیچھے ایک گاؤ تکیہ تھا۔ تکیے کے اوپر دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جہاں سے بس اتنی روشنی پڑتی تھی کہ شکل سے حروف نظر آتے تھے اور دروازہ اندر سے بند کر لینے پر حجرہ اور بھی تاریک ہو جاتا تھا۔ پھر پچھلے سبق میں یا لگے میں جو کوئی اٹکنے لگتا تھا اُس کو مولوی جی کی پیچی مگر رعب دار ڈانٹ کی آواز پڑتی تھی ۔ "اللہ میاں کا ڈنڈا اب" اور زبان بندی کی اس آواز پر اٹکنے والا اپنی جگہ چھوڑ کر مولوی صاحب کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ وہ اُس وقت تک وہاں چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا جب تک کہ کسی دُوسرے اٹکنے والے کو آواز نہ پڑ جاتی تھی جب کہ اس دوران میں سب ڈھیکے مارے ایک ساتھ اونچی آواز میں کوئی یہاں سے کوئی وہاں سے اپنا اپنا سبق دہرائے جاتے تھے گو اللہ میاں کے ڈنڈے کی شکل کسی نے نہ دیکھی تھی۔ تاہم سب نے کسی نہ کسی وقت میں ڈر سے ہاتھوں سے اسے پکڑ کر رکھا تھا جیسے کہ کوئی آگ کا کوئلہ ہو جس پہ ہاتھ رکھ دینا ہی بڑی سزا ہو۔ حالانکہ یہ کوئی ایسی سزا نہ تھی کیونکہ اس سے کہیں درد نہ اُٹھتا تھا اور اس سے بڑی سزا مولوی جی نے کبھی نہ دی تھی۔ سوائے اُس وقت کے کہ جب بیٹھے بیٹھے کبھی کبھار وہ ہاتھ کو سختی سے جھٹک کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے اور تیزی سے حجرے سے نکل کر غسل کے لیے چلے جاتے تھے اور پھر واپس آ کر درس دینے لگتے تھے۔ یا سوائے اِس حکم کے کہ اس کا نام زبان تک آیا تو اِس کی مار ایسی آناً فاناً پڑے گی کہ ماں باپ اندھے ہو جائیں گے اور گھر مسمار ہو جائے گا اور تم گلیوں میں بھیک مانگتے پھرو گے۔ ہمارے دل میں اس کا ڈر بیٹھ گیا تھا۔ مگر دُوسرے ڈروں کی مانند نہیں تھا جن سے دل میں لمبے لمبے خوف پیدا ہو جاتے ہیں بلکہ چھوٹا سا ڈر تھا جیسے کوئی راز ہو اور دل میں تسلی تھی کہ جب تک اس کا ذکر زبان تک نہ آیا کچھ نہ ہوگا۔ وہ سبق

جو مولوی جی نے پڑھایا ایک ایک لفظ آج تک بھی دل پر کندہ ہے۔ وہ گرمیوں کے دن تھے اور دوپہر کے وقت گلی میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ مسجد کے دروازے پر چار پانچ سپاہی لاٹھیاں اٹھائے کھڑے تھے اور دروازے میں مولوی سردار شاہ پہاڑ سا سینہ نکالے دونوں بازو پھیلائے ان کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ ہجوم سے گھبرا کر سپاہیوں نے اندر گھسنے کو ایک ہلا مارا تو مولوی جی سو سال پرانے درخت کی مانند دروازے میں جمے کھڑے رہے جیسے کہ ریل گاڑی کا انجن بھی انہیں اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔ "مرتد کو ختم کرنے والو" وہ گرجنے لگے "دین کا سپاہی ہے اور اللہ کے گھر کا پناہ گیر ہے۔" ان کے عقب میں صرف ایک دو درویش نظر آ رہے تھے مگر پتا چلتا تھا کہ مسجد کے اندر کوئی اور بھی ہے جو ان کی حفاظت میں ہے۔ دور دور کی گلیوں کے آدمی آ کر وہاں جمع ہو رہے تھے اور سب مولوی جی کے طرف دار تھے۔ "شاہ جی دروازہ بند کر لو" کسی نے آواز دے کر کہا۔ "یہ اللہ کی آنکھ ہے دروازہ نہیں" مولوی جی گرجے۔ "اللہ کی آنکھ بند نہیں ہوتی۔ دست انداز اس خادم کی لاش سے گزر کر جائے گا۔" اپنے کوٹھے پہ کھڑے یہ نظارہ دیکھتے ہوئے جب اس گرج کی آواز میرے کان میں پڑی تو "آناً فاناً" مجھے پتا چل گیا کہ دروازہ کیوں اتنا روشن اور پرکشش تھا۔ یہ اللہ کی آنکھ تھی۔ پھر مجمع بیچ سے پھٹنے لگا اور پولیس کی ایک پوری گارد رائفلیں اٹھائے مسجد کے دروازے پر آ کر گلی کے دونوں جانب دور دور تک سیدھی قطاروں میں کھڑی ہو گئی اور ان کا افسر گلے میں کالا پستول اور گولیاں لٹکائے ان کے بیچوں بیچ چلنے لگا۔ اس وقت بھی جب سیکڑوں کا مجمع چپ سادھ گیا اور پستول والے افسر کی کڑک دار آواز گلی میں گونجنے لگی تو دروازے میں مولوی جی کی پھیلی ہوئی بانہوں اور چٹان کے سے سینے میں ذرہ برابر حرکت نہ ہوئی۔ اور اس وقت بھی میرے لرزتے ہوئے دل میں ایک یقین تھا کہ ابھی ان کے منہ سے ایک رعب دار ڈانٹ کی آواز نکلے گی۔ "اللہ میاں کا ڈنڈا ا ا . . ." اور سب پولیس والے ان کے پاؤں میں جا کر چپ چاپ بیٹھ جائیں گے اور اپنے اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیں گے، پھر کسی نے بول چال کی تو اس پہ ایسی آفت آئے گی کہ اس کا گھر مسمار ہو جائے گا اور وہ اندھا ہو کر گلیوں میں بھیک مانگتا پھرے گا۔ میرے دل میں اس خطرے کے آخری وقت میں بھی ایک یہ بھروسا تھا۔ مگر دھکم پیل کے اندر پھر میں نے پستول والے افسر کا ڈنڈا ہوا میں اٹھتا دیکھا اور مولوی جی اوندھے منہ مسجد کے دروازے میں گر پڑے اور لڑھک کر تھڑے کی سیڑھیوں پہ آ کر الٹے لیٹ گئے اور لوگوں کے مجمعے میں بھی دھکم پیل ہونے لگی۔ پولیس کے سپاہی مسجد میں داخل ہو گئے۔ پہلے کچھ جوتے اتار کر اور باقی جوتوں سمیت بھاگتے ہوئے مسجد کے صحن پر چلے گئے جو ہمارے کوٹھے سے نظر آتا تھا۔ اس وقت میں اپنی جگہ سے ہٹ کر آ گیا۔ مولوی جی اس کے بعد نظر نہ آئے۔ ان کی جگہ ایک درویش روز کی اذان دینے اور نماز پڑھانے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک کالی داڑھی والے پتلے سے مولوی صاحب، جن کا نام علی محمد بریلوی تھا، آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی

پکی گلی کے مولوی عنایت شاہ سے مناظرے شروع کر دیے۔ مناظرے شہر سے باہر ایک کھلے میدان میں ہوتے تھے جو پڑاؤ کہلاتا تھا۔ ہر جمعے کی نماز کے بعد دونوں اپنی اپنی کتابوں اور اپنے اپنے درویشوں کو لے کر وہاں پہنچ جایا کرتے تھے۔ پہلے کچھ دیر تک وہ ایک دوسرے سے بحث مباحثہ کرتے اور کتابیں کھول کھول کر حوالے دیتے۔ پھر دونوں غصے میں آ جاتے اور لعن طعن کرنے لگتے۔ دونوں طرف کے درویش ڈنڈے اور سونٹیاں نکال لیتے اور کبھی بیچ بچاؤ ہو جاتا مگر اکثر نوبت لڑائی پر جا پہنچتی تھی۔ پھر مناظرہ اگلے جمعے تک اٹھا دیا جاتا۔ مولوی علی محمد بریلوی، سردی ہو یا گرمی، ہمیں مسجد کے صحن میں بٹھا کر اپنی تیز تیز آواز میں قرآن شریف کا درس دیتے تھے اور جو کوئی اونگھنے لگتا تھا اس کی پیٹھ پر ایک پتلی سی قمچی تڑاخ سے لگاتے تھے۔ اس سے سبق یاد ہو جاتا تھا مگر لفظ دل پر کندہ نہ ہوتے تھے۔ وہ محنت وہ محبت اندر سے نکل گئی تھی. . . . . اس شتاقی ہوئی نیم روشن دنیا میں دفعتاً اسد کو احساس ہوا کہ وہ قیمتی اور نادر شے محبت کے یہ نشان تھے۔ کچھ دیر پہلے ایک مشعلوں کی لکیر کو جنگل کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ کر اس نے سوچا تھا، اب میں کس بات پہ اپنا یقین رکھوں گا؟ اب سیپیوں کی طرح بکھری ہوئی عمر کی ان گھڑیوں کو وہ ایک ایک کر کے چنتا اور ان کے منہ کھولتا ہوا آزادی سے چلا جا رہا تھا جیسے یہ سمت سب سے اصل اور آخری سمت ہو۔ یہ نشان جاندار تھے۔ سوئی کے ناکے کو ایک بار میں نے، اس نے سوچا، آنکھ کے آگے رکھ کر دیکھا تھا جس کے اندر سے اونٹوں کی قطاریں گزر رہی تھیں اور ایک قافلہ تھا عورتوں مردوں اور بچوں کا جن کے چہرے اڑتی ہوئی گرد اور خواہش میں ڈھلے تھے جیسے رہزنوں کے ہوتے ہیں یا چھوٹے بڑے مختاروں کے اور ان کے سروں پہ بال آندھی کی طرح بکھرے تھے۔ یاسمین کی چھاتی پر بھی بال ہیں مگر ہلکے ہلکے سنہرے رنگ کے ریشم کے جالے کی مانند جو صرف روشنی کی آڑی شعاع میں چمکتے ہیں۔ یاسمین سیدھی پشت پر لیٹی تھی اور کچے پکے نیم زرد رنگ آموں کی سی چھاتیاں جن کا گندھا ہوا حجم اتنا مختصر تھا کہ دونوں ایک مٹھی میں سما جائیں مگر دور دور تھیں اور ایک دوسری سے پرے منہ کیے بغلوں کی جانب کو جھکی تھیں ایسے ہلکے سے خم پہ کہ گمان ہوتا تھا ابھی ڈھلکیں کہ ڈھلکیں مگر سختی سے بندھی تھیں اور اپنی بادامی رنگ کی بہن ذرا سی آنکھیں اٹھائے تندہی سے باہر کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی زرد موم کاغذ کی سی جلد تھی جس کی سطح پر نیلی اور قرمزی شریانوں کا جال بچھا نظر آتا تھا اتنا صاف کہ جیسے ہونٹوں سے سمیٹا جائے گا۔ ایسی باریک اور بادامی آنکھیں میں نے نہیں دیکھیں۔ میں نے دیکھی کتنی ہیں۔ وہ چار چار پانچ ایک نیچے کو ڈھلکی ہوئی تھی اور خون میں ڈوب کر پھوٹ گئی تھی۔ وہ کی آنکھیں نہیں تھیں، صرف تانبے کے پیسے جتنے گول گول چٹاخ تھے اور چاند کی روشنی میں بکھری ہوئی گاڑھی دودھیا جلد تھی جس کے اندر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ دیکھی میں نے دراصل دو

ہیں، مگر شہبازوں کے جال سے رِستی ہوئی روشنی ساری بہتی ہوئی آ کر اُن آنکھوں کی کنیروں پر منجمد ہو گئی تھی اور میرے اندر یہ احساس ایک علم کے مطابق تھا کہ سارے جہان کی آنکھیں میں نے دیکھی ہیں۔ چہروں کی بات اور ہے۔ مجھے اُس بوڑھے شخص کے چہرے کی آنکھیں یاد ہیں جو خاکساروں کے کپڑے پہنے عینکیں بیچا کرتا تھا۔ وہ خاکساروں کے کپڑے پہنے روز شہر کے بازاروں میں ایک نعرہ لگاتا ہوا اپنے ٹوٹے ہوئے کیس میں لٹکی ہوئی عینکیں بیچا کرتا تھا۔ اس کو عینکیں بیچتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا تھا مگر اس کے نعرے سے ہر کوئی واقف تھا جس کا عینکوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ ہمارے سکول کے سامنے ایک کمرے میں رہتا تھا اور ایک روز صبح سویرے سکول لگنے سے پہلے ہم وہاں کھیل رہے تھے کہ ایک پولیس کی گاڑی آئی اور اُسے پکڑ کر لے گئی۔ جب گاڑی چلی تو ایک مختصر سی کھڑکی کے شیشے سے منہ لگا کر اُس آدمی نے پوری آواز میں اور دھیمی لَے سے اپنا نعرہ لگایا: "چہر دیکھے چودھری تے لنڈی رن پردھان۔" بند گاڑی سے اُس کی گھٹی ہوئی آواز باہر نکلی تو وہاں کھڑے ہوئے لوگ ہنس پڑے۔ اُس وقت کی اُس کی آنکھیں مجھے یاد ہیں۔ اُس کے چہرے سے سارا جوش اور جذبہ و فتنہ ہوا ہو گیا اور ہنستے ہوئے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھوں میں ایک تحیر پھیل گیا، جیسے کسی اٹل قدرتی حادثے کو پہلی بار اُس نے دیکھ لیا ہو اور روح اُس کے جسم سے نکلتی جا رہی ہو، جس خون کو نہ عمر نے اور نہ تنہائی کی وحشت نے سست کیا تھا چند کھلنڈرے لوگوں کی بے اختیار ہنسی نے سرد کر دیا۔ اُس عمر میں میں نے اُن آنکھوں میں ایک آدمی کو زندگی کی حیرانی کا سامنا کرتے ہوئے دیکھا تھا، اور میرے دل میں سب آدمیوں کی زندگی کے بارے میں وسوسہ پیدا ہو گیا تھا۔ چہرے کی اور بدن کی آنکھوں میں اتنا فرق ہے۔ میں یاسمین کو کیسے یاد کروں؟ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ یہاں سے کچھ نظر نہیں آتا۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہاڑوں سے اتر رہے ہیں۔ اگلی سیٹ والے آدمیوں نے اب آہستہ آہستہ باتیں شروع کر دی ہیں میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمیوں نے بھی اگلے آدمیوں سے باتیں کی ہیں۔ میرے سامنے سے ہاتھ بڑھا کر ایک دوسرے کو سگریٹ دیے ہیں اور سلگائے ہیں۔ تیلی کی روشنی میں میں نے ان کے چہرے دیکھے ہیں۔ معمولی چہرے ہیں۔ ان کے چہروں سے اور باتوں سے پتا نہیں چلتا کہ پولیس کے ہیں یا فوج کے۔ اتنا پتا چل رہا ہے کہ ہم چڑھائی سے اترائی کو جا رہے ہیں۔ جیپ کی آواز ایسے آ رہی ہے جیسے ٹرک چل رہا ہو۔ یہ کون لوگ ہیں؟ ...... اسد کے دل میں یہ شک تھا کہ ہو نہ ہو اس معاملے کا تعلق ذوالفقار سے ہے۔ اس خیال سے اسے کچھ تسلی ہوئی، جیسے اس کو یقین ہو کہ ذوالفقار اُسے زک پہنچنے دے گا۔ جیپ کا رُخ تو میدانوں کی طرف ہے، اس نے سوچا۔ کیا یہ اب مجھے گھر چھوڑ کر آئیں گے؟ مگر اس طرح قیدی بنا کر لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ عجیب سفر ہے۔ شاید ان کا خیال ہو کہ قید میں ڈال کر یہ مجھ کو ایک بے خبر اور کند آدمی بنا ڈالیں گے۔ ان کو خبر نہیں کہ میرے ذہن میں ایک بجلی

چمکتی ہے جس کے اندر مجھے چیزیں نظر آتی ہیں۔ یاسمین کی شکل اور دوسری شکلیں جو میل نہیں ہوتیں۔ اس وقت میرا خیال اٹک رہا ہے۔ جب روشنی ہوگی تو اس میں ایک روانی آ جائے گی جیسے دریا میں ہوتی ہے، پھر اس کے زور کے آگے کچھ نہیں ٹھہرے گا۔ اُس بجلی تک ان کی رسائی کیسے ہوگی؟ اُس روشنی تک یہ کیسے پہنچیں گے جس میں جگمگاتی ہوئی لمبی گول رانیں قینچی کے پھلوں کی مانند کھلتی اور بند ہوتی ہیں۔ قینچی کے یہ پھل اندھیرے کمرے میں بھی جھلملاتے ہوئے میں نے دیکھے تھے جب گرمیوں کی سہ پہر میں نیند نہیں آ رہی تھی۔ ابا ہر آدھ گھنٹے کے بعد جھانک کر دیکھا کرتے تھے اور ظہر اور عصر کی نماز کے بعد دعا پڑھ کر، چاہے میں سویا ہوا ہوں یا جاگتا، مجھ کو پھونک مارنے آیا کرتے تھے۔ اُس ساری سہ پہر کو ابا نہیں آئے تھے اور میں نے اُن کی بیٹھک کا دروازہ جا کھولا تھا۔ کمرے میں پسینے کی اور کچے کاٹے ہوئے آلوؤں کی سی ہلکی ہلکی بو بھری تھی، اور دیوان کے اوپر دو پھولی ہوئی گول گندمی رانیں کھلتی اور بند ہوتی تھیں اگرچہ کھڑکی کے شیشوں پر کپڑا ڈال کر روشنی کو بند کیا گیا تھا۔ ابا ایک سیکنڈ کے اندر آگے آ گئے تھے۔ اُن کے چہرے پر سراسیمگی تھی مگر آنکھوں میں پیار کی ٹھہری ہوئی سست نظر تھی، جس سے میرے دل کو تسلی ہوئی تھی کہ کوئی بات نہیں، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ اندر چہرہ اگرچہ نظر نہیں آتا تھا مگر مجھے علم تھا کہ یہ کون ہے۔ یہ چراغ تھی۔ چراغ کی بھاری بھاری چوڑی چوڑی چھاتیاں تھیں جو گلے سے کُرتے کے اندر لٹکی رہا کرتی تھیں۔ وہ دن بھر گلی میں اپنے تھڑے پر بیٹھی رہتی تھی اور گزرتے ہوئے بچوں کو اور مجھے خاص طور پر اچک کر اٹھا لیتی تھی اور بھینچ بھینچ کر پیار کرتی تھی۔ میں اس کی گود سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارا کرتا تھا اور جیسے ہی میرا پاؤں زمین پر ٹکتا میں چھلانگ مار کر بھاگ آتا تھا، کیونکہ چراغ کی چھاتیاں اگرچہ موٹے موٹے نرم گدّوں کی سی تھیں مگر مجھے علم تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے بچوں کو مارا کرتی ہے اور اپنی بیٹی سے ہر وقت لڑتی رہتی ہے۔ اُس کی بیٹی کا خاوند پٹواری تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ چراغ کے دو کمروں اور چوبارے والے گھر میں رہتا تھا اور ہر چوتھے پانچویں روز اپنی بیوی اور ساس کو پیٹا کرتا تھا۔ وہ انہیں شور مچا مچا کر گالیاں دیتا تھا مگر گلی کا کوئی آدمی چھڑانے کو اُن کے گھر کے پاس نہیں پھٹکتا تھا۔ اسی طرح گلی کے سب لوگوں کو چراغ کی اس بات کا بھی علم تھا مگر مجھے نہیں تھا۔ مجھے اُس دن ہوا جب ابا، جو پانچ وقت کے نمازی تھے، بازاری لوگوں کی طرح غضب کی حالت میں گالیاں دیتے ہوئے بندوق اٹھا کر باہر نکل گئے۔ جان اُن کے پیچھے پیچھے بھاگا اور جاتے جاتے گھر کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگا گیا۔ مگر میں نے اور پھوپھی ارما نے روتے روتے گلی والی کھڑکی کی سلاخوں میں سے دیکھا کہ ڈپو والے صوفی فضل کریم، جن کی خشخشی سفید داڑھی تھی اور لوگ کہتے تھے کہ بلیک کرتے ہیں، اسی طرح غیظ و غضب کی حالت میں دوسری طرف کھڑے تھے۔ وہ اپنی قمیض کے بٹن

کھول کھول کر اور سینہ ننگا کر کے چیخ رہے تھے، مار، گولی مار، دیکھوں تیری بہادری، اور بہت سے لوگ بیچ بچاؤ کر رہے تھے اور ابا کی بندوق سیدھی نہ ہونے دیتے تھے۔ تماشائیوں میں ایک آدمی ہماری کھڑکی کے آگے کھڑا کہہ رہا تھا، خدا کسی کو توفیق نہیں دیتا اس چڑیل کو نکاح کر کے گھر میں ڈال لے، عزت دار لوگوں کی عاقبت خراب کرتی ہے۔ اس شخص نے کسی کا نام نہ لیا تھا مگر مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا کہ اس کا مطلب چراغ سے ہے۔ میں نے منہ اٹھا کر پھوپھی اُرما کے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور ان کی بہتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر میرے دل کو حیرانی ہوئی تھی کہ پھوپھی اُرما کو بھی اس بات کا علم تھا۔ اس گلی میں، جہاں دوسری گلی کا کوئی آدمی آنکھ اونچی کر کے نہیں گزر سکتا تھا، سب لوگوں کو ابا کی اور صوفی فضل کریم کی اور چراغ کی اس بات کا علم تھا اور کوئی کچھ نہیں کہتا تھا، بلکہ بیچ بچاؤ کرانے آجاتے تھے۔ یہ سوچ کر میرے دل کو بڑی بھاری تسلی ہوئی تھی جیسے میں کسی قلعے کے اندر محفوظ بیٹھا ہوں۔ اس روز اچانک دروازہ کھلنے پر اندھیرے کمرے میں اگرچہ شکل مجھے نظر نہیں آئی تھی اور رانیں میں نے ننگی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں مگر مجھے علم تھا کہ کس کی ہیں۔ صرف بُو نئی تھی۔ پسینے کی بُو سے میں واقف تھا مگر کاٹے ہوئے کچے آموں کی طرح کی یہ باس نئی تھی۔ میرا جی تھوڑی دیر کے لیے متلانے لگا تھا۔ مجھے اچانک خیال آیا تھا کہ میں دوزخ میں جاؤں گا۔ اس عمر میں جب مجھے کسی کسی بات کی خبر ہو رہی تھی مجھے ایک اشارہ ملا تھا کہ کچھ لوگ ہیں جو دوزخ میں جائیں گے۔ مگر اس اشارے پر میرے دل کو کوئی پریشانی نہ ہوئی تھی۔ جیسے کوئی معمولی بات ہو، یا کوئی ایسی بات ہو جس کا کوئی علاج نہ ہو۔ جیپ کھڑی کیوں ہو رہی ہے؟ کوئی مقام آگیا ہے؟ کوئی مقام نہیں آیا۔ جیپ سڑک کے کنارے پر رُکی ہے اور تین آدمیوں نے اتر کر ڈھلان پر پیشاب کیا ہے۔ یہ پیشاب کا مقام ہے۔ اب تینوں آدمی جیپ کے باہر کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ چوتھا آدمی میرے پاس بیٹھا ہے۔ اس کو پیشاب نہیں آیا۔ اگر آیا ہے تو کرنے نہیں گیا، میری حفاظت پہ مامور ہے۔ اب میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا؟ میرے پاؤں میں درد اگرچہ رُک گیا ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ گیا نہیں، پیر سُن ہو گئے ہیں۔ اب ان لوگوں کو کس بات کی فکر ہے۔ میرا خیال پھر اٹک رہا ہے، جیسے نیم جان ہو گیا ہو۔
بشیر کا بدن بڑا جاندار بدن تھا۔ بشیر جھبریے کا تھا، مگر جب کالج میں گیا تو دو اور لڑکوں کے ساتھ شہر میں ایک چوبارہ کرائے پر لے کر رہتا تھا۔ میں بشیر سے ملنے وہاں جایا کرتا تھا۔ تین دیواروں کے ساتھ تین چارپائیاں بچھی تھیں جن پر سفید چادروں اور بادامی کھیسوں کے بستر تھے۔ ہر ایک چارپائی کے پاس ایک ایک میز پڑی تھی جو آتشی اور گلابی رنگ کے کڑھے ہوئے پھولوں والے میز پوشوں سے ڈھکی تھی۔ میزوں کے اوپر کاپیاں، کتابیں، سگریٹ، فاؤنٹن پین، گلاس، لفافے اور پیڈ رکھے تھے۔ کمرے کے بیچ میں ایک اور میز تھی جسے اونچی نیچی اینٹوں والے فرش پہ جما کر دو کرسیاں

آمنے سامنے رکھ کر اور چارپائی گھسیٹ کر ہم چاروں اس کے گرد بیٹھ کر تاش کھیلا کرتے تھے۔ سامنے والے مکان کے چوبارے میں ایک شام کو ہم نے دو ننگے بدن چلتے پھرتے ہوئے دیکھے تھے۔ ساری دنیا سے بے خبر وہ آدمی پشت کھڑکی کی جانب کیے ہاتھ کولہوں پہ رکھے تن کر کھڑا تھا۔ عورت اس کی ٹانگوں کے بیچ اپنے گھٹنوں پہ کھڑی اپنے سفید بازو اس کی کمر کے گرد ڈالے، مہندی لگے ہاتھوں کی انگلیاں اس کی پیٹھ کے گوشت میں گاڑے غصیلے بلّے کی طرح غرا رہی تھی۔ اس کا چہرہ آدمی کے دھڑ کی اوٹ میں نظر نہیں آتا تھا، مگر اس کے سر کا لرزتا تھرتھراتا ہوا سایہ بغل کی دیوار پہ ناچ رہا تھا جب کہ گلی کی اس جانب اپنے چوبارے کی کھڑکی میں بتی بجھائے چار نوجوان بدن، بشیر، رؤف، رشید اور میں ہاتھ رانوں میں دبائے یہ تماشا دیکھتے تھے۔ بشیر کے چوبارے کی ایک ایک چیز مجھے یاد ہے، مگر اس طرح سے کہ جیسے ہمیشہ کے لیے اس سامنے والے چوبارے کا شوخ پس منظر بن گئی ہو۔ اس ایک شام کے چند لمحوں میں اتنی جان تھی۔
بشیر جھبریے کا تھا جو ہمارے گاؤں سے چار کوس کے فاصلے پر تھا۔ ہم دونوں ابھی دسویں میں پڑھتے تھے کہ ہمارے گاؤں کی جھبریے سے کبڈی پڑی تھی۔ ان دنوں میں بشیر کی قینچی دور دور تک مشہور تھی۔ مگر اس دن میری قینچی اس ڈھب سے اس کو لگی کہ وہ جنبش نہ کر سکا۔ ان دنوں نہر کے اندر تیر تیر کر اور کھیتوں کی مشکل مٹی میں دوڑ دوڑ کر ہماری رانوں میں ایسا زور پیدا ہونے لگا تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا کوئی چھوٹا موٹا پیڑ قینچی میں آجائے تو چرمر ہو جائے گا۔ کبڈی کھیلنے کے بعد جب کنوئیں پہ مل مل کر نہاتے اور پھر دوہی کی گاڑھی لسّی کے کٹورے چڑھا کر کسی درخت کی چھاؤں میں جا بیٹھتے اور باتیں کرتے کرتے نیند کے زور میں آکر تھوڑی دیر کے لیے وہیں لیٹ کر سو جاتے تو بدن میں وہ اکڑاؤ اٹھتا کہ جیسے زمین کا سینہ چھید کر نکل جائے گا۔ مجھے کبڈی کھیلتے دیکھ کر پیر بخش نمبردار نے چچا سے کہا تھا، لڑکے کے جسم پہ ماس کی بوٹی تک نہیں، تاروں کے بٹے ہوئے رسّے ہیں رسّے۔ تمہارے جسم کو کسی کی نظر لگ گئی ہے، یاسمین نے کہا تھا، بڑی لمبی نظر لگی ہے، میرے پاؤں سُن ہو گئے ہیں۔ کالج کے دوسرے سال میں بشیر کو شہر کے رستے میں اس کے چچا کے بیٹوں نے کلہاڑیوں سے کاٹ کر کھیتوں میں پھینک دیا تھا۔ میں اسے دیکھنے گیا تھا مگر سوکڑے اس کے کپڑوں کے نشان دیکھ کر چلا آیا تھا۔ اور کوٹھوں پہ پھرتی، سرسراتے ہوئے بالوں والی لڑکیوں کے نیم رُخ اشارے اور لڑکوں کی ہلکی پھلکی آہیں، ہر وقت کی ذہن میں بسنے لائم کا قصہ محنت سے لکھے اور پھاڑے ہوئے ان گنت خط ختم گئے تھے مگر ان باتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ سرخ کیے ہوئے بدن یا محبت کرتے ہوئے سدا بہار ہیں۔ ان چیزوں کا رنگ کبھی میلا نہیں ہوتا۔ جیپ اب دوبارہ چل پڑی ہے۔ آگے پردہ پھر گر گیا ہے۔ میں تو قیدی ہوں، مگر ان دو آدمیوں کو بھی اچھی سزا ملی ہے۔ باہر نہیں دیکھ سکتے۔ چپ بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں۔ میں ان سے کوئی بات کروں؟ اب رات ختم ہونے والی ہوگی۔ کچھ دیر میں دن نکل آئے گا۔ پھر کوئی نہ کوئی منزل آئے گی۔ یاسمین نے میری شکل بھی نہیں دیکھی تھی، نہ آواز سنی تھی۔ میں وہاں پہ

کھڑا تھا، اور شام کے اندھیرے میں دُور سے چند لمحوں کے لیے اُس کی نظر مجھ پہ پڑی تھی۔ بس اتنی بات ہوئی تھی۔ مَیں یاسمین کو کیسے یاد کروں۔ ایک خوشنما اور دیرپا جذبہ کہاں سے لاؤں، جو اُس کا اہل ہو . . . . اسد کے دل میں ایک ہُوک اُٹھی۔ اِس ہُوک سے گویا اچانک ایک طلسم ٹوٹ گیا۔ اسد پر اب یہ حقیقت کھُلی کہ وہ کون سی ایسی منزل تھی جس کی سیڑھیوں کے طویل سلسلے کو طے کرتا ہُوا وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ ایک ایک سیڑھی پہ جا جا کر قدم رکھتا ہوا، زندگی کی چھپی اور چھپائی ہُوئی چیزوں کو اُٹھاتا، اُن کے اُوپر سے تبرّک کے پردے اُتارتا ہُوا وہ اِس ایک منزل کی تلاش میں چلا جا رہا تھا کہ یاسمین کو کیسے یاد کرے۔ سب سُنی سُنائی باتیں نیم جان تھیں۔ اصل جان تو اُس اندر وال ٹھوس گٹھلی میں بند تھی جو بجلی کے جھپاکے میں تیز دھار پھل کی طرح چمکتی ہے۔ صرف محبت کرتے ہُوئے بدن، اسد نے اُن تیز کرتے ہُوئے خوشی سے سوچا، سدا بہار ہیں۔ اُس وقت جب مَیں چارپائی پہ لیٹا لالٹین کی روشنی میں کمرے کی چھت پہ ایک ایک سایے کو دیکھ رہا تھا تو میرے اُوپر جھکی وہ کہہ رہی تھی، ہائے اسدی، تمہاری جلد پہ نشان پڑ گئے ہیں، ظالموں نے کیا کیا ہے۔ اُس کے ہونٹ میری گردن اور سینے اور پیٹ کی ہڈیوں کے نشیب تلاش کر رہے تھے۔ اُس وقت مَیں اچانک اپنے آپ سے نکل کر چارپائی سے پرے جا کھڑا ہوا تھا اور اُوپر سے جیسے اُن دو گوشت پوست کی شبیہوں کو ایک دُوسرے سے لپٹتے اور جُدا ہوتے ہُوئے دیکھنے لگا تھا جیسے تیز ہوا کے اندر دو بے دم لچکتی بیلیں ہوں اور ہونٹ میری جلد کے نشانوں کے اُوپر اُوپر سرکتے جاتے تھے، پسلیوں کے پنجر کے آس پاس اور رات کی سلوٹ کے اندر زبان کی نم نوک لمحہ بھر کو کوندتی ہُوئی، کولھے کی اُبھری ہُوئی ہڈی کو ہاتھ والے کی طرح ڈھانپتے ہُوئے اور دو مہین اور گول بادامی آنکھیں نیزے کی اَنی کی مانند میری رانوں کی جلد کے اُوپر اُوپر تیز سیدھی لکیریں کھینچے جاتی تھیں۔ ان لکیروں کی سنسناہٹ سے روئیں کانٹوں کی طرح کھڑے تھے جن کی جڑوں میں سرپٹ دوڑتی ہُوئی جان کی جلد بہترین ریشم کی سی ہلکی اور نازک اور مضبوط بُنتر کی تھی، اور سرکشی سے سر اٹھائے اس کے ہونٹوں کے ریشم سے آنکھ ملائے کھڑی تھی جیسے کہتی ہو کہ دُنیا کی کسی اور شے پہ، پھُول پہ یا ترشے ہوئے پھل پہ اپنا ہاتھ رکھ کر یا ہونٹ لگا کر دیکھ لو ایسا بیش بہا نہ ہوگا، ان لمبی لمبی سرکتی ہُوئی اُنگلیوں کے پوروں سے اپنی جان میری آنکھ میں ٹپکاؤ مَیں تمہارا بدل ہُوں، مَیں تم ہوں تم جیسا ہوں، کہ یک بارگی میرے بدن سے ایک چیخ برآمد ہُوئی اور اچھال مار کے اُنگلیوں کے پوروں کو متحیر کرتی ہُوئی اُس کی آنکھوں کو ڈھکتی چلی گئی، اور اِس تیر کی سی چیخ کے مقابل وہ ایک لمحہ برابر سرکی نہ اپنی جگہ سے ہلی بلکہ آنکھوں پہ اور رُخسار پہ اور کندھے کی گولائی پہ اِس پگھلے ہُوئے موتیوں کی لکیر کو اٹھائے بے حرکت و حرمت بیٹھی رہی اور پیار

کا ایک سُست نظر خمار اُس کے جوڑوں سے پھُوٹ پھُوٹ کر بہنے لگا تھا۔ صبح سویرے دو آنکھیں میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹھہر گئی تھیں اور مَیں نے نظر کی شعاع کو شیشے میں بدلتے ہُوئے دیکھا تھا جب منہ اندھیرے گرم سوتے سوتے ابا نے آ کر مجھے جگایا تھا۔ آنکھیں کھول کر مَیں نے دیکھا تھا کہ پتا نہیں میں کہاں پہ ہوں اور ابا ایک چمکتا ہُوا چھُرا ہاتھ میں لیے میرے اُوپر کھڑے ہیں۔ پھر مَیں نے دیکھا کہ مَیں بستر میں لیٹا ہوں اور ابا نے ہاتھ بڑھا کر میرے سر پہ پھیرا ہے اور بال درست کیے ہیں اور جھک کر گال کو چوما ہے اور چھُرے والا ہاتھ میرے آگے بڑھا دیا ہے۔ اِس کو ہاتھ لگا دو، ابا نے کہا اور مَیں اسے چھُونے کی بجائے کھیس کے کچھ اور اندر سرک گیا تو ابا میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر پیار سے بولے، بس دستے کو ہاتھ لگا دو بیٹے، اور سو جاؤ۔ اُنہوں نے چھُرے کا پھل موڑ کر اپنی طرف کر لیا اور لکڑی کا دستہ میری جانب بڑھا کر دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑا اور دستے سے چھُو کر چھوڑ دیا۔ پھر وہ باہر نکل گئے۔ اب سو جاؤ، وہ جاتے جاتے کہہ گئے، مگر اُن کے باہر جاتے ہی مَیں بستر سے نکل کر اُن کے پیچھے پیچھے چلا آیا اور آسمان پہ بادل تھے یا صبح سویرے کا وقت، ٹھیک یاد نہیں، مگر دن کا اُجالا ابھی کم تھا۔ ہمارے پکے صحن میں نال کے اُوپر مرتی کو پچھاڑے ایک آدمی اُس کے اُوپر بیٹھا تھا اور ابا وہ چھُرا اُسے دے رہے تھے۔ یہ بڑی عید کا دن تھا۔ مرتی ہمارا بکرا تھا جس کے گلے میں بڑے بڑے سفید موتیوں کا پٹا تھا۔ مَیں روز شام کو رسّی پکڑ کر اُسے صحن میں پھراتا تھا اور ابا کہتے تھے یہ تمہارا قربانی کا بکرا ہے۔ مجھے علم تھا کہ یہ میرا قربانی کا بکرا ہے مگر مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ ہر روز شام کو مَیں رسّی پکڑ کر اُسے صحن میں گھمایا کرتا تھا اور اب مَیں جا کر اُس کے منہ کو ہاتھ بھی لگا لیتا تھا اور وہ مجھے کچھ نہیں کہتا تھا۔ جب اُس روز صبح سویرے قصائی نے مرتی کو پچھاڑ کر اُسے ذبح کیا تو مَیں ڈر کر پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے نکل کر ابا کے پاس جا کھڑا ہوا اور کانپتے ہُوئے نرخرے کو اور نالی میں بہتے ہوئے خون کو دیکھنے لگا۔ وہ شاید پہلا موقع تھا جب مَیں اپنے آپ میں سے نکل کر الگ کھڑا ہو گیا تھا اور غور سے اُن آنکھوں کو دیکھ رہا تھا جو میرے دیکھتے دیکھتے شیشے بن گئی تھیں۔ انکی چمک برابر قائم رہی تھی اور اُن کی شکل میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی، مگر صاف دکھائی دیتا تھا کہ نظر کہیں ٹھہر گئی ہے۔ یہ میری پہلی قربانی تھی۔ وہ آنکھیں پہلے بھی ہوا میں دیکھ رہی تھیں اور اب بھی دیکھے جا رہی تھیں مگر دیکھتے دیکھتے خالی ہو گئی تھیں۔ اِس سے مجھے پتا چلا کہ ہوا کیا ہوتی ہے۔ یاسمین نے کہا تھا، اسدی، تم نے بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں، مگر یہ تو کوئی بات نہیں۔ مَیں اپنی سانس کے عارضے کی خاطر اِدھر اُدھر پھِرتا رہا ہُوں مگر ایسے ایسے عارضے کس کو نہیں ہوتے۔ صرف اتنی بات ہے کہ اِس بجلی کی چمک کو مَیں قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اُس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک میرے دل میں زور ہے۔ بس اتنی بات ہے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جن کو اشارہ ملتا ہے کہ وہ دوزخ میں جائیں گے اور وہ اسے تسلیم کر لیتے ہیں، مگر ثابت قدم رہتے ہیں۔

اس لیے کہ دوزخ اور جنت کی کون سی بات ہے ۔ ایک کیفیت ہے جو عمر کے کسی مقام پر ہر ایک کے ہاتھ سے
نکل جاتی ہے اور پھر اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے باقی رستہ طے ہوتا ہے۔ محبت کے یہ نام اور نشان میں نے پیدا
کیے ہیں جو میرے رستے میں دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ماند نہیں پڑتے ۔ میں ان کو کیسے چھوڑوں۔ بس اتنی بات
ہے۔ باقی یہ لوگ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں، اس کا مجھے علم نہیں۔ اگر قید میں ڈالنا تھا تو اس علاقے سے باہر کیوں
لے جا رہے ہیں، اگر دیس نکالا دینا ہے تو اس طرح قیدی بنا کر لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ عجیب سفر ہے۔